ہمہ یاراں دوزخ

صدیق سالک





مصنّف

ہمہ یاراں دوزخ

ایک اسیرِ جنگ کی سرگزشت

میجر صدیق سالک

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ لاہور

طابع ـــــــ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

ناشر ـــــــ مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ۔ سمن آباد، لاہور

مطبع ـــــــ اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور

باراوّل ـــــــ اگست ۱۹۷۴ء

باردوم ـــــــ جنوری ۱۹۷۵ء

تعداد ـــــــ دوہزار

قیمت :

ڈی لکس ایڈیشن ـــــ آفسٹ کاغذ ۲۰/- رُوپے

سادہ ایڈیشن ـــــ سفید کاغذ ۱۵/- رُوپے

انتساب

مَیں نے ہوش سنبھالا تو ایک ہی فرد کو گھر میں پایا، وہ میرے اَور مَیں اُس کے دِل و نگاہ کا مرکز بن گیا۔ مجھ پر جوانی اَور اُس پر بڑھاپا آتا گیا۔ لیکن ہم گردشِ لیل و نہار سے بے نیاز ایک دُوسرے کے سہارے زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ ہماری تیس سالہ رفاقت میں مفارقت کی دیوار پہلی بار اُس وقت حائل ہُوئی جب مَیں اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان روانہ ہُوا۔ جُدائی کے چار برسوں میں خواہ وہ مشرقی پاکستان کے پُرآشوب ماحول میں گزرے ہوں یا بھارت کے تنگ و تاریک بندی خانوں میں، اُس پیکرِ شفقت کا سایہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ چنانچہ جب کبھی مَیں یاس و حرماں کی ویرانیوں میں بھٹکنے لگا تو ایک مانوس آواز نے مجھے راہ سُجھائی اَور جب مَیں قید و بند کی تاریکیوں کو ہمہ گیر سمجھنے لگا تو ایک ٹھنڈی کرن نے مجھے روشنی مہیّا کی۔

قیدِ ہند سے رہا ہو کر واہگہ (لاہور) پہنچا تو استقبال کرنے والوں میں بہت لوگ تھے۔ لیکن وہاں وہ آواز تھی نہ وہ کرن جس کی مجھے تلاش تھی ـــــ مَیں بھاگا بھاگا اُس گاؤں پہنچا جہاں برسوں پہلے ہماری رفاقت کا آغاز ہُوا تھا، لیکن وہاں بھی سنسان خاموشی اَور مہیب اُداسی کے سوا کچھ نہ تھا ـــــ البتّہ قریبی قبرستان میں ایک تازہ قبر کی مٹّی سے سوندھی سوندھی خُوشبو پھُوٹ رہی تھی ـــــ یہ ماما تھی جو آج بھی میرا استقبال کرنے کو بیقرار تھی۔

مَیں اپنی یہ حقیر کوشش
ماما کی اُسی خُوشبو سے
منسُوب کرتا ہُوں۔

ہر ایک بات زباں پر نہ آسکی باقیؔ
کہیں کہیں سے سُنائے ہیں ہم نے افسانے

(باقیؔ صدّیقی)

ترتیب

حرفِ اوّل ۷
دیباچہ ۱۱
۱ شمشیر سے زنجیر تک ۱۷
۲ "ہتھیار بر زمین شو" ۲۵
۳ وی-آئی-پی ۳۹
۴ گوشے میں قفس کے ۴۹
۵ قیدی نمبر ۱۰ ۵۹
۶ منکر نکیر ۷۱
۷ نذرل سے غالب تک ۸۵
۸ قندِ مکرّر ۹۷
۹ کیمپ نمبر ۴۴ ۱۰۷
۱۰ حدیثِ دیگراں ۱۱۵

۱۱	سنٹرل جیل : دارالامراء	۱۲۵
۱۲	سنٹرل جیل : دارالعوام	۱۴۵
۱۳	شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں	۱۷۱
۱۴	اسیری کا دوسرا سال	۱۸۹
۱۵	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۲۰۱
۱۶	نفسیاتی جنگ	۲۲۱
۱۷	آئینِ جوانمرداں	۲۴۱
۱۸	سحر قریب ہے یارو	۲۶۵
۱۹	غالب سے اقبال تک	۲۷۷
۲۰	دو مینار	۲۹۷

حرفِ اوّل

سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت مَیں لیفٹننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی کے ہیڈکوارٹر (ڈھاکہ) میں تھا۔ 'جنگ بندی' کے احکام جاری ہو چکے تھے لیکن بھارتی فوج ابھی ڈھاکہ نہیں پہنچی تھی۔ درِ قفس بند ہونے سے پہلے پرواز کی صورت پیدا ہوئی لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ساتھیوں کو چھوڑ کر بچ نکلنا بہادری ہے یا بزدلی؟ کچھ خیال یہ بھی تھا کہ راہِ فرار پُرخار ہے، پتہ نہیں کس مقام پر پاؤں فگار ہو جائیں اور دل ہمّت ہار دے۔ اس تذبذب میں اسے میری کم ہمّتی کہیے یا فرض شناسی کہ مَیں نے دوسروں کے ساتھ زمانے کا سرد و گرم چکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں جُوں جُوں مدّتِ اسیری طول پکڑتی گئی، مجھے اپنے فیصلے پر رشک آنے لگا، کیونکہ اسیری کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ مجھ پر اس کے محاسن روشن ہونے

لگے۔ جب بھی بھارت کی کوئی نئی ادا دیکھنے میں آتی اک نیا دریچۂ دل وا ہو جاتا۔ جب بھی ستمگر کوئی نئی بنائے ستم رکھتا، سوچ کا ایک نیا افق اُبھر آتا۔ یُوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا سرمایۂ حیات بڑھتا گیا حتیٰ کہ دو سال بعد جب واہگہ پہنچا تو مَیں ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی طرح تہی دامن نہ تھا۔ اب میرے کیسۂ دل میں قیمتی موتی اور میرے دامنِ خیال میں انمول گوہر تھے۔ مَیں نے انہی موتیوں اور گوہروں کو اس کتاب میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ ایک نوآموز کے ہاتھوں ان کی آب و تاب کہاں تک متاثر ہوئی ہے اس کا اندازہ آپ کو کتاب پڑھ کر ہی ہوگا۔

داستانِ اسیری کے کئی سیاسی اور فوجی پہلو بھی ہیں جن سے مَیں نے دانستہ طور پر دامن بچایا ہے کیونکہ میرے خیال میں سقوطِ ڈھاکہ کا اس وقت سیاسی اور فوجی تجزیہ قبل از وقت ہوگا۔ چنانچہ مَیں نے اس کتاب کے نفسِ مضمون کی مناسبت سے اسے صرف اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات تک محدود رکھا ہے۔

جس کتاب کا محور مصنّف کی ذات ہو اس میں "مَیں" یا "مجھے" کی ناگوار تکرار سے گریز مشکل ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ کتاب کی دوسری خامیوں کے ساتھ ساتھ صیغۂ متکلم کے جا و بیجا استعمال کو بھی دامنِ عفو میں جگہ دیں۔

سفرِ اسیری اور دوسرے سفروں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہر مسافر ایک سے تجربے سے گزرنے کے باوجود اپنے اپنے دامن کی وسعت کے مطابق تجربات اور مشاہدات جمع کرتا ہے اور ایک ہی خطّۂ ارضی سے لوٹنے والے سیّاح اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے الگ الگ سفر نامے لکھتے ہیں۔

نوّے ہزار اسیرانِ جنگ کے سفر کا بھی نقطۂ آغاز اور انجام ایک تھا۔ لیکن دورانِ اسیری ان کے راستے جُدا جُدا اور ان کی منزلیں الگ الگ تھیں۔ مَیں اپنے راستے اور اپنی منزلوں کی بات کرتا ہوں، وہ اپنے نقشِ قدم روشن کریں — اور یُوں سب کی

مساعی سے شاید اس دردناک سفر کی مکمّل تصویر مرتّب ہو سکے۔

قاری کو میری ذات کے گرد کئی اور چہرے بھی نظر آئیں گے۔ یہ چہرے میرے ہم قفس ہی نہیں، میرے دست و بازو بھی تھے۔ انہوں نے حتی المقدور میرا بارِ سفر ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اعانت کے بغیر شاید مَیں ان دشوار گزار گھاٹیوں سے نہ گزر سکتا۔ شاید کسی سنگِ راہ سے ٹھوکر کھا کر وہیں چُور ہو جاتا یا لُڑھک کر کسی تاریک وادی میں ایسا گرتا کہ پھر روشنی کی طرف پلٹ نہ سکتا۔ لہٰذا یہ چہرے مجھے بہت عزیز ہیں۔ اب بھی زندگی کے کسی موڑ پر ان چہروں کی چاندنی نظر آتی ہے تو میری زندگی کی شبِ تار جگمگا اٹھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ تابناک رکھّے۔

اس داستان میں جن احباب کا ذکر آیا ہے، مجھے ان سے بہت عقیدت اور اُلفت ہے۔ اگر کسی کے بارے میں غیر ارادی طور پر گستاخی کا کوئی کلمہ زباں دراز قلم کے مُنہ سے نکل گیا ہو تو مَیں معذرت چاہتا ہوں کیونکہ میرے پیشِ نظر کسی کی دلآزاری ہر گز نہیں۔ مَیں نے تو اسیری کے خارزار میں بھی غنچے اور پھُول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی غنچے کی مہک یا پھُول کی شگفتگی کو پامال کرنا میرا منشا نہیں۔

مَیں جناب شفیق الرحمٰن، کرنل محمّد خاں، سیّد ضمیر جعفری، منیر احمد شیخ اور دوسرے اہلِ قلم حضرات کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے پیارے پیارے خطوں سے جیل میں میرے ادبی ذوق کو تسکین بخشی۔ یہ خطوط اپنی جگہ ادبِ عالیہ کے عمدہ نمونے ہیں۔ مَیں ان پھُولوں کو اپنی روداد میں لپیٹ کر گرد آلود کرنا نہیں چاہتا۔ انشاء اللہ انہیں الگ قارئین کی نذر کروں گا۔

کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جناب قیوّم قریشی کا شُکر گزار ہوں کہ انہوں نے پروف پڑھ کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا۔ ان کی کوششوں کے باوجود اگر اس کتاب میں آپ کو غلطیاں نظر آئیں تو انہیں غلطیہائے مضامین سمجھ کر مصنّف کے

سر تھوپ دیں۔ قیوم صاحب کا دامن پاک ہی رہنے دیں۔

دیباچہ نویسی کے روائتی آداب پورے ہو چکے۔ آئیے اب قارئ محترم، آخر میں آپ سے ایک راز کی بات کر لیں وہ یہ کہ اگر آپ نے ایک سانس میں دیباچہ ختم کر لیا ہے تو ذرا ہمت کیجیے آپ ضرور کتاب پڑھنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے ــــــ ہمتِ مرداں مددِ خُدا۔

آئی ایس پی آر

ہلال روڈ، راولپنڈی — (میجر) صدّیق سالک

۳۱ مئی ۱۹۷۴ء

دیباچہ

صدّیق سالک سے میری پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی جب وہ تبدیل ہو کر ڈھاکہ جا رہے تھے۔ دوسری ملاقات تب ہوئی جب میں تبدیل ہو کر ڈھاکہ پہنچا۔ یہ مئی ۱۹۷۱ء کے دن تھے پھر مشرقی پاکستان میں تبیغوں کے سائے میں ہماری ملاقاتیں پل کر جوان ہوتی گئیں، مگر اس زمانے میں مشرقی پاکستان کی مخصوص مجروح فضا کی طرح ان ملاقاتوں کا بھی خاص لنگڑا سا انداز تھا۔

وجہ یہ تھی کہ سالک فوجی تھے۔ میں سویلین تھا۔ یہ مارشل لا کے ثنا خواں تھے، میں سول لا کا نوحہ کناں تھا۔ یہ آسماں پر تھے، میں زمین پر تھا۔ یہ رازداری کی قسم کے تابع تھے اور کچھ نہ بتاتے تھے اور میں خودداری کی رسم کا پابند تھا اور کچھ نہ پوچھتا تھا۔ اس لیے ہماری ملاقاتیں جتنی زیادہ تھیں، اتنی ہی کم تھیں۔ گویا

بھرے ہیں جس قدر جام و سبوُ مے خانہ خالی ہے

والا مضمون تھا۔ یعنی ہم بہت سی باتیں کرتے تھے، مگر اس موضوع پر بات نہ کرتے تھے جس پر مشرقی پاکستان میں گفتگو ہونا چاہیے تھی اور نہ صرف ایک دفعہ، بلکہ ہر وقت ہونا چاہیے تھی۔

مگر یہ انداز ہمارے لیے نہ تو اجنبی تھا اور نہ تکلیف دِہ، کیونکہ ہم دونوں اس قوم کے فرد تھے جو حقیقتوں سے نظریں چُرانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی؛ چنانچہ ہم دارالکباب پر جا کر رات کو کباب تو اکٹھے کھاتے تھے، مگر اس دھماکے کا تجزیہ نہ کرتے تھے جو دارالکباب کے پاس ہی چند گھنٹے پیشتر ہوا تھا۔

انہی دنوں سالک ایک کتاب لکھنے کا اکثر ذکر کیا کرتے اور جہاں تک میرا اندازہ تھا اس کے

لیے بہت محنت سے مواد جمع کر رہے تھے۔ وہ کتاب اِس کتاب سے مختلف ہوتی تھی جو آج آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب میں وہاں کی صورتِ حالات کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ ہونا تھا۔ میں سالک کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا اور دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ سالک یہ کتاب کیسے لکھ سکے گا، کیونکہ مملکتِ خداداد پاکستان بنا کر ہم نے اس انجمن کا دستور ہی نہیں بنایا کہ قومی سانحوں کا تجزیہ کر کے کتابیں لکھیں۔ دل کی لگی سنانا اور کھری کھری کہنا ہمارا مزاج ہی نہیں۔ سچی اور کھری بات کہنے کے لیے جس اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے، وہ ہماری درباری روایات کے قریب نہیں پھٹکی۔ اس لیے قوم پر بڑے بڑے سانحے گزر گئے، مگر دو ایک کوششوں کے سوا کوئی تڑپتی، پھڑکتی کتاب سامنے نہ آئی۔ سیاست دان، ادیب، صحافی، محقّق اور عالم سبھی اپنی مصلحتوں کی ریت میں منہ چھپائے آندھی کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہے اور خود فریبی کے عالم میں اپنے آپ کو "ہمچو ما دیگرے نیست" کی لوریاں دیتے رہے، اس لیے دل ہی دل میں حیران ہوتا رہا کہ سالک وہ کتاب کیسے لکھ سکے گا۔

اب سالک نے "ہمہ یاراں دوزخ" لکھی ہے۔ یہ وہ کتاب تو نہیں جس کی آرزو لے کر ہم وہاں سے چلے تھے، مگر پھر بھی سالک قابلِ تحسین ہے کہ اس نے کچھ تو لکھا۔ ابنِ بطوطہ بن کر نہیں لکھا، ادیب بن کر تو لکھا۔ مشرقی پاکستان کے متعلق نہ سہی، وہاں پر رہنے والوں پر جو بعد میں گزری، اس کے متعلق تو کچھ لکھا۔ بارش کا پہلا قطرہ گرا ہے۔ اب ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ بارش جاری رہے اور سالک مشرقی پاکستان والی کتاب بھی لکھ سکے۔

صدّیق سالک کی طرح میں بھی جنگی قیدی تھا اور ان ہی کی طرح اس واردات سے گزرا ہوں۔ یہ مت سمجھیے کہ مَیں گھر کا بھیدی بن کر ان کی تین سو صفحات کی لنکا ڈھانے کی دھمکی دے رہا ہوں، بلکہ یوں ہے کہ مَیں خالص آئینی انداز میں ان کی کتاب کی تائید اور تائیدِ مزید کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھا، تو

مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

ان کی کتاب میں میرے لیے بظاہر کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہی واقعات، دشمن کی وہی گیدڑ بھبکیاں،

وہی خاردار تاریں، وہی لڑائی جھگڑے، وہی مایوسیاں اور امیدیں۔ وہی خونِ دل میں ڈوبی ہوئی انگلیاں، حلقۂ زنجیر میں رکھی ہوئی زبانیں اور ان زبانوں سے دشمن کو للکار کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم !!

دو چیزیں البتہ میرے لیے بھی نئی تھیں۔ ایک تو مختلف ابواب کے تیکھے عنوان جو سپاہیانہ حقیقت پسندی اور شاعرانہ تخیل کا خوبصورت امتزاج پیش کرتے ہیں اور دوسرے مصنّف کا خوبصورت اندازِ بیان جو اُردو شاعری کی دھیمی لہروں میں ہلکے ہلکے ہلکورے لیتا رہتا ہے۔ حسنِ بیان بڑی موثر چیز ہے۔ اس سے غالب کا رازداں اس کا رقیب بن جاتا ہے اور سالک کا قاری مصائب، صعوبتوں اور تلخیوں کے ذکر کو کبھی گوارا اور کبھی خوشگوار پاتا ہے۔

یہ کتاب جنگی قیدیوں کے حالات، احساسات اور جذبات کو بھرپور انداز میں قاری تک پہنچانے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ اس میں داستان بھی ہے اور لوٹائے پریشان بھی۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک قاری وہاں کے متعلق جاننا چاہتا ہے۔

مگر اس میں کچھ اور بھی ہے:

وہ یہ کہ "ہمہ یاراں دوزخ" اس موضوع پر بہت عمدہ کتاب ہے جس کا اس کے موضوع میں کہیں بھی ذکر نہیں اور مجھے اس کی وہی بات سب سے زیادہ پسند آئی ہے جس کا بظاہر سارے فسانے میں ذکر نہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے باب نمبر چودہ اور پندرہ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" — اور — "نفسیاتی جنگ"، پڑھنے ضروری ہیں۔ یہ ابواب ایسے شفاف قطرے ہیں جن میں پورا دجلہ نظر آتا ہے۔ یہ دیدۂ بینا کے لیے جامِ جمشید کا کام کر رہے ہیں۔ یہ دو چیزیں بتاتے ہیں:

پہلی، وطن کے لیے قیدیوں کے دل میں بے پناہ محبت اور احترام۔

دوسری، قدم قدم پر بکھری ہوئی شہادتیں کہ ہندو کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہمارے وطن کو ختم کرنے کی خواہش بار بار چھلک پڑتی تھی اور اس کا دانستہ یا نادانستہ اظہار ہوتا رہتا تھا۔

یہ دونوں چیزیں مل کر اس جذبے کی تشکیل کرتی ہیں جسے جذبۂ قومیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس جذبے میں مزید تقویت وہ خبریں پیدا کرتی تھیں جو جنگی قیدی ہندوستانی اخباروں میں پڑھتے تھے۔ مثلاً:

● ــــــ علی گڑھ یونیورسٹی کا مسلم کردار بدلا جا رہا ہے، کیونکہ بھارت سیکولر ہے، مگر ہندو یونیورسٹی بنارس کا ہندوانہ کردار بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں، کیونکہ وہ نیشنل ہے۔

● ــــــ صرف اردو پڑھنے والوں کو ملازمتیں نہیں دی جائیں گی۔ تاوقتیکہ وہ ہندی کے امتحانات پاس نہ کریں۔

● ــــــ اردو کا رسم الخط دیوناگری میں بدلا جا رہا ہے۔

● ــــــ سقوطِ مشرقی پاکستان کے پانچ ہفتے بعد السٹریٹڈ ویکلی کا جو پرچہ آتا ہے، اس میں بغیر کسی شرم یا جھجک کے تصاویر کے ساتھ یہ تفصیل دی جاتی ہے کہ کس طرح ۱۹۴۸ء میں بیس ہزار مسلمانوں کا زبردستی مذہب تبدیل کر کے انہیں ہندو بنایا گیا۔

یہ سب کچھ پڑھ کر جنگی قیدی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ ستائیس برس سے ہمارے ادیب اور دانشور کتابیں لکھ رہے ہیں اور آپس میں بحث کر رہے ہیں کہ پاکستانی کلچر کیا ہے اور پاکستانی قومیت کی تعریف کیا ہے؟ مگر وہ آج تک اس کی کوئی تعریف وضع نہیں کر سکے، کیونکہ اکثر کو تو اس قسم کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی اور باقیوں کو ایک وحدت کی بجائے کئی ٹکڑے نظر آتے ہیں، مگر اب تک ہمارے ادیب اور دانشور نہ تو خود سمجھ سکے ہیں اور نہ قوم کو کچھ سمجھا سکے ہیں۔

لیکن ہمارا ہر جنگی قیدی، جو نہ دانشور ہے نہ عالم، پاکستانی قومیت اور کلچر کی تعریف خوب سمجھ چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیمپ کے گرد خاردار تاروں کے حصار نہیں تھے، بلکہ پاکستانی قومیت کی حدبندی تھی۔ ان تاروں کے اندر اسیرانِ وفا پاکستانی کلچر کا سمبل تھے۔ وہاں کوئی فرق نہ تھا کہ کون پنجابی ہے، کون سندھی ہے، کون پٹھان اور کون بلوچ ہے۔ وہ سب اس وجہ سے وہاں تھے کہ وہ پاکستانی تھے۔

ہمارا جنگی قیدی مثبت انداز میں نہیں تو منفی انداز میں سمجھ چکا ہے کہ ہر وہ چیز جسے ہندو اس برِّ عظیم سے مٹانا چاہتا ہے، پاکستانی قومیت اور پاکستانی کلچر کے زمرے میں آتی ہے، کیونکہ ہندو اس

برِّ عظیم کو گنشک اور ہرش کے زمانے کا اکھنڈ بھارت بنانا چاہتا ہے۔ یہ دو ابواب بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سالک کی کتاب اپنے موضوع پر بھی عمدہ کتاب ہے اور اس موضوع پر بھی عمدہ کتاب ہے جو بظاہر اس کتاب کا موضوع نہیں۔

جن دانشوروں اور عالموں کو پاکستانی قومیت اور پاکستانی کلچر کے معنی نہیں آتے اور وہ ابہام کی پریشانی میں بھٹک رہے ہیں، ان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ جنگی قیدی نہیں بنے، مگر ساتھ ہی ان کی خوش قسمتی بھی ہے کہ ایک جنگی قیدی نے وہاں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اگر وہ یہ کتاب صدقِ دل سے پڑھ لیں، تو شاید، بلکہ یقیناً ان پر پاکستانی قومیت کا تصور واضح ہو جائے گا اور انہیں احساس ہو جائے گا کہ

آنکھیں میری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار

مسعود مفتی

راولپنڈی ۱۷ / اکتوبر ۱۹۷۴ء

شمشیر سے زنجیر تک

بھلے وقتوں کی بات ہے کہ جو لوگ سرکاری یا غیر سرکاری طور پر کچھ عرصہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں گزار آتے تھے زندگی بھر اسی کی داستانیں مزے لے لے کر سُناتے رہتے تھے اور سُننے والے کے دل میں ایک حسرت بھری اُمنگ کروٹ لیتی تھی کہ کاش ارضِ وطن کے اس حسین خطّے کا دیدار مجھے بھی نصیب ہوتا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسی خطّۂ جنّت نشاں سے لَوٹنے والا ہر مسافر اپنے ساتھ ایک داستانِ خونچکاں لایا، جسے جو کوئی سُنتا، درد و کرب سے تلملا اُٹھتا۔ مجھے یہ دونوں بھلے اور بُرے وقت ڈھاکہ میں دیکھنے نصیب ہوئے۔ ایک سیلانی سیّاح یا گشتی صحافی کے طور پر نہیں، بلکہ اس شجرِ پابہ گِل کی طرح جس نے موسمِ گُل میں رنگ و بو کی دلآویز چادر اوڑھی اور موسمِ خزاں میں اپنے برگ و بار سے بھی محروم ہوا اور بالآخر ایک تند و تیز آندھی نے اسے جڑ ہی سے اُکھاڑ پھینکا۔

میں جب بھلے وقتوں میں مشرقی پاکستان پہنچا تو وہاں کے حُسنِ سادہ نے دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی متاثر کیا۔ وہاں سر مئی شام کو لان میں بیٹھتا تو ہولے ہولے چلنے والی بادِ نسیم ایک ہمدرد جلیس کی طرح سرگوشیاں کرتی۔ سیر کے لیے مضافات کا رُخ کرتا تو پھلوں سے لدی شاخیں جھک کر سلام کرتیں۔ کہیں بیٹھنے کو جی چاہتا تو زمین سبز قالین بچھا دیتی اور اگر گرمیوں میں سائے کی ضرورت ہوتی، تو تناور درخت چھتری تان دیتے۔

رنگینیٔ فطرت کے ساتھ ساتھ اگر ہم ذوق احباب بھی مل جائیں، تو جنّتِ ارضی کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے قیامِ مشرقی پاکستان کا لُطف دوبالا کرنے کے لیے بھی قدرت نے ملک کے مختلف حصّوں سے چیدہ چیدہ پھول اکٹھے کر کے مجھے ایسے ہی احباب کا ایک سدا بہار گلدستہ مہیّا کر دیا۔ اس گلدستے

کے سب سے شگفتہ پھول لیفٹیننٹ کرنل بشیر ملک تھے جو بذلہ سنجی میں اتنی دسترس رکھتے تھے کہ ہر جملے کو ہنسی کا پٹاخہ بنا دیتے تھے۔ کیا مجال کہ کسی بابِ محفل کی محراب پر کوئی سیاہ پٹی نمودار ہونے دیں۔ وہ برمحل لطیفے سُناتے ہی نہیں، تخلیق بھی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل افتخار تھے جو گھر گرہستی کی زندگی کے رسیا ہونے کی وجہ سے اکثر ڈھاکہ شہر میں کشیدہ کاری اور کٹ ورک کی دکانوں کے چکر لگاتے پائے جاتے تھے لیکن جب کبھی رانی کی فلم ڈھاکہ آتی وہ اپنی رفیقۂ حیات کی رفاقت چھوڑ کر فوراً رانی کی رنگ رلیوں میں شریک ہو جاتے۔ ایک دو دفعہ میں نے انہیں یہ چوری کرتے دیکھ لیا تو انہوں نے مصلحتاً ہمیشہ کے لیے مجھے حریمِ دوستی میں لے لیا۔ ان کے علاوہ اس گلدستے کی رونق لیفٹیننٹ کرنل افضل کیانی تھے جو انناس کے سب سے بڑے نبض شناس سمجھے جاتے تھے۔ کیا مجال کہ ہم میں سے کوئی ان کی اجازت کے بغیر انناس کی کسی نس کو چھو بھی جائے! وہ انناس کو ٹٹول کر، تراش خراش کر سب سے عمدہ پھانک کو منہ میں یوں رکھتے کہ دانتوں کی ٹھیس کے بغیر سارا رس نکل آئے۔ وہ ہر قاش کو لبِ یار کی طرح نازک اور رسیلا سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔ اسی گلدستے کے ایک اور پھول لیفٹیننٹ کرنل شریف چودھری تھے جو اپنی جداگانہ مہک رکھتے تھے۔ وہ نسبتاً کم آمیز اور وضعدار تھے لیکن ہر شخص ان کی شرافت و حکمت کا معترف تھا۔ اگر کوئی ان کی شرافت کا اسیر نہ ہوتا تو اسے حکمت کا دارو دے کر حلقہ بگوش کر لیتے۔ ان کی گولیوں میں اتنا اثر تھا کہ مرض تو بعض اوقات چلا جاتا تھا، لیکن مریض ان کے آستانے سے کبھی نہ جاتا تھا اور ہاں انہی پھولوں کی ہم نشیں وہ نوخیز کلی کیپٹن غلام رسول جو شادی کے چند روز ہی بعد اپنی دلہن سے جُدا ہو کر ہم سے آملے تھے۔ وہ ہر رنگ، ہر انگ اور ہر آہنگ میں حُسنِ یار تلاش کرتے اور پا لیتے تھے۔ انہیں کٹھل ● سے لے کر لیچی ● تک ہر شے میں نقشِ یار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ڈھاکہ کی ریشہ دار گھاس کی طرف منہ کرتے تو انہیں زلفِ یار کی خوشبو آتی اور جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتے تو بے اختیار کہہ اُٹھتے "یہ چاند میری دُلہن سے ہو کر آیا ہے۔ ضرور کوئی محبت بھرا پیغام لایا ہوگا!"

● مشرقی پاکستان کا جسیم ترین پھل جو سر پر گر پڑے تو فی الفور شہادت واقع ہو جائے
● لیچی کٹھل کے بالکل برعکس، ننھا رسیلا اور خوش ذائقہ پھل

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سیاسی موسم بدلنے سے اس گلدستۂ احباب کا رنگ بدلنے لگا۔ بوٹے گل، گُل سے جُدا ہونے لگی۔ ساری فضا یکسر بدل گئی۔ اب شام کی ٹھنڈی ہوائیں سسکیاں بھرتی پاس سے گزر جاتیں۔ زمین نے سبز قالین سمیٹ لیا اور اس کی جگہ خار زار نے لے لی۔ پھلوں سے جُھکی ہوئی شاخیں آتے جاتے چہرے پر تھپیڑ کی طرح پیوست ہو جاتیں۔ فضا میں یہ تبدیلی دراصل مکدّر سیاسی ماحول کا نتیجہ تھی۔ سیاست کی گرما گرمی میں مشرقی پاکستان سے ”زیادتیوں“ کو ہوا دے کر نفرت کی آگ بھڑکائی گئی اور بالآخر ”اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔“

اس آگ کو بجھانے کے لیے جو پانی پھینکا گیا' اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ شعلے اور بھڑک اٹھے۔ ہر شخص برگ وگُل کو بچانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ کوشش اگرچہ کامیاب نظر آتی تھی، لیکن اس کے باوجود کئی پھولوں کی پتّیاں بکھر گئیں۔ کئی پتے بھسم ہو گئے اور کئی شاخیں جُھلس گئیں۔ بظاہر مجموعی طور پر ویرانیٔ گلشن کا تدارک ہو گیا، لیکن سرحد پار سے انہی دنوں اپنی آستینوں میں برق کے شعلے چھپائے سیاہ پوش بادل اُمڈے۔ جوں جوں حالات کا دھارا تیز ہوتا گیا، ان بادلوں کی گھن گرج بلند تر ہوتی گئی۔ پھر ایک دن کڑاکے کی بجلی ہمارے گلستانوں پر گری۔ کیا پھول اور کیا خس وخاشاک، کسی چیز کا بھی بچنا مشکل نظر آنے لگا۔ آخری آزمائش کا وقت آ پہنچا۔ باغبان اور صیّاد اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ گئے... بھرپور لڑائی شروع ہو گئی۔

جنگ کے دوران میں اصل صورتِ حال سے صرف وہی لوگ باخبر تھے جن کا براہِ راست جنگی کارروائیوں سے تعلّق تھا۔ اور یہی فوج کا دستور ہے۔ دوسروں کو خبروں کا صرف اتنا ہی راشن دیا جاتا جتنا وہ ہضم کر سکتے۔ چونکہ اس معاملے میں ہمارے ہاضمے خاصے کمزور تھے، اس لیے جنگی خبروں کی خفیف سی خوراک ملتی تھی، لیکن جذبۂ تجسّس قوّتِ ہاضمہ کے تابع نہ تھا؛ چنانچہ ہم ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرز آپریشن روم سے نکلنے والے افسروں کے چہرے پڑھتے رہتے۔ اگر زمین دوز آپریشن روم سے کرنل صاحب مسکراتے ہوئے نکلتے تو ہم سمجھ لیتے کہ دشمن کا حملہ پسپا ہو گیا اور اگر ان کا سر ذمّہ داری کے بوجھ سے گریبان کی طرف جھکا ہوا ہوتا تو ہم یہ قیاس کرتے کہ دفاعی لائن میں کہیں جھکاؤ آ گیا۔

لیکن ہر چہرہ کُھلی کتاب نہیں ہوتا اور ہر آنکھ چشمِ بینا نہیں ہوتی؛ چنانچہ آخری دم تک ہم حقیقت سے ذرا دُور لفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی○ کے پُرعزم اعلانات اور دارالحکومت کے دعووں پر تکیہ کیے رہے۔ ڈھاکہ میں جنرل نیازی چھاتی ٹھونک کر کہہ رہے تھے کہ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے بھارتی ٹینکوں کو اس سینے پر سے گزرنا ہوگا اور مغرب سے نوید آتی تھی کہ "شمال کی جانب سے ہمارے زرد دوست اور جنوب کی سمت سے سفید دوست ہمارے لیے بڑے پیمانے پر مداخلت کرنے والے ہیں"۔ ہم اس منجدھار میں انہی اعلانوں اور دعووں کی کشتیوں پر سوار تھے کہ ناگہاں سقوطِ ڈھاکہ کی خبر عام ہوئی۔

ڈھاکہ چھاؤنی میں یہ خبر یاس والم کا پیغام بن کر آئی۔ جذبۂ جہاد سے سرشار چہرے یک لخت بُجھ گئے، آنکھیں ڈبڈبا گئیں، جگر پارہ پارہ اور دل فگار ہو گئے۔ کچھ احباب کوڑے کرکٹ کی پوٹلیوں کی طرح کونوں کھدروں میں جا دبکے اور بعض نے اندرونی ابال آنسوؤں کی صورت میں نچوڑ دیا۔ کچھ نے اپنے چہرے رومال یا ٹوپی میں چھپا کر آہ وفغاں کو پابند کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود ان کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں اور جسم دھنکنی کی طرح کانپتے رہے۔

یہ ماتم، یہ آہ وفغاں اور گریہ وزاری سپاہیانہ شان کے شایان نہ سہی، لیکن جواں مرگ پر کس کا کلیجہ منہ کو نہیں آتا! آج چوبیس سالہ پاکستان کا عین عالمِ شباب میں آدھا دھڑ کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا تھا۔

اس ماتمی ماحول سے فرار کی خاطر میں نے بشیر، کیانی، غلام رسول کو ڈھونڈا کہ شاید وہی عزم و ہمت کی شمع جلائیں لیکن آج وہاں بھی رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا۔ آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل بشیر ملک سراپا اندوہ تھے، کیانی کی آنکھوں سے آنسو اُبل اُبل آتے تھے اور انہیں وہ اپنے خاکی رومال میں جذب کرتے جاتے تھے۔ نوجوان غلام رسول بارِ حسرت سے کبھی زمین اور کبھی آسمان کو دیکھتا تھا۔ کسی کو مجھ سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے یوں

○ مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کے سربراہ کمانڈر ایسٹرن کمانڈ، اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون "بی"

محسوس ہوا کہ میرے احباب وہاں سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گئے ہیں۔ اور اب صرف ان کے سرد مجسّمے میرے سامنے رکھے ہیں جن کی زبانیں گنگ ہیں اور چہرے سُتے ہوئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ایک ہی چھاپ کے نقاب (MASK) پہن رکھے ہیں۔ اس سنّاٹے میں صرف نگاہیں بولتی تھیں۔ اور وہ بھی کہتی کم اور پوچھتی زیادہ تھیں۔ ان کا ایک ہی سوال تھا "یہ سب کیا ہوا؟ کیونکر ہوا؟" ان سوالوں کا جواب ان پیشہ ور سپاہیوں کے پاس نہ تھا جنہوں نے حکم کی تعمیل میں ہتھیار اٹھائے تھے اور حکم ملنے پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اور غالباً یہی پاکستانی سپاہی کی کُل داستان ہے۔ لیکن آج وہ ایک ایسے المیے سے دوچار تھے جسے سوچ بچار کی بھٹّی میں پگھلائے بغیر وہ ہضم نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس المیے کے اسباب و علل پر سوچا اور خوب سوچا۔ لیکن ان کی سوچ اس بنیادی گُتھّی کو نہ سُلجھا سکی۔ اور بالآخر اس نکتے پر آکر رُک گئی کہ کلنک کا یہ ٹیکہ ملّت کی بے داغ پیشانی سے دھونا ضروری ہے۔ خواہ اس عزم کی تکمیل میں ایک ماہ لگے، ایک سال یا ایک نسل — قوم اپنا منہ، رومال یا ٹوپی میں چھُپا کر زندہ نہیں رہ سکتی!

ہم دشتِ غم میں پڑے آنے والے دنوں کے متعلّق سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک سینئر رفیقِ کار غم و غصّہ سے کانپتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ مضبوط قویٰ کے آزمودہ کار سپاہی تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء کی لڑائی کے دوران معرکۂ چھمب جوڑیاں میں حصّہ لیا تھا اور دشمنوں پر اپنی سپاہیانہ برتری کا سکّہ جما دیا تھا۔ وہ آج ایک اور سینئر افسر کے ساتھ ڈھاکہ ائرپورٹ پر بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف سٹاف کو لینے گئے تھے۔ کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ جب بھارتی افسر جنگ بندی کے کاغذات سمیت ہیلی کاپٹر سے اُترے تو بنگالیوں نے اُسے گلے لگالیا، ہار پہنائے اور اس کی دلجوئی کے لیے کئی کلمات کہے جن میں سے یہ جملہ میرے کان بھی پڑا۔ "ان درندوں سے نجات دلانے کا احسان ہم عمر بھر نہیں بھولیں گے۔"○ ۱۹۶۵ء کے اس ہیرو کے لیے یہ جملہ توپ کے گولے سے زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا

○ باقی جملے ان الفاظ سے بھی زیادہ درشت تھے۔

اور وہ واپس چلا آیا۔

ہم میں سے جو لوگ بنگالی مزاج سے واقف تھے، انہوں نے تسلّی دی کہ بنگالی بنیادی طور پر جذباتی ہے۔ وہ جذبات کی رَو میں جس چہرے کو چومتا ہے، وقت آنے پر اسی پر تھوکتا ہے۔ اس وقت یہ تجزیہ محض طفل تسلّی معلوم ہوا لیکن ایک سال بعد ہم نے بھارتی اخبارات میں پڑھا کہ اہلِ بنگلہ دیش کہتے ہیں "بھارت نے ہمیں کیا دیا؟ ایک شاعر وہ بھی پاگل ○ !"

جنگ بندی کی تفصیلات اور شرائط طے ہونے کے بعد بھارتی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا ۱۶ دسمبر کی سہ پہر کو کلکتہ سے اگرتلہ کے راستے ڈھاکہ پہنچا۔ جنرل نیازی اسے لینے ہوائی اڈّے پر موجود تھے۔ جنرل اروڑا کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ اروڑا خالص سکھ نسل کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کے جنگل کے اس پار پگڑی کا ایک چبوترہ تھا، جس کے گرد جرنیلی کی لال پٹّی لگی ہوئی تھی۔ اگر کندھوں سے نیچے دیکھا جائے تو بالکل انسانی پیکر نظر آتا تھا۔ لیکن جوں جوں نگاہ اوپر اٹھتی، اپنے مشاہدے پر شک ہونے لگتا۔ جنرل نیازی صاف ستھری وردی میں پوری سپاہیانہ وجاہت کے ساتھ کھڑے تھے۔ کہتے ہیں کہ فوجی ملازمت کے آغاز میں وہ ایک دوسرے سے واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن آج انہیں فاتح اور مفتوح کے روپ میں ایک دوسرے کا سامنا تھا۔ جونہی اروڑا ہیلی کاپٹر سے اُترا جنرل نیازی نے آگے بڑھ کر سلیوٹ کیا جس کے جواب میں خالص فوجی انداز سے جنرل اروڑا نے جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں نے مصافحہ کیا۔ کیمروں کی یلغار ان تاریخی لمحات کو فلم کے فیتے پر محفوظ کرنے لگی۔

ایرپورٹ پر مرکزی کردار تو یہی دو تھے لیکن وہاں تماشائیوں کا ایک جمِ غفیر تھا، جسے گنتی کے بھارتی سپاہی روکے ہوئے تھے۔ خاص خاص بنگالی عورتیں اور مرد ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے جنرل اروڑا اور اس کی بیوی کو پھولوں اور بوسوں کے ہار پہنائے۔ جنرل اروڑا کے لیے یہ پھول رنگ و بو کے پیکر تھے، لیکن جنرل نیازی کے لیے انگارے۔ ہوائی اڈّے کی فضا فاتح

○ ان دنوں شاعرِ بنگال قاضی نذر الاسلام تازہ تازہ کلکتہ سے ڈھاکہ منتقل ہوئے تھے۔

کے لیے مسرّت و انبساط سے لبریز تھی اور مفتوح کے لیے ذلّت و ہزیمت کی پیامبر۔ تھوڑی دیر بعد جنرل نیازی اور اروڑا اس ہجوم سے نکل کر ڈھاکہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

رمنا ریس کورس میں پہلے ہی بھارتی ایما سے لاکھوں لوگ جمع تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ۷ مارچ ۷۱ء کو شیخ مجیب الرّحمٰن نے سول نافرمانی کی مہم کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت عام تاثّر یہ تھا کہ مجیب الرّحمٰن آزادی کا اعلان کریں گے، لیکن وہ نہ کر سکے، کیونکہ پاکستانی فوج حائل تھی۔ آج مجیب الرّحمٰن کی راہ سے یہ آخری روڑہ ہٹانے کے لیے اروڑا آیا تھا۔ اور اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لیے جنرل نیازی موجود تھے۔

اگرچہ احکام یہ تھے کہ تا حکمِ ثانی ڈھاکہ چھاؤنی کے جملہ افراد اپنے اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھیں گے اور باقی اضلاع میں مقامی کمانڈر ہتھیار ڈالنے کے وقت اور جگہ کا تعیّن کریں گے۔ لیکن بنگالی عوام کے سامنے مفتوح کو ذلیل کرنے کے لیے فاتح نے یہ طے کیا کہ کم از کم جنرل نیازی ۱۶ دسمبر ہی کو ہتھیار ڈال دیں تاکہ بنگلہ دیش کے برتھ سرٹیفکیٹ پر تصدیق کی مہر ثبت ہو جائے؛ چنانچہ اسی میدان کو "جنگ بندی" کے معاہدے پر دستخط اور جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کی رسم کے لیے منتخب کیا گیا۔

رمنا ریس کورس میں اتنا بڑا انسانی سمندر شاید کبھی "بنگہ بندھو"○ کی تقریر سننے کے لیے بھی جمع نہ ہوا تھا۔ یہ سمندر جذباتی ہیجان سے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ دُور دُور تک انسانی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے، چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے۔ غرضیکہ ایک قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ لاکھوں کے اس مجمع میں بعض اہلِ بصیرت بھی تھے جو بالکل چپ سادھے کھڑے تھے۔ معلوم نہیں وہ پاکستان کے ٹکڑے ہونے پر پریشان تھے یا بھارتی بالادستی کی بھیانک تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ لیکن ان کی طرف دھیان کون دیتا؟ آج کا دن اہلِ خرد کا نہیں، دیوانوں کا تھا۔ اور دیوانے جب بے لگام ہو جائیں تو ان سے کچھ بعید نہیں ہوتا، لہٰذا حفظِ ماتقدم کے طور پر بھارتی

○ مجیب الرّحمٰن کا مقبولِ عام نام

سپاہی اس سمندر کے آگے بند باندھے کھڑے تھے۔ آگے جو جگہ خالی تھی وہ آج کی تقریب کی رسوم کے لیے مخصوص تھی۔

اس تقریب میں فاتحین کی طرف سے کئی سینئر اور جونیئر افسر موجود تھے۔ لیکن پاکستان کی طرف سے اس طعن و تشنیع کا واحد نشانہ جنرل نیازی تھے۔ جنرل فرمان علی کو بھارتی جنرل ناگرا اپنے ساتھ لے گیا تھا، حالانکہ اس رُسوائی میں ان کی شرکت تقریبی لحاظ سے ضروری نہ تھی۔ اس کے علاوہ صحافی، فوٹوگرافر اور کیمرہ مین خاصی تعداد میں موجود تھے۔

آخر اس ذلت آمیز تقریب کا نقطۂ عروج آپہنچا۔ پاکستان اور بھارت کے مختصر دستوں نے الگ الگ گارڈ آف آنر (GUARD OF HONOUR) پیش کیا جن کا معائنہ جنرل نیازی اور جنرل اروڑا نے مل کر کیا۔ اس کے بعد دونوں نے ایک مختصر سی میز پر بیٹھ کر "جنگ بندی" کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اس وقت جنرل نیازی کی چھاتی کراس بیلٹ (CROSS BELT) اور جنگی اعزازات کی علامتوں سے سجی ہوئی تھی اور ان کے چہرے پر جذبات پر قابو پانے کی کوشش کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے بعد وہ سپاہیانہ تحمّل اور وقار کے ساتھ اُٹھے اور اُٹھ کر اپنا ریوالور میز کے اس پار جنرل اروڑا کے حوالے کیا۔ ریوالور حوالے کیا کیا، مشرقی پاکستان حوالے کر دیا۔

○○

"ہتھیار بر زمین شو"

مشرقی پاکستان کی انتظامیہ جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے سے چند روز پہلے ہی دم توڑ چکی تھی۔ گورنر ہاؤس پر بھارتی طیاروں کی بمباری سے لوہے اور سیمنٹ کے ٹکڑے کیا بکھرے تھے، حکومتِ مشرقی پاکستان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ گورنر اے ایم مالک، ان کی کابینہ کے بعض ارکان اور اعلیٰ سول حکام نے (جن کا تعلّق مغربی پاکستان سے تھا) ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پناہ لے لی تھی۔ یہ ہوٹل دورانِ جنگ غیر جانبدار علاقہ (NEUTRAL ZONE) بن چکا تھا۔ اس کے پھاٹک اور چھت پر ریڈ کراس کے بڑے بڑے نشان دُور سے نظر آتے تھے لیکن موجودہ حالات میں اس علاقے کی غیر جانبداری اور اس میں مغربی پاکستان کے پناہ گزینوں کی سلامتی کی ضمانت دینے والا کوئی نہ تھا؛ چنانچہ جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ان پناہ گزینوں کو ڈھاکہ چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔

اب مشرقی پاکستان کا کوئی حاکم نہ تھا۔ انتظامیہ کے سول اور فوجی سربراہ سبکدوش ہو چکے تھے۔ ایک نے سرِعام ہتھیار ڈال دیے تھے ــــ اور دوسرے نے مسندِ گورنری سے دستبردار ہو کر غیر جانبدار علاقے میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ بنگلہ دیشی حکومت ابھی کلکتہ میں بیٹھی ڈھاکہ میں اپنی رسمی آمد کی تیاری کر رہی تھی اور بھارتی فوج ابھی جنگ کی افراتفری سے سنبھل نہ پائی تھی؛ چنانچہ مشرقی پاکستان کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔

بھارتی ریڈیو نے ۱۴ر دسمبر ہی سے ہتھیار ڈالنے کی خبریں نشر کر کے تخریب پسندوں کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی دعوت دینی شروع کر دی تھی، لہٰذا مکتی باہنی کے ہتھیار بند غول ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ جس کسی کو چاہتے، لُوٹ لیتے، جس کسی کو پاکستانی سمجھتے، سنگینوں سے چیر

ڈالتے، کئی پاکستانیوں کو پاکستانی فوج سے تعاون کرنے کی سزا کے طور پر کھڑے کھڑے گولی سے اُڑا دیا اور بعض کو زمین پر چت لٹا کر سینے میں سنگینیں گھونپ دیں۔ (ان ظالمانہ حرکتوں کی تصویریں ہم نے بعد میں بھارتی اخبارات اور رسائل میں بھی دیکھیں) بعض اضلاع میں پاکستان سے وفا کرنے والوں کو گاڑیوں کے پیچھے باندھ کر سڑکوں اور گلیوں میں گھسیٹا گیا اور جن کے خلاف شدّتِ انتقام عروج پر تھی، ان کی ٹانگیں جیپوں سے باندھ کر انہیں زندہ چیر دیا گیا۔ یہ اجمال ان لوگوں کی کارروائیوں کا ہے جو انسانی خون کے پیاسے تھے۔ ان کے علاوہ جن پر جنسی بھوت سوار تھا، انہوں نے اپنے ان سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بے دریغ خون بہایا اور معصوم عورتوں کی عصمتیں تاراج کیں، وسیع پیمانے پر لوٹ مار کی۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔

متاثرین میں سب سے مظلوم طبقہ ان محبِّ وطن پاکستانیوں کا تھا جنہیں "بہاری" کہا جاتا ہے۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے صوبہ بہار میں رہتے تھے اور ۱۹۴۶-۴۷ء میں مشرقی بنگال منتقل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے نئے وطن کی تعمیر و ترقّی میں اپنا تن من اور دھن لگا دیا۔ وہاں چوبیس برس میں ان کی ایک پوری نسل پل کر جوان ہوئی، لیکن پھر بھی انہیں مہاجر ہی کہا جاتا رہا۔ ارضِ بنگال نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آج وہ دھتکارے ہوئے انسانوں کی طرح ڈھاکہ کی نواحی بستیوں محمّد پور اور میر پور میں امید و بیم کی حالت میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ بادِ سموم کا ایک جھونکا آتا اور کئی خاندانوں کے چراغ بجھا کر چلا جاتا۔ جس ہتھیار بند بنگالی کا دل چاہتا ان کی جان، مال اور عزّت سے کھیل جاتا۔ وہ جاتے تو کہاں جاتے! ان کی پاسبانی کرنے والی پاک فوج خود ذلّت کے بندھن میں اسیر تھی۔ کسی اللہ والے کی بھی متاعِ دین و دانش محفوظ نہ تھی۔

ڈھاکہ شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ جو لوگ خوش قسمتی سے بچ کر نکل سکتے تھے، نکل آئے اور ڈھاکہ چھاؤنی میں آکر پناہ لی، کیونکہ ان کے خیال میں یہ محفوظ جگہ تھی۔ اگرچہ یہ ان کی غلط فہمی تھی، مگر وہ یہاں نہ آتے تو کہاں جاتے! ٹوٹے ہوئے بازو گلے ہی کو تو آتے ہیں، چنانچہ انہیں چھاؤنی کے مشرقی حصّے میں جہاں پاک فوج محبوس تھی، جمع ہونے کو کہا گیا۔ جس کو جہاں جگہ ملی، بیٹھ گیا۔

سامنے گراؤنڈ میں، پیچھے گراؤنڈ میں، برآمدوں میں، دالانوں میں، باڑوں میں، پچھواڑوں میں۔ شام ہوتے ہوتے وہ کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کا واحد اثاثہ وہ چیتھڑے تھے جو ان کے تن پر بار تھے۔ سازوسامان کا بھلا کسے خیال آتا! وہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اس افراتفری میں ہمیں کہیں بھی بھارتی فوج معقول تعداد میں نظر نہ آئی۔ جدھر نگاہ اُٹھتی اپنے ہی نظر آتے۔ سب بال و پر بریدہ، لیکن صیّاد کہیں دکھائی نہ دیا۔ لمحہ بھر کو سوچا

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!

بھارتی فوج کے ناکافی ہونے کی تصدیق اس سرکاری حکم سے بھی ہوئی جس کے تحت طے پایا تھا کہ اگلے حکم تک تمام افسر اور سپاہی اپنے اپنے ذاتی ہتھیار (رائفل، ریوالور یا سٹین گن○) اپنے پاس رکھیں، کیونکہ مکتی باہنی کے افراد اکّا دکّا پاکستانی سپاہیوں کو نفرت اور گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ ۱۹ دسمبر تک ہمارے اور مکتی باہنی کے درمیان حدِ فاصل یہی ہتھیار تھے، تا آنکہ بھارتی فوج معقول تعداد میں ڈھاکہ پہنچ گئی۔

بھارتی فوج کی کمی سے اکثر دلوں میں فرار کی کرن پھوٹی، لیکن جنوں کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی خرد نے اسے بجھا دیا۔ چھاؤنی سے بھاگ کر کہاں جائیں؟ نہ بنگلہ دیش کی فضا سازگار ہے نہ بھارت کی۔ برما دور اور اس کا راستہ دشوار گزار اور پُر خطر۔ ادھر نیپال کے راستے میں بھی بھارت پڑتا ہے اور بھارت سے پہلے بنگلہ دیش۔ لیکن یہ سب حیلہ سازی تھی۔ دراصل — طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی۔ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ بندی کے معاہدے کی تشہیر کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ بنگلہ دیش سے سیدھے وطن ہی جانے کی امید بندھتی تھی۔ یعنی انتظامات کو آخری شکل دینے میں چند دن لگ جائیں تو اور بات ہے، ورنہ معاہدہ یہی ہوا ہے۔ اس لیے جان جوکھوں میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟ بعض نے یہ بھی سوچا کہ ہتھیار ڈالنے کا حکم غیر قانونی ہے اور فوج میں صرف قانونی حکم ماننے کی روایت ہے؛ چنانچہ چند نوجوان حکم عدولی کرتے ہوئے قید و بند سے ہمیشہ

○ بھاری ہتھیار مثلاً توپیں، ٹینک اور ہوائی جہاز وغیرہ پہلے ہی بھارت نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔

کے لیے آزاد ہو گئے۔

جنہیں جان، جان آفریں کے سپرد کرنی تھی، کر دی۔ باقی سب نے اسے بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اسیر ہوئے۔ اسیری کا پہلا کھانا ۶ ار دسمبر کو غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے ملا یہی لیٹ لنچ تھا اور یہی ارلی ڈنر○، کیونکہ یہ اس روز کا واحد کھانا تھا۔ کھانا کیا تھا، چنے کی پتلی دال اور جہازی سائز کی دو کچی پکی چپاتیاں۔ لذّتِ کام و دہن کا یہ نیا تجربہ تھا۔ بظاہر تو راشن بھی پاکستانی تھا، پکانے والے بھی پاکستانی تھے اور کھانے والے بھی۔ لیکن گلشن میں بند و بست برنگ دگر تھا آج۔

شام ڈھلے چھاؤنی میں پہلی بار برقی قمقمے جلے، سوچا کہ اس روشنی سے تو وہ تاریکی اچھی تھی جس کے پردے میں آزادی کا بھرم پوشیدہ تھا۔ اس روشنی نے وہ پردہ بھی چاک کر دیا۔ روشنی کی سوئیاں چُبھنے لگیں تو آنکھیں موند لیں۔ سوچ کی سوئیوں نے کریدا تو بستر پر تلملانے لگا، اتنے میں باہر اکّا دکّا گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ پتہ چلا کہ مکتی باہنی والے پریشان کر رہے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس ابھی ہتھیار ہیں، اس لیے انہیں آگے آنے کی جرأت نہیں؛ تاہم ساتھ والے دفتر سے ایک پاکستانی افسر نے ٹیلیفون پر بھارتی حکّام کو خطرے سے آگاہ کیا اور بوقتِ ضرورت جوابی فائر کرنے کی اجازت چاہی، لیکن جواب نفی میں ملا۔ تھوڑی دیر بعد گولیوں کی آواز خود بخود تھم گئی۔

میں کوارٹر سے باہر نکلا، تاروں بھری رات تھی، لیکن تاروں کی روشنی آسمان تک محدود تھی۔ زمین پر ہنوز تاریکی کا غلبہ تھا۔ میرے قدم بے اختیار اس ملحقہ گراؤنڈ کی طرف اُٹھ گئے جہاں لُٹے پُٹے قافلے والے پناہ گزین تھے۔ خیمۂ افلاک کے سوا ان کے سر پر کسی شے کا سایہ نہ تھا۔ وہ ذلّتِ آشیاں بندی کے بھی اہل نہ تھے۔ وہ کُہر کی چادر اوڑھے، شبنم آلود گھاس پر بیٹھے ٹھٹھر رہے تھے۔ چند ایک نے گھاس پھُوس اکٹھی کر کے الاؤ سا جلا رکھا تھا۔ جہاں سے آگ کم اور دھواں زیادہ اٹھتا تھا اور جہاں آگ نہ جلے وہاں دھواں ہی غنیمت ہے۔ کم از کم حرارت کا احساس تو رہتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں مجھے یہ سب ایسے ماہی گیر لگے جن کی کشتیاں، جن کے جال، جن کے اہل و عیال ایک تند

○ فوج میں کھانے کے اوقات کے لیے یہ اصطلاحیں عام ہیں۔ لیٹ لنچ: دوپہر کا کھانا جو دیر سے ملے
ارلی ڈنر: شام کا کھانا جو قبل از وقت ملے۔

طوفانی لہر بہالے گئی ہو اور انہیں مزید کشمکشِ حیات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ساحل کی گیلی ریت پر پھینک گئی ہو۔

مَیں واپس آکر پھر بان کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ یکایک تڑ تڑ کی آواز آئی اور متواتر چند منٹ تک آتی رہی۔ جواباً دو ایک گولیاں چلیں، تو دوسری جانب سے فائر بند ہوگیا۔ سونے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ دماغ تھا کہ ایک تیز مشین کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا اور ماضی کے مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے گھومتے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی تشکیل، قراردادِ پاکستان، ریفرنڈم، آزادی اور آزادی کے چوبیس سال۔ تاریخ کے ان چوکھٹوں میں مرصّع اکابر کی تصویریں — سرسید، اقبال، قائدِ اعظم کی تصویریں۔ مجھے گھورنے لگیں۔ ان سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمّت نہ تھی۔ احساسِ شکست سے میں رو دیا اور رویا بھی ایسا کہ خون ہو کر جگر آنکھ سے ٹپکا۔

صبح ہونے کو آئی تو آنکھ لگ گئی۔ ذرا سکون آیا، لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک گہرے سمندر مَیں اس کی بلاخیز موجوں سے نبرد آزما ہوں۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے ہیں۔ لہریں بپھرتی جا رہی ہیں۔ دُور دُور تک کنارہ نظر نہیں آتا۔ گلے تک ڈُوب چکا ہوں۔ پانی ٹھوڑی کو چھُو رہا ہے اور ابھی ناک اور منہ میں چلا جائے گا اور میں ڈُوب جاؤں گا۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتنا مہیب خواب تھا، لیکن گرد و پیش کا احساس ہوا، تو حقیقت کو مہیب تر پایا۔ خواب اور حقیقت کے درمیان کوئی ایسی جائے اماں نظر نہ آئی، جہاں میں پناہ حاصل کر سکتا۔ دیوانِ غالب پر نظر پڑی، کھولا، دو چار ورق اُلٹے اور نگاہیں اس شعر پر آکر رُک گئیں ؎

نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پَر بستہ
پٹکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

صُبح ہوئی، چائے یا ناشتے کا نام و نشان نہ تھا۔ سُنا تھا کہ لنگر پر چائے بنی تھی اور جو بڑھ کر اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ میری طرح جو کنجِ قفس میں پڑے حلقۂ دامِ خیال میں مُبتلا رہے، انہیں خونِ جگر پر گزارا کرنا پڑا۔

ابھی میں چائے نوشوں اور خونِ جگر پینے والوں کے سود و زیاں کا حساب کر ہی رہا تھا کہ ایک چپڑاسی نے ہمارے ایک سینئر افسر کی طرف سے ایک میٹنگ میں فوری شرکت کی دعوت دی، سوچا کیا اب بھی کسی میٹنگ کی ضرورت باقی ہے؟ بہر حال اب تو ہم رمنا ریس کورس کی تقریب کے بعد بھارتی افسروں کے بھی حکم کے تابع ہو گئے تھے۔ بھلا انہوں کا حکم کیوں نہ مانتے! تعمیلِ ارشاد میں فوراً کانفرنس روم میں پہنچے۔ وہاں ایک خالص پاکستانی اجتماع نظر آیا۔ مختلف شعبوں اور یونٹوں سے تعلّق رکھنے والے سو سے زیادہ افسر موجود تھے۔

کانفرنس کیا تھی۔ نئے حاکموں کے احکام سُنانے کی تقریب تھی۔ نہ احکام سُنانے والا خوش تھا اور نہ سُننے والے۔ لیکن یہ ان مشکل مقامات میں سے ایک مقام تھا جن سے گزرے بغیر ہمارے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ کانفرنس کے شرکاء کے چہروں پر اب ۱۶ دسمبر کے غم و اندوہ کی گہری چھاپ نہ تھی؛ تاہم خوش دلی بھی مفقود تھی۔ شکست و ریخت کے بعد جذبات ابھی نارمل نہ ہوئے تھے۔ لیکن ضربِ کاری سے جو بے اختیار چیخیں نکلتی ہیں، وہ اب بند ہو چکی تھیں۔ زخم مندمل ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ اجتماع میں حسبِ دستور فوجی نظم و ضبط موجود تھا۔ سب حاضرین باوردی تھے۔ انہوں نے سروں سے ٹوپیاں اُتار کر گود میں رکھ لیں اور سراپا توجّہ بن کر بھارتی احکام سُننے لگے "سرکاری اور پرائیویٹ گاڑیاں چابیوں سمیت فلاں گراؤنڈ میں کھڑی کر دو۔ جب تک بھارتی ڈرائیور نہیں پہنچتے پاکستانی موجود رہنے چاہئیں۔ بھارتی آفیسرز میس میں باورچیوں اور خانساماؤں کی ضرورت ہے، مہیّا کرو۔ فلاں جگہ راشن اور فلاں جگہ فرنیچر پہنچا دو۔ اپنے پاس روزمرّہ کی کم سے کم اشیاء مثلاً شیو کا سامان وغیرہ رکھ سکتے ہو۔ باقی سب حوالے کر دو۔ فلاں سڑک کے پار کوئی نہ جائے۔ فلاں گراؤنڈ کو کوئی عبور نہ کرے۔"

احکام سُناتے سُناتے ہمارے اس سینئر افسر کی آواز بھرّا گئی۔ انہوں نے رومال سے آنسو پونچھے۔ مزید کچھ کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکے۔ آنسو پھر اُمڈ آئے۔ ذرا سنبھلے تو انہوں نے مزید ہدایات دیں اور فوجی دستور کے مطابق حاضرین کو سوالات پوچھنے یا کسی نکتے کی وضاحت معلوم کرنے کی اجازت

دی۔ کسی نے کچھ نہ کہا، کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ شاید اب کسی وضاحت کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ شاید کسی کو بولنے کا یارا نہ تھا؛ چنانچہ جس کسی کے جام میں جتنی حسرتِ مے تھی اور جس کے دامن میں جتنی خاکِ جگر تھی، بھارت کی نذر کرنے اُٹھ کھڑا ہوا ـــــ اور یوں اسیری کی یہ پہلی اور آخری کانفرنس ختم ہوئی۔

میں کانفرنس سے اپنے قفس کی طرف لوٹ رہا تھا کہ کسی نے مژدہ سُنایا کہ آپ کے لیے ڈھاکہ شہر سے کال آئی ہے۔ ٹیلیفون پر کوئی سویلین آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اپنے بنگالی دوست کی اس جرأتِ رندانہ کی داد دیتے ہوئے ٹیلیفون اٹھایا، تو اس نے اپنی پیش کش دُہراتے ہوئے کہا: "اب بھی وقت ہے، ہم آپ کو اور جنرل فرمان علی کو اپنے گھر میں پناہ دینے کو تیار ہیں۔ کہو تو آکر لے جاؤں؟" میرا یہ بنگالی دوست جس کا نام ظاہر کرنا شاید اس کے مفاد میں نہ ہو، ان کٹّر محبِّ وطن بنگالیوں میں سے تھا جو وحدتِ پاکستان پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ مشرقی پاکستان کے استحصال کا خاتمہ لازمی ہے، لیکن اس کا حل مشرقی پاکستان کی آزادی یا بھارت کی غلامی نہیں، بلکہ علاقائی خود مختاری ہے۔ اپنے اسی مخلص دوست کے ہاں میں نے کئی خوشگوار شامیں گزاری تھیں۔ اس کے بچے میرے بچوں کے ساتھ گھُل مل گئے تھے۔ میاں بیوی کے درمیان کبھی کوئی رنجش پیدا ہوتی تو وہ مصالحت کے لیے مجھی کو بُلاتے۔ ہمارے دونوں گھرانے باہم اتنے شیر و شکر ہو چکے تھے کہ مفارقت کا تصوّر ہی سوہانِ روح معلوم ہوتا تھا۔ آج اس دوست کی پیش کش کا سنگین پہلو یہ تھا کہ مجھے بچاتے بچاتے کہیں ان کا چھوٹا سا گلشن تباہ نہ ہو جائے۔ کہیں میرے تعاقب میں آنے والی بجلی ان کے خرمن پر نہ جا گرے۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں بھابی کی آواز کان پڑی ـــــ اس نے بھی خلوص و محبّت میں رچے ہوئے الفاظ میں اپنے میاں کے الفاظ دُہرائے۔ مَیں پھر چُپ تھا۔ مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑتا تھا۔ آخر مَیں نے کہا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔ بھابی نے مایوس ہو کر کہا: "معلوم ہوتا ہے بنگالی بہن سے بھی تمہارا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ آخر پنجابی ہو، نا!"

میں جنرل فرمان کے پاس گیا جو کچھ فاصلے پر دوسرے سینئر افسروں سمیت ایک بنگلے میں محبوس تھے۔ میں نے ان سے اس بنگالی دوست کی پیش کش کا ذکر کیا، تو انہوں نے بڑے تأسف سے کہا

"عجب وقت آن پڑا ہے۔ کل تک جو ہم سے پناہ ڈھونڈتے تھے، آج پناہ دینے کے دعویدار ہیں۔ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کب تک کسی کے تہ خانے میں چھپے رہو گے۔ ہر چاپ پر تمہارا دل ڈوبے گا۔ ہوا کا ہر جھونکا تمہیں موت کا پیامبر معلوم ہوگا اور نوکر، نوکر نہیں، سراغرساں لگیں گے۔ چھوڑو، جو ہزاروں پر بیتے گی، ہم بھی سہیں گے۔" اس کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ فلاں ملک کے سفارتی نمائندے نے مجھے بھی پناہ دینے کو کہا ہے، لیکن میں نے انکار کر دیا ہے۔

اسی طرح کئی اور افراد نے بنگالی دوستوں یا غیر ملکی سفارت خانوں میں پناہ لینے کی بجائے بھارتی الاؤ میں کندن بننا مناسب سمجھا ——— ہمہ یاراں دوزخ!

جنرل فرمان والے بنگلے کے سامنے وہ سڑک گزرتی تھی جو اسیروں کے مخصوص احاطے کی آخری حد تھی۔ اس کے پار بنگلے ہی بنگلے تھے۔ کسی انجانے جذبے نے دل میں انگڑائی لی اور میں بے اختیار اس سڑک کے پار چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھارتی جے سی او ○ ایک فوجی ٹرک میں فرج، ریڈیو، ٹیلیویژن اور ایرکنڈیشنر لدوا رہا ہے۔ ٹرک کا پیٹ بھر جاتا ہے، مگر بھارتی جے سی او کا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ دوسرا ٹرک بھروانا شروع کر دیتا ہے۔

خیال آیا کہ چند قدم آگے میرا بھی نشیمن تھا۔ ذرا اس کے خس و خاشاک کی خبر لوں۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جو بجلی چمن پر گری تھی، وہ اس آشیانے کو بھی بھسم کر چکی ہے۔ دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

اپنے خرمنِ سوختہ سے ہٹ کر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی، تو ہر طرف تباہی اور بربادی کے مناظر ملے۔ بڑے بڑے لوگ، بڑی بڑی چیزیں ٹیلیویژن، سیٹ، قالین یا فرج، اٹھا رہے تھے۔ اوسط درجے کے لٹیرے صرف ٹرانزسٹر، ٹائم پیس، پردے اور دریاں سمیٹ رہے تھے اور دُردِتہ جام کے رسیا بالٹیاں، دیگچے، برتن، پہننے کے کپڑے اور تیل کے چولہے سنبھال رہے تھے۔ اس لوٹ کا نظارہ

○ جونئر کمیشنڈ آفیسر۔ جمعدار یا صوبیدار

کرتے ہوئے مجھے ایک بھارتی این سی او° نے دیکھ لیا۔ دُور سے چلّایا: "ادھر سے بھاگ جاؤ"۔ مَیں چند قدم آگے بڑھا تو ایک بھارتی سنتری نے میرا راستہ کاٹ کر کہا "آگے مت جاؤ۔ مکتی باہنی والے مار دیں گے۔ ادھر آنے کا آرڈر نہیں ہے۔" مَیں نے سوچا، واقعی ادھر کسی پاکستانی کو نہیں آنا چاہیے، ورنہ وہ آزادی اور اخوّت کے اس "دیوتا" کا اصلی روپ دیکھ لے گا۔

واپسی پر ایسٹرن کمانڈ کے زمین دوز ہیڈ کوارٹرز میں گیا۔ وہاں سوائے حسرت و یاس کے اور کچھ نہ تھا۔ اپریشن روم سے جنگی نوعیّت کے نقشے اُتر چکے تھے۔ اور ننگی دیواریں سہاگ لُٹی دُلہنوں کی طرح ماتم کناں تھیں۔ ٹیلیفون موجود تھے، لیکن ان کی روح قبض ہو چکی تھی۔ جنرل نیازی جس کمرے میں بیٹھتے تھے، وہاں تین بے حس کرسیاں اور ایک سپاٹ میز پڑی تھی۔ دورانِ جنگ جنرل نیازی نے اپنے شب و روز اسی کمرے میں گزارے تھے۔ یہیں انہوں نے جنگ کے مختلف مراحل دیکھے تھے۔ یہیں انہوں نے ۴ر دسمبر کو امرتسر فتح ہونے کی افواہ پر گورنر اے ایم مالک کو مبارکباد دی تھی۔ اور یہیں انہوں نے چند روز بعد سقوطِ ڈھاکہ کا اعتراف کیا تھا۔ اب اس خانۂ ویراں کا ذرّہ ذرّہ نوحہ کناں تھا۔ اب یہ زمین دوز کمرہ ہماری غیرت و ناموس کی قبر معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس میں تنہا کھڑا ہونے سے خوف آنے لگا۔ مَیں باہر نکل آیا۔ اتنے میں سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی چاپ سُنائی دی۔ ایک بھارتی کپتان سٹین گن لٹکائے فاتحانہ انداز میں اس گورستان میں داخل ہو رہا تھا۔ مَیں اس سے علیک سلیک کیے بغیر باہر نکل آیا۔

گرد و پیش میں بہت کچھ دیدنی تھا۔ خونِ مسلم کی ارزانی، اسیروں کا سوزِ نہانی، پناہ گزینوں کی خانہ ویرانی اور فاتحین کی شادمانی۔ لیکن ذوقِ تماشا نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گزشتہ دو تین روز سے جو کچھ دیکھ اور سُن چکا تھا، اس کے بعد مزید سننے اور دیکھنے کی سکت نہ رہی؛ چنانچہ بارِ دل، دل میں سمیٹے اپنی قید کوٹھڑی میں واپس چلا گیا۔

مَیں اپنے کمرے میں لیٹا اعصاب کو سہلا رہا تھا کہ ایک مانوس شکل نوجوان داخل ہوا۔ مَیں

° نان کمشنڈ آفیسر یعنی لانس نائک، نائک یا حوالدار

اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا استقبال کے لیے اٹھا، تو اس نے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بوٹوں سے بے نیاز پاؤں سے خون رِس رہا تھا۔ ٹخنے سُوجے ہوئے تھے۔ پتلون پر جگہ جگہ خون کے دھبّے تھے۔ اس نے خاکی قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔ کاندھے پر رینک نہ تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اور اس کے مُٹھّی بھر ساتھی گزشتہ دو روز سے فرید پور سے ڈھاکہ پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس راستے پر چلتے، موت ناچتی دکھائی دیتی جس بستی میں داخل ہوتے وہ کاٹنے کو دوڑتی؛ چنانچہ پکّے راستے اور کچّی بستیوں سے بچتے بچاتے، کھیتوں اور ندّی نالوں سے گزرتے، ڈھاکہ کی سیدھ میں چلتے رہے۔ کہیں جھاڑیوں سے اُلجھے، کہیں بنگالیوں سے، کہیں خون کی قربانی دی اور کہیں سے لی اور بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔

یہ پارٹی ڈھاکہ سے دُور کسی فیری (FERRY) پر تعینات تھی۔ انہیں وائرلیس پر اطلّاع دی گئی تھی کہ جلد سے جلد ڈھاکہ پہنچ جاؤ۔ اس بظاہر بے ضرر سے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان پر کیا گزری، اس کی پوری داستان اس نوجوان کے حُلیے سے مترشّح تھی۔ فوجی زندگی کا یہی خاصہ ہے۔

اسی طرح کئی اور ٹولیاں ڈھاکہ کے گرد و نواح، نرائن گنج، داؤد کنڈی، نرسنگدی، ٹونگی، اڑیچہ وغیرہ سے وارد ہوتی رہیں۔ کوئی پیرہن بریدہ تھا اور کوئی جگر دریدہ۔ کسی کے کپڑوں پر داغ تھے اور کسی کے دل پر۔ تھوڑی دیر بعد کچھ نے اپنے کپڑوں اور جسم کے داغ تو دھو ڈالے، لیکن دل کے داغ دُھلنے کے لیے ایک مدّت درکار تھی۔

۱۹ دسمبر کو ڈھاکہ چھاؤنی کے مکینوں کو اجتماعی طور پر ہتھیار ڈالنے تھے۔ اس رسم کے لیے ڈھاکہ چھاؤنی ہی میں گاف کورس منتخب کیا گیا تھا، جو کبھی صحت مند تفریح کا مرکز تھا۔ اس کے جنوبی کنارے پر فلیگ سٹاف ہاؤس تھا جو کئی سال تک فوجی سربراہ کی اقامت گاہ رہنے کے بعد اب بھارتی جرنیل کے تصرّف میں تھا۔ اس کے سامنے سے پاکستانی گارد ہٹ چکی تھی اور پاکستانی پرچم اُتر چکا تھا۔ گاف کورس کے شمال کی جانب گریزن سینما تھا۔ جہاں کبھی خوش و خرم کنبے رنگا رنگ فلموں سے لُطف اندوز

ہوتے تھے، آج وہ قبرستان سے زیادہ سوگوار اور خاموش لگتا تھا۔ گاف کورس کے مغرب میں سڑک اور مشرق میں ریلوے لائن تھی۔ کئی بار گاف کھیلتے وقت ہم محض یہ دیکھنے کے لیے رُک جاتے تھے کہ سُرخ رنگ کی ریل گاڑی سبزہ زار سے گزرتی ہوئی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گاڑی بل کھا کر گزرتے ہوئے وِسل بجادیتی تو یوں لگتا کہ کوئی عشوہ پرداز مٹیار کولھے مٹکا کر گزر رہی ہے اور راہگیروں کی نظر بچا کر ہمیں اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لیے سیٹی بجا رہی ہے، لیکن آج وہاں نہ کوئی مٹیار تھی اور نہ اس کی معنی خیز سیٹی کا کوئی منتظر۔

ہم حکم کے مطابق صبح دس بجے گاف کورس میں جمع ہو گئے۔ تینوں افواج کے افسروں کی مجموعی تعداد کوئی چھ سو کے لگ بھگ تھی۔ سپاہی وہاں موجود نہ تھے، کیونکہ ایک روز پہلے ہی ان سے ہتھیار جمع کروا لیے گئے تھے۔ سینئر افسروں میں میجر جنرل جمشید، میجر جنرل فرمان، رئیر ایڈمرل شریف اور ائر کموڈور انعام تھے۔ چند بھارتی افسر اور سو سوا سو سپاہی کھڑے تھے۔ فاتحین یا تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شاید اس رسم میں ہم مناریس کورس والے منظر سے محفوظ رہیں گے۔ فوجیوں کے علاوہ صرف صحافی اور کیمرے والے تھے۔

تقریب سے ذرا پہلے ہمارے "آقاؤں" کو پتہ چلا کہ ہم میں سے اکثر کے پاس ذاتی ہتھیار نہیں، کیونکہ ایک روز پہلے جب سب کو اپنے اپنے ذاتی ہتھیار آرڈیننس ڈپو (ORDNANCE DEPOT) میں جمع کرانے کے لیے کہا گیا تھا، تو کئی افسروں نے بھی اپنے ریوالور وغیرہ جمع کروا دیے تھے، تاکہ تقریبی انداز میں انہیں بھارتی افسروں کے حوالے نہ کرنا پڑے۔ لیکن آقاؤں کا منشا کچھ اور تھا — وہ تقریب محض تشہیر کے لیے منعقد کر رہے تھے۔ ہتھیار ڈالنے کی تقریب ہتھیاروں کے بغیر بھلا کیسے پوری ہو سکتی تھی؛ چنانچہ انہوں نے حکم دیا کہ جن افسروں کے پاس ہتھیار نہیں، وہ لے کر آئیں، اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر دوبارہ اسی جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ بے ہتھیار شرکائے محفل تعمیلِ ارشاد میں روانہ ہوئے اور مقرّرہ وقت کے اندر اندر دوبارہ اکٹھے ہو گئے۔ اس وقت جذبات و احساسات کا عجب عالم تھا۔ اسیری کا یہ چوتھا دن تھا، لیکن ابھی تک لوگ جذباتی طور پر

سُن تھے۔ کوئی کُھل کر بات نہ کرتا تھا۔ کوئی روتا نہ تھا، ہنستا نہ تھا۔ ہر کسی نے اپنے اپنے دُکھ اپنے اپنے سینے میں دفن کر رکھے تھے۔ اگر کوئی بھارتی افسر یا صحافی بات چھیڑنے کی کوشش کرتا بھی تھا تو اسے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملتا۔ اگر لب کشائی کی نوبت آتی بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا "مجھے کچھ نہیں کہنا،" چنانچہ جنگی اسیروں کے تاثرات ریکارڈ کرنے کے لیے جتنے ٹیپ ریکارڈروں کے منہ کُھلے تھے، کُھلے کے کُھلے ہی رہے؛ البتّہ کیمروں کے لیے کافی مواد تھا۔ تصویریں اترتی رہیں۔ گھمبیر اور خاموش چہرے تصویروں میں بولنے لگتے ہوں گے۔ شکن آلود پیشانیاں، بھنچے ہوئے ہونٹ، نم آلود نگاہیں اور پھُولے ہوئے نتھنے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ تصویروں کی زبان الفاظ سے زیادہ بلیغ اور موثّر ہوتی ہے۔ یہ توقّع رکھنا کہ اس موقع پر فضا فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی یا مورال بہت اونچا ہو گا، سراسر زیادتی ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہی سوچ رہے تھے کہ بیشک اس وقت اس ذلّت سے مفر نہیں، لیکن ہمارا یہ مقدّر نہیں۔ وقت آنے پر نہ صرف ذلّت کے یہ گھاؤ بھرنے ہوں گے، بلکہ اس سے کہیں گہرے زخم حریف پر لگانے ہوں گے۔ ایسے موقع پر ان جذبات کا اظہار ایک بے وقت کی راگنی اور پاگل کی بڑ لگتی؛ چنانچہ ہم نے گفتار کی بجائے خاموشی کو بہتر سمجھا۔

ساڑھے دس بجے ہم سب تین تین کی قطاروں میں چونے کی لکیروں پر کھڑے ہو گئے جو تین سمتوں پر کھینچی گئی تھیں۔ اجتماعی شکل ایک بریکٹ ([ ) کی طرح بنتی تھی۔ بریکٹ کے خالی حصّے میں میجر جنرل جمشید کھڑے تھے کہ وہی حاضرین میں سے سینئر تھے۔ ریئر ایڈمرل شریف اور ائر کموڈور انعام اپنے اپنے افسروں کے ساتھ تھے۔ جنرل فرمان علی میرے دائیں ہاتھ عام افسروں کی صف میں کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مغربی رُخ سے دو تین موڈرن خواتین بچّوں سمیت آتی نظر آئیں دل ڈوبا کہ تماشائی پہنچنے شروع ہو گئے۔ اب رمنا کورس کا منظر یہاں بھی دُہرایا جائے گا۔ لیکن وہ ہمارے قریب آنے کی بجائے دُور درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گئیں۔

سٹیج بھارتی میجر جنرل ناگرہ کے قبضے میں تھا، جو تھوتھا چنا باجے گھنا کی عمدہ مثال پیش کر

رہا تھا۔ وہ جنگل ہیٹ (JUNGLE HAT) پہنے جو منہ میں آتا بکتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کا قیام، اس کا کلام، ایک ایسی شخصیت کا پتہ دیتے تھے جس کو عام حالات میں کوئی عام آدمی منہ لگانا بھی پسند نہ کرے۔ لیکن آج وہ اپنی فوجی برتری کے بل بوتے پر ہمیں اپنا سامع بنائے، تقریر بازی کی مشق کر رہا تھا۔ جنرل ناگرہ ماحول کو مکدّر کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھا کہ مغرب کی جانب سے ایک لمبی سٹاف کار آتی دکھائی دی جو پریڈ سے ذرا پرے آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک لمبا تڑنگا فوجی افسر تیز تیز قدم اُٹھاتا سٹیج کی طرف آیا۔ یہ بھارتی کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سگت سنگھ تھا جو جنرل اروڑہ کے نمائندے کی حیثیت سے آج کی تقریب کا مہمانِ خصوصی تھا۔ اس کے آتے ہی میجر جنرل ناگرہ مائک کی اجارہ داری سے دستبردار ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اب جنرل سگت نے مائک سنبھالا۔ جنرل جمشید نے اپنے زیرِ کمان افسروں کو اٹینشن کیا۔ جنرل سگت نے انگریزی میں کہا "جنرل جمشید! ایک سپاہی کی حیثیت سے مجھے پورا احساس ہے کہ ہتھیار ڈالنا کتنا ناخوشگوار اور کٹھن کام ہے۔ لیکن ہر کھیل کے کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا بجالانا ضروری ہوتا ہے۔ لڑائی کا کھیل بھی کچھ ایسے ہی آداب رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔"

اس کے بعد جنرل جمشید نے روئے سخن ہماری طرف کر کے کاشن دیا "آفیسرز! ہتھیار بر زمین شو" سب نے جھک کر ہتھیار اپنے سامنے ڈال دیے اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے قریب کھڑے جنرل فرمان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نہایت حقارت سے اپنا ریوالور کھڑے کھڑے پرے پھینک دیا۔ بھارتی فوٹو گرافرز نے جو پہلے ہی کیمرے ان کی طرف تانے کھڑے تھے، اس تاریخی لمحے کو تصویر کی شکل میں محفوظ کر لیا۔

اس کے بعد مائک اور سامعین ایک بار پھر جنرل ناگرہ کے رحم و کرم پر تھے۔ اس نے اپنی بھونڈی آواز میں بظاہر ہمیں لیکن درحقیقت غیر ملکی صحافیوں کو سنانا شروع کیا "ہم جنگی قیدیوں سے جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک کریں گے اور کنونشن کے تحت ساری مراعات دیں گے۔ ان مراعات کی ایک فہرست جنگی قیدیوں کو بھی دی جائے گی، تاکہ وہ اپنے حقوق سے آگاہ رہیں۔"

وغیرہ وغیرہ۔ بھارتی قول وفعل کا تضاد ہمیں بعد میں بھارت پہنچ کر ہی معلوم ہوا۔ بہر حال یہ رسم بھی ختم ہوئی۔ بھارتی افسر اور جوان زمین سے ہمارے پھینکے ہوئے ہتھیار جمع کرنے لگے۔ اب ہم سرکاری طور پر جنگی قیدی تھے اور جنرل ناگرہ کے بقول ہماری اس حیثیت کا اطلاق ۱۶، دسمبر کو ۴ بجکر اکتیس منٹ سہ پہر سے ہوتا تھا۔

ہم واپس اپنے کوارٹروں میں پہنچے تو مستقبل کے متعلق قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بعض کا خیال تھا کہ ہم پہلے چاٹ گانگ جائیں گے، جہاں باقی اضلاع سے بھی لوگ اکھٹے کیے جائیں گے۔ پھر سب بحری راستے سے وطن روانہ ہو جائیں گے۔ کسی نے کہا "شمالی بنگال سے لوگوں کو چاٹ گانگ لانے میں کیا منطق ہے؟ اب بھارت اور بنگلہ دیش ایک ہی ہیں۔ سلہٹ اور رنگ پور وغیرہ سے ریل گاڑیاں چلیں گی اور سیدھی واہگہ اور حسینی والا جا رُکیں گی۔ ممکن ہے سینئر افسروں کو سب سے پہلے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان بھیج دیا جائے۔" ایک صاحب نے اس رنگین خیال میں ذرا حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی اور کہا: "ہو سکتا ہے انتظامات مکمل ہوتے ہوتے دو تین ماہ لگ جائیں۔" ہر ایک نے نہایت خشم آلود نگاہوں سے اس کے سراپا کو ٹٹولا کہ کہیں یہ بھارتی ایجنٹ تو نہیں؟ بھلا تین ماہ کا کیا مطلب! ہونہہ، قنوطی کہیں کا!

○ ○

وی۔آئی۔پی

ہماری منزل اور رسمِ راہ و منزل کا علم صرف بھارتی حکّام کو تھا۔ باقی سب قیاس آرائیاں تھیں۔ ہم میں سے جو خوش فہمی کے شکار تھے، ان کی نگاہیں بار بار واہگہ یا کراچی کی طرف اٹھتی تھیں۔ اور جو حقیقت پسندی کے دعویدار تھے وہ ہر آنے والی بلا کا استقبال کرنے کو تیار رہنے کی تلقین کرتے تھے؛ البتّہ قنوطی سے قنوطی شخص بھی اس وقت اندازہ نہ کر سکا کہ ہمیں دو ڈھائی سال بھارت کی میزبانی کا شکار ہونا پڑے گا یا جنگی جرائم کے مقدّمات کا ڈھونگ رچایا جائے گا۔ غالباً اس خوش خیالی کی وجہ یہ عام تاثّر تھا کہ بھارت اور بنگلہ دیش اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب وہ ہمیں یرغمال کے طور پر رکھ کر کیا کریں گے!

جب ہمارے اندر ایسے خیالات نے کھلبلی مچا رکھی تھی تو باہر مکتی باہنی والے سب کیلئے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ وہ ہر قسم کے نظم و ضبط یا حکم و تعمیل کی بندشوں سے آزاد تھے۔ وہ جس کسی کے جان و مال سے کھیلنا چاہتے کھیل جاتے، گلشن میں جس پھول پر نظر پڑتی مسل ڈالتے اور جو شاخ انہیں ٹیڑھی دکھائی دیتی کاٹ دیتے۔ پاکستانیوں میں سے ان کی نظر خاص طور پر سینئر فوجی افسروں پر تھی جو اتنا عرصہ ان کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے تھے۔ بھارتی حکّام نے ان افسروں کو اگلے روز یعنی ۲۰۔ دسمبر کو بذریعہ ہوائی جہاز کلکتہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی طے پایا کہ ان افسروں کے اے ڈی سی اور اردلی اس قافلے کی گردِ راہ کے طور پر ان کے ساتھ ہوں گے۔

جونیئر افسروں میں سے مکتی باہنی نے جن کو درخورِ اعتنا سمجھا، ان میں اس بندۂ حقیر پُرتقصیر

کا نام بھی تھا۔ "آزادی" کے ان جیالوں کا اصرار تھا کہ سینئر فوجی افسروں کے ساتھ تو جو ہوگا سو ہوگا، یہ ادنیٰ؍ کمتر قسم کے لوگ ہمارے حوالے کیے جائیں، تاکہ ہم ان کے کرتوتوں کے مطابق ان سے "انصاف" کر سکیں۔ مجھے اس امتیاز پر تشویش بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ تشویش کی وجہ یہ تھی کہ انصاف حاصل کرتے کرتے کہیں جان ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں اور حیرت اس لیے کہ میں کسی ہُنر میں یکتا نہ تھا کہ اس خصوصی سلوک کا مستحق ٹھہرتا

ہم کہاں کے تھے دانا، کس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

۲۰ دسمبر کو صبح آٹھ بجے کے قریب جنرل نیازی اپنی مخصوص قیام گاہ سے نکل کر اپنے سابق ٹیک ہیڈ کوارٹرز (TAC HQ) کی طرف آئے جہاں انہیں جو افسر اور جوان دستیاب ہو سکے، ان سے الوداعی باتیں کیں۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے جنگ بندی کا سودا کیا ہے، عزّت کا نہیں، للہٰذا اپنی عزّت اور وقار کو برقرار رکھنا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے دشمن کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا اور ڈھاکہ سے روانگی کے وقت جس چیز کی وہ اجازت دیں ساتھ لے لینا' ورنہ ادھر ہی پھینک جانا۔ چیزوں سے بلاضرورت چمٹنے کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں ڈھاکہ میں جنرل نیازی کے اس آخری خطاب سے محروم رہا، کیونکہ میں کل کے ذوقِ تماشا سے نڈھال ابھی تک اپنی بان کی چارپائی سے بغل گیر تھا۔ خطاب کے بعد ایک صاحب نے بتایا کہ جنرل صاحب تمہارا پوچھ رہے تھے۔ زہے عز و شرف! اس آڑے وقت ان کی نظرِ کرم، تپتے ہوئے صحرا میں بادل کا ٹکڑا معلوم ہوئی۔ میں فوراً ان کے بنگلے پر پہنچا، وہ وردی پہنے لان میں ٹہل رہے تھے۔ ان کا ذاتی سامان یعنی بستر، سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ باہر برآمدے میں پڑے تھے۔ وہ خود کلکتہ روانہ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی ان کی چہل قدمی میں شریک ہوگیا۔ اب ۱۶ دسمبر کو گزرے ہوئے تین دن اور چار راتیں ہو چکی تھیں۔ وقت نے ان پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ اب وہ صدمے سے کافی حد تک سنبھل چکے تھے۔ ان کی گفتگو میں ٹھہراؤ اور متانت کا عنصر غالب تھا۔ بات بات

پر مذاق اور لطیفہ بازی کی کیفیت جو اُن کی شخصیت کا اہم پہلو تھا ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے دس پندرہ منٹ مجھ سے بات کی۔ باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ میں جس کو ابرِ کرم سمجھا تھا، وہ محض گرد و غبار کا بادل تھا۔ اس کا دامن پانی کے قطروں سے تہی اور اس کا سایہ بے معنی۔ یوں معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح بقول میر تقی میرؔ

بے کس ہوئے، بے بس ہوئے، بے کل ہوئے، بے گت ہوئے

جنرل نیازی کے بنگلے سے باہر نکلا تو ساتھ والے بنگلے کے لان میں جنرل فرمان بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا۔ حال احوال پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ بھی کلکتہ جانے کیلئے تیّار بیٹھے ہیں۔

ہم لان ہی میں بیٹھے تازہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ گفتگو کا رُخ مکتی باہنی کے "کارناموں" اور بھارتیوں کی دانستہ غفلت کی طرف مُڑ گیا۔ اتنے میں بھارتی جنرل ناگرہ ادھر آنکلا۔ جنرل فرمان نے اس سے میرے بارے میں بات کی تو اس نے ہوا کے گھوڑے پر سوار جنگل ہیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا "فرمان ہم نے ہر جنرل کو ایک سٹاف آفیسر ساتھ لے جانے کی اجازت دی ہے۔ تم جس ٹام، ڈِک اور ہیری ○ کو ساتھ لے جانا چاہو، لے جاؤ۔ یہ میرا ہیڈ ایک ● نہیں کہ کون جاتا ہے کون نہیں۔" یوں مجھے وی آئی پی قافلے میں شامل ہونے کی اجازت مِل گئی۔

مَیں نے دو کمبل اور چار کتابیں زادِ راہ کے طور پر ساتھ لیں اور پھر جنرل فرمان کے پاس بیٹھ کر حکمِ سفر کا انتظار کرنے لگا۔ ڈھاکہ سے روانہ ہونے والے اس قافلے کو ایر پورٹ تک پہنچنے کیلئے کوئی دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ بظاہر اس فاصلے کی حیثیت دو گام سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن راستے میں وہ سڑک پڑتی تھی جہاں بپھرے ہوئے بنگالی بے لگام پھر رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ جرنیلوں کے غول پر ٹوٹ نہ پڑیں، چنانچہ طے پایا کہ وی آئی پی قافلہ یہ فاصلہ بذریعہ ہیلی کاپٹر طے کریگا۔ میں ان سے پہلے ہی اُفتاں و خیزاں ایرپورٹ پہنچ کر ہیلی کاپٹر کا انتظار کرنے لگا۔

○ یہ انگریزی نام پنجابی میں "ایرا غیرا نتھو خیرا" سے ملتے جلتے ہیں۔ ● (HEAD ACHE) یعنی دردِ سر

رن وے (RUN-WAY) کے مغربی کنارے پر ایک بھارتی ٹرانسپورٹ طیّارہ "کیرابو" کھڑا تھا. اور اس کا عملہ دو تین بھارتی افسروں سمیت ٹہل رہا تھا. میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے ہوائی اڈّے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ رن وے کا سینہ چھلنی تھا. ہوائی اڈّے کی دیواریں پُرشگاف اور شیشے چُور چُور تھے۔ وی آئی پی لونج (VIP LOUNGE) دورانِ جنگ کسی بم کا نشانہ بننے سے لخت لخت تھا. اس سے لوہے کی سلاخیں ٹُوٹے ہوئے بازوؤں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ لونج سے ملحقہ چمنستان نیپام بم کی زہر آلود آگ سے بھسم ہو چکا تھا. زیبائشی درختوں کی ٹہنیاں تک جُھلس گئی تھیں۔ دوسری جانب جہازوں کے ہینگر (HANGAR) تقریباً خالی تھے. جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے پی آئی اے کا صرف ایک طیّارہ دکھائی دیا؛ البتّہ اپنی فضائیہ کے گیارہ سیبر طیّارے صف بستہ کھڑے نظر آئے۔ کہتے ہیں یہ محض ان کا جسدِ آہنی تھا۔ ان کی روح ہمارے عملے کے ہاتھوں ہی اس قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی. اس لیے زندوں میں ان کا شمار مناسب نہ تھا۔

ہوائی اڈّے کے مغربی جانب ہماری طیّارہ شکن توپیں آسمان کی طرف منہ کیے محوِ مناجات تھیں۔ دورانِ جنگ میں ان سے آگ کے شعلے نکلتے تھے، آج ٹھنڈی آہیں اُٹھ رہی تھیں۔ دُور ہوائی اڈّے کی چار دیواری پر بنگالی تماشائی سہمے ہوئے بندروں کی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے. اگر ان میں سے کوئی اُتر کر ایئرپورٹ کے احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو ہتھیار بند بھارتی افسر اور سپاہی انہیں دھتکار دیتے۔

متوقّع ہیلی کاپٹر کی آمد سے ذرا پہلے لیفٹیننٹ جنرل سگت سنگھ آیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا. اس کا لہجہ شیریں اور باتوں کی تاثیر زہر آلود تھی۔ بعد میں یہ شکر آلود زہر دورانِ اسیری مجھے کئی بار پلایا گیا، لیکن آج اس کا جُرعۂ اوّل تھا. سگت سنگھ نے کہا "مقامی بنگالی اور غیر مُلکی صحافی تعجب سے پوچھتے ہیں کہ تم ایک دوسرے کے عجب دشمن ہو. کل تک پاکستانی اور ہندوستانی سپاہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، آج باہم مل کر چائے اور سگریٹ پیتے اور گپ

لگاتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ تقسیمِ ہند سے پہلے ہم ایک ہی تھے، ہمارے تہذیبی اور تاریخی رشتے صدیوں پرانے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہمیشہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک رہے ہیں۔"

قیامِ پاکستان پر یہ براہِ راست حملہ تھا۔ جی تو چاہا کہ اس کے افسروں کے سامنے اس کا گریبان پکڑ لوں اور تاریخ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اسے ایک ایک زخم دکھاؤں جن کی وجہ سے برِصغیر کے مسلمان الگ ملک بنانے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اسے میری کم ہمّتی کہیے یا موقع شناسی کہ میں نے اس مضمون کو ایک لاغر سے سوال کی شکل دیدی اور کہا "جنرل! اگر آپ کا کہا درست ہے، تو پھر تقسیمِ ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" جنرل سگت بھارتی پروپیگنڈے کی کسی گھسی پٹی دلیل کا سہارا لینے والا تھا کہ اتنے میں ہیلی کاپٹر اترا۔ جنرل نیازی، جنرل فرمان، ایڈمرل شریف اور ایر کموڈور انعام باہر نکلے۔ جنرل نیازی نے بڑھ کر جنرل سگت سے مصافحہ کیا اور الوداعی باتیں ہونے لگیں۔ میرے ذہن میں آٹھ ماہ پہلے کا منظر اُبھر آیا، جب اس ہوائی اڈّے پر جنرل نیازی کا محافظِ مشرقی پاکستان کے طور پر سواگت کیا گیا تھا۔ آج وہ اپنی کمان سگت سنگھ کے حوالے کر کے جا رہے تھے۔ باغبانی کے فرائض سنبھالنے والے سارا گلشن ہی صیّاد کو بخش کر چل دیے۔ شاید یہی مشیتِ ایزدی تھی! شاید یہی ہمارے کیے کی سزا تھی!!

ہم سب "کیرابُو" جہاز کے تاریک پیٹ میں گھس گئے۔ اندر جہاز کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ نائلون کی عارضی نشستیں تھیں۔ ہم سب میرِ کارواں سمیت ان پر بیٹھ گئے۔ درمیانی جگہ پر ہمارے گھٹنوں سے رگڑ کھاتا ہوا ہمارا سامان پڑا تھا۔ جہاز کا عملہ کاک پٹ (COCKPIT) میں تھا اور ہمارے پاس بھارتی انٹلی جنیس کا میجر ورما بیٹھا تھا۔ وہ گٹھے جسم پر سلوٹوں سے اَٹی وردی اور سیاہ چہرے پر بچھو کے ڈنک سے ملتی جلتی مونچھیں سجائے ہوئے تھا۔ وہ ضرورت بے ضرورت اِن مونچھوں کو سہلاتا اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھورتا رہا۔ وہ اپنے پیشے کی مناسبت سے دیکھتا اور

○ جنرل سگت نے انہی دنوں ڈھاکہ چھاؤنی میں چند افسروں سے غیر رسمی بات چیت کے دوران کہا تھا کہ "مجھے ڈھاکہ میں کور ہیڈکوارٹرز (CORPS HEADQUARTERS) بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگرتلہ میں میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں بوقتِ ضرورت ایک گھنٹے میں ایک ڈویژن اور دو گھنٹے میں پوری کور ڈھاکہ میں اُتار سکتا ہوں۔

سُنتا تھا۔ بولتا نہ تھا۔ ہم سب بھی خاموش تھے۔

پائلٹ نے انجن کی کوئی رگ مروڑی تو جہاز تھر تھر کانپنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہلنے لگے پائلٹ نے ہماری آنکھوں سے اوجھل کاک پٹ میں جہاز سے کوئی اور شرارت کی تو وہ رینگنے لگا۔ اس نے جہاز کی رفتار تیز کرنی چاہی تو شور بھی تیز ہوگیا۔ جہاز ذرا سا گراں سا نکلا۔ امید نہ پڑتی تھی کہ کبھی سبک خرام بھی ہوگا، لیکن قدرتِ خدا کی، تھوڑی دیر بعد یہ سچ مچ مائلِ پرواز ہوا۔

زمین سے رشتہ ٹُوٹا تو فضا سے بنگلہ دیش کی سرزمین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ آتشِ شوق نے اس سرزمین کے ہر ذرّے پہ ایک دل باندھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا تابوت جہاز میں لاد دیا گیا ہے تاکہ اسے مکتی باہنی والے گزند نہ پہنچا سکیں اور میری روح پیچھے رہنے والے نصف دھڑ میں رہ گئی ہے۔ مجھے نہ سونار بنگلہ کے سنہرے ریشے (پٹ سن) سے پیار تھا اور نہ پان کے برگِ سبز سے، نہ مجھے مچھلی سے اُنس تھا اور نہ چائے سے عشق۔ مجھے دُکھ تھا تو اس امر کا کہ کل تک جو میرے دست و بازو تھے وہ آج کاٹ کر دُور پھینک دیے گئے ہیں۔ میں ان کے بغیر لنگڑا اور اپاہج ہوگیا ہوں۔ وہ تو میرے اعضائے رئیسہ تھے۔ اگر عضوِ معطّل بھی جزوِ جاں رہے تو جسم کا بھرم رہتا ہے ——— آج یہ بھرم بھی ٹُوٹ چکا تھا!

لمحہ بھر کو یہ وہم ذہن کے کسی گوشے میں جاگا کہ کیا قائدِ اعظمؒ نے اس گھر کی بنیاد خدانخواستہ ریت پر رکھی تھی؟ کیا جنرل سگت ٹھیک کہتا تھا کہ ہم صدیوں سے ایک ہیں اور ہمارے تاریخی و ثقافتی رشتے بنگال کی نسبت بھارت سے زیادہ ملتے ہیں۔ مَیں نے اس شرپسند واہمے کو جھٹک کر جہاز سے باہر پھینک دیا اور خود ڈھاکہ شہر کا آخری دیدار کرنے لگا۔ سہ پہر کی خوشگوار دھوپ میں پورا شہر نظر آرہا تھا۔ میری نگاہ رمنا ریس کورس، رمنا پارک، صوبائی اسمبلی، ایوّب نگر، پلٹن میدان اور گورنر ہاؤس سے ہوتی ہوئی جامع مسجد کے میناروں پہ پہنچ کر رُک گئی۔ مسجدوں کے اس شہر کی سب سے بڑی مسجد کے مینار مجھ سے بہت کچھ کہہ رہے تھے، بہت کچھ پوچھ رہے تھے، لیکن میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ مَیں علّامہ اقبالؒ کے یہ شعر

گنگنانے لگا

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں

خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائیں مسلماں!

مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

"وہ دیکھو"۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اے ڈی سی نے مجھے کہنی مار کر کہا۔ باہر دیکھا تو پٹرول کا ایک ذخیرہ نذرِ آتش نظر آیا۔ پتہ نہیں کب سے جل رہا تھا۔ اب اس کے شعلے بجھ چکے تھے، لیکن دھوئیں کے بادل سر بلند تھے، شاید شعلوں ہی نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔

چند لمحوں میں یہ منظر اوجھل ہوگیا۔ میں نے گردن گھما کر برابر والی کھڑکی سے پھر ڈھاکہ شہر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اب وہ بہت پیچھے رہ چکا تھا، صرف اس کا ایک خاکہ یا ہیولا سا نظر آیا۔ شہر کے سب مینار ڈوب چکے تھے۔

اب ہم مغربی بنگال پر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارے پروں کے نیچے زمین پر کوئی ایسا مقام نہ تھا جو نگاہوں میں جچتا۔ بس وہی سپاٹ اور بے رنگ زمین کہیں کہیں پانی کا جوہڑ اور کیلے کے پیڑ۔ یہ بوریت کے لمحات تھے۔ ہم سب خاموش تھے۔ صرف جہاز محوِ فغاں تھا۔ اتنے میں ایک جواں سال اور جواں ہمت اے ڈی سی نے میرے کان میں کہا: "اگر اس جہاز کو ہائی جیک (HI JACK) کر لیا جائے، تو کیسا رہے، ایک میجر ہی تو ہے کیا کرلے گا۔" میں نے بھارتی میجر کی طرف دیکھا تو وہ حسبِ معمول مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا، گویا کہہ رہا ہو "جہاز کو اغوا کر کے لے کہاں جاؤ گے!" ہم کون سے ہینڈ گرنیڈوں اور زیرِ آستین پستولوں سے لیس تھے! ارادہ ترک کر دیا۔ ہائے!

میری ہمتوں کی پستی، میرے شوق کی بلندی

شاید میجر درما اپنی جگہ خوش ہو کہ اس کی موجودگی ہمارے ارادوں کی تکمیل میں حائل ہوئی، حالانکہ اہلِ جنوں کسی ایسی ویسی حرکت پر اتر آتے، تو درما یا جہاز کا عملہ ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا۔

بہرحال اس گھناؤنے ماحول میں اس مجاہدانہ تجویز پر میں نے جواں سال اے ڈی سی کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور چُپ ہو رہا۔

کلکتہ کے مضافات میں پہنچ کر جہاز بلندی سے پستی پر مائل ہوا۔ نیچے نگاہ ڈالی تو افلاس زدہ دیہاتیوں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ جہاز ذرا اور نیچے آیا تو کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں اور ان کے مویشیوں کی پسلیاں دکھائی دیں۔ یوں بھارت کی عظمت کا پہلا اشتہار فضا ہی سے دیکھ لیا۔

چند لمحوں بعد ہم ڈم ڈم ایرپورٹ پر پہنچے۔ ہوائی اڈّہ سُنسان تھا۔ ہوائی حملے سے بچنے کے لیے دیواروں کے ساتھ ریت سے بھری ہوئی بوریوں کی لمبی چوڑی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ سنگ و خشت سے زیادہ ریت کی بوریاں نظر آتی تھیں۔ ایر کموڈور انعام نے ان غیر ضروری حفاظتی اقدامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "LOOK AT THEM ○" ایر کموڈور کے تعجب میں پیشہ ورانہ رائے شامل تھی، یعنی جب بھارت کو علم ہے کہ کلکتہ ڈھاکہ کی زد سے باہر ہے، تو یہ حفاظتی اقدامات کیا معنی؟

جہاز سے نکلے تو انٹلی جنیس کے ایک فل کرنل نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ سر تا سر سکھ تھا۔ کیا ہوا جو فل کرنل تھا! پنجاب کی دھرتی کی مناسبت سے لمبا، بانکا اور سجیلا۔ قومیّت کے لحاظ سے کیس اور کڑے سے مزیّن (کرپان البتّہ غائب تھی)، آدمی اچھا تھا۔ بس سکھ ہونے کی وجہ سے مار کھاتا تھا۔ اس نے الف کی طرح تن کر جنرل نیازی اور دوسرے سینئر افسروں کو سیلوٹ کیا اور پاس کھڑے دو ہیلی کاپٹروں میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ ایک میں کرنل کھیرا خُود اور دوسرے میں میجر ورما ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔

دُور ڈیپارچر لونج (DEPARTURE LOUNGE) کے قریب پندرہ بیس آدمی ہماری طرف ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ ایر انڈیا کا سٹاف تھا جو غیر مُلکی باشندوں کا سامان چیک

○ اظہارِ تعجب کے لیے۔ لغوی معنی "انہیں دیکھو"

کرنے کا منتظر تھا، لیکن ہم تو وی آئی پی تھے۔ سیدھے ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور محوِ پرواز ہوئے۔ پائلٹ نے ہماری دلداری کے لیے کلکتہ شہر کے اوپر ایک مختصر چکر لگایا، تاکہ ہمیں برِصغیر کے اس سب سے بڑے شہر کے واسطے سے بھارت کی عظمت کا احساس ہو جائے۔ لیکن ہر جسیم و ضخیم چیز عظیم نہیں ہوتی۔ کلکتہ کا حجم تو نظر آیا، لیکن شہر کہیں دکھائی نہ دیا۔ ہر چیز دھند، کہر اور غبار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے خدوخال لاہور یا کراچی کی طرح تیکھے، جاذب اور واضح نہ تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سوچے سمجھے بغیر اینٹوں کے ڈھیر لگاتا گیا اور جہاں کہیں ڈھیر میں سوراخ رہ گئے وہاں لوگوں نے رہنا شروع کر دیا۔ سڑکوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ بس ٹریفک کی رینگتی ہوئی لہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھی کی خاکِ پا میں مضمر کہیں شاہراہیں ہوں گی۔ اس سارے مشاہدے میں صرف ایک چیز واضح نظر آئی اور وہ تھیں بلند ترین عمارتوں کے اوپر لوہے کی سلاخوں پر ٹنگی ہوئی مورتیاں، دیووں اور دیوتاؤں کی مورتیاں۔ واقعی بھارت کے ان اکابر کو یہ بلندی حاصل کرنے کے لیے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی!

ہم کلکتہ شہر کے ایک طرف فورٹ ولیم سے باہر اُترے۔ ہیلی پیڈ ○ پر پہلے ہی بھارتی ساخت کی دو تین سٹاف کاریں کھڑی تھیں۔ وہی کالا رنگ، نشستوں پر سفید کپڑا اور باوردی شوفر، لیکن بیٹھنے کو دروازہ کھولا تو وہ یوں بڑبڑایا گویا گہری نیند سے قبل از وقت جگا دیا گیا ہو۔ نشست پر بیٹھا تو سیدھا کار کی ہڈیوں سے جا ٹکرایا۔ شوفر نے سٹیرنگ گھمایا تو انجن نے حالتِ نزع کی سی آواز نکالی۔ چار و ناچار یہ کار کُبڑی بُڑھیا کی طرح فورٹ ولیم کی طرف آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ آگے آگے جنرل نیازی اور دوسرے سینئر افسر اور پیچھے پیچھے ہم۔ اس وقت ہمیں اپنی سٹاف کاریں بہت یاد آئیں۔ جگمگ جگمگ کرتیں، پھُر پھُر اُڑتیں، سبک گام، شیریں کلام اور پیر دبانے سے بے لگام۔ ہماری کاریں تھیں بھی تو ولائتی۔ بھلا بنیا کی بنی ہوئی ایمبیسڈر کاروں کا ان سے کیا مقابلہ! اسی مختصر سفر میں مخالف سمت کو جاتی ایک ولائتی کار نظر آئی۔ واقف کار سی لگی۔ ذرا غور سے اس کے خدوخال دیکھے

○ ہیلی کاپٹر کے اُترنے اور اُڑنے کی جگہ۔

تو اپنی ڈھاکہ والی سٹاف کار نکلی، جس میں اب کوئی بھارتی جرنیل سوار تھا۔ ہم نے وہ کار کیوں کھو دی؟ —— شاید یہ ان جگمگ جگمگ کرتی کاروں کا ہی اثر تھا کہ آج ہم مفتوح تھے اور وہ فاتح!

فورٹ ولیم میں داخل ہوئے تو برِّ صغیر میں اُردو کے ماضی، حال اور مستقبل کا ایک خاکہ ذہن میں اُبھرا۔ فورٹ ولیم جو کبھی اردو کے فروغ کی علامت تھا آج ایسٹرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹرز تھا۔ جس قلعے پر اردو کا پرچم لہرانا چاہیے تھا آج وہاں بھارتی فوج کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ کیوں؟ جب بنگال میں ہمارا پرچم ہی سرنگوں ہو گیا تو اردو کا پرچم کیسے سربلند رہتا۔

فورٹ ولیم کے اندر گاڑی نے دو تین موڑ گھوم کر تاریخی عمارتوں کو ایک طرف چھوڑا اور ہمیں نئی ساخت کی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے اُتار دیا۔ یہ تھی بھارت میں ہماری پہلی منزل!

○ ○

گوشے میں قفس کے....

اپنے نئے کاشانے میں پہنچ کر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو سب سے پہلے سؤر ہی سؤر نظر آئے۔ (میری مراد اصلی سؤروں سے ہے) بھورے بھورے، کالے کالے، موٹے موٹے، تازے تازے، یہ ہمارے بلاک کے پیچھے گندے نالے میں محوِ خرام تھے۔ میرے خیال میں ان کی وہاں موجودگی محض اتّفاقی تھی۔ ان کا ہمارے استقبال سے کوئی تعلّق نہ تھا، کیونکہ اس کام کے لیے کوئی سو سوا سو بھارتی سپاہی اور افسر موجود تھے۔ افسروں کا کام ہمیں اپنے اپنے کمروں میں پہنچانا اور سپاہیوں کا کام گندے نالے سمیت چاروں طرف حفاظتی حصار باندھنا تھا۔ پہریدار سنگینیں تانے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ آتے جاتے ایک نظر ہمیں بھی دیکھ لیتے۔ تحفّظ کے لیے نہیں، تجسّس کے لیے۔

یہ بات بظاہر حبِّ وطن کے منافی نظر آتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دشمن کی سرزمین میں پہنچ کر اندیشہ ہائے دُور و دراز کی بجائے وقتی طور پر احساسِ تحفّظ سا ہوا، کیونکہ یہاں نہ بنگالیوں کی گالیاں سنائی دیتی تھیں نہ جنونی غولوں کی آوارہ گولیاں پہنچتی تھیں۔ گویا یہاں نہ تیرِ الزام تھا نہ سنگِ دشنام۔ میرے اس احساس کی تائید بعد میں ان احباب نے بھی کی جو ڈھاکہ میں رہ گئے تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ تم خود تو جرنیلوں کی آڑ میں کلکتہ پرواز کر آئے اور ہمیں وہیں سرِ مقتل چھوڑ آئے۔

جس سہ منزلہ بلڈنگ میں ہمیں ٹھہرایا گیا، اس کی زمینی منزل پہ گارد اور سیکورٹی والوں کا قبضہ تھا۔ دوسری منزل ان جرنیلوں کے لیے تھی جو ابھی مشرقی پاکستان میں تھے؛ چنانچہ ہمیں سب سے اونچی یعنی تیسری منزل پر رکھا گیا جہاں سے فرار کی خاطر چھلانگ لگاتے وقت خودکشی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہر منزل کے شمالی جانب برآمدہ اور جنوبی طرف چھوٹی سی بالکنی تھی۔

یعنی ہر دو طرف سے نظارے کی گنجائش تھی۔ مَیں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر شمالی جانب نگاہ ڈالی تو فورٹ ولیم کے پار دریائے ہُگلی اور اس کا دیوہیکل آہنی پُل نظر آیا۔ اس دریا کی صحت وصفائی کے بہانے فراخا بیراج کا ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا۔ اس وقت اس دریا میں دو تین غیر مُلکی جہاز کھڑے تھے جن کے رنگا رنگ پھریرے سمندری ہواؤں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ کیا ان جہازوں میں چھُپ کر آدمی فرار نہیں ہو سکتا؟ ایک جذبے نے انگڑائی لی اور سوچ کے ہاتھوں وہیں اس کا کُشت وخون ہو گیا۔

بالکنی سے وسعتِ نگاہ کو ڈھیل دی تو کلکتہ شہر کی اونچی اونچی عمارتوں نے نگاہوں کا راستہ روک لیا۔ صرف عمارتیں ہی عمارتیں، سنگ وخشت کے انبار، اور وہ بھی دُھند کی دبیز تہ میں لپٹے ہوئے۔ سنگ وخشت کے اس انبار کے اندر فلیٹوں، تاریک گلیوں اور غلیظ جھونپڑیوں میں بسنے والے عوام کا صرف تصوّر ہی کیا جا سکا، نظر کچھ نہیں آتا تھا۔

اپنے بلاک کے اندر جھانکا تو اسے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے کمروں پر مشتمل پایا۔ ہر کمرے کو مسہری، تپائی، بستر، مچھردانی، رائٹنگ ٹیبل، ٹیبل لیمپ، کپڑوں کی الماری اور ضروری فرنیچر سے مزیّن پایا۔ بھارتی آقاؤں کے ہاتھوں مسلمان قیدیوں کے لیے یہ آرام وہ سامان ضرور بنیا کی کوئی چال ہو گی۔ وہ سمجھتا ہو گا یہ سبز باغ دکھا کر وہ ہمارے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرے گا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ یہ چیزیں دیکھ کر ہمارا ردِّ عمل قطعی مختلف تھا۔ ان سے میرے جسم میں احساس کی سوئیاں چبھنے لگیں اور نظر میں آبلے پڑنے لگے۔

شام کو ہم سب ایک کمرے میں کھانے کی میز پر جمع ہوئے۔ بھارتی سپاہیوں نے کھانا لا کر ہمارے اردلیوں کے حوالے کر دیا اور انہوں نے میز پر چُن دیا۔ صدارتی کُرسی پر جنرل نیازی بیٹھ گئے کہ وہی اس کُرسی کے حقدار تھے۔ ان کے دائیں اور بائیں دوسرے سینئر افسروں نے نشستیں سنبھالیں۔ آخری کُرسیاں مجھ جیسے سٹاف افسروں کے لیے بچ گئیں۔ چھُریاں، کانٹے، چمچ اور بیرہ نما اردلی دیکھ کر احساس ہوا کہ ہم کسی سرکاری ضیافت میں شریک ہیں۔ لیکن ڈونگوں کے ڈھکنے اُٹھائے

تو بھانڈا پھوٹتا۔ ایک میں سے گوبھی آلو نے آواز بلند کی، دوسرے سے دال نعرہ زن ہوئی ——— اس سے بھارت کا ایک اور روپ سامنے آیا۔ اوپر سے کچھ اندر سے کچھ۔

دال کے ہمراہ اُبلے ہوئے چاولوں کی ایک طشتری اور سانولی چپاتیوں کی چھ اِنچ اونچی منڈیر بھی تھی۔ کھانے والوں میں سے اکثر کا قد چھ فٹ سے اونچا اور ان کی تعداد درجن بھر سے زیادہ تھی؛ چنانچہ جس نے چاول کو ہاتھ لگایا، اسے چپاتی نہ ملی اور جس نے چپاتی کو مقدّم جانا وہ چاولوں سے محروم رہا۔ مجموعی طور پر نہ چپاتی والے سیر ہوئے، نہ چاولوں والے۔ استفہامیہ نگاہیں اردلیوں کی طرف اٹھیں، لیکن وہاں سے مجبوری اور بے بسی کا جواب پا کر جُھک گئیں۔

کھانا کھا کر چہل قدمی کے لالچ میں برآمدے میں نکل آئے، لیکن اس کا ظرف میزبانوں کی طرح اتنا تنگ تھا کہ دو سے زیادہ آدمی اس میں نہ سما سکے۔ چند افسر ٹہلنے لگے، لیکن جنرل نیازی ان میں شامل نہ تھے۔ وہ کھانے کی میز سے اُٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مَیں بھی سینئر افسروں کے کندھوں سے کندھا بچاتا برآمدے کے چکّر لگاتا رہا، لیکن جلد ہی کمرے میں لوٹ آیا۔

بستر کی سفید چادر، استری کی ہوئی سفید مچھردانی، کھڑکی پہ دیدہ زیب پردے، ٹیبل لیمپ کا پھولدار شیڈ، مَیں نے ان سب کا اجتماعی حملہ اقبالؔ کے ایک مصرعے ہی سے پسپا کر دیا

چھپتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

زادِ راہ کے طور پر جو کتابیں ساتھ لایا تھا، ان کی ورق گردانی شروع کی، لیکن مطالعے کی نوبت آنے سے پہلے ہی نیند نے اپنی میٹھی گود میں لے لیا۔ آنکھیں ایسی بند ہوئیں کہ ہوش نہ رہا کہ مَیں کہاں پڑا ہوں، اور کس حیثیت میں پڑا ہوں، قیدی ہوں یا آزاد، ذلّت میں ہوں یا لبِ گور پڑا ہوں؟ رہزن کے کھٹکے سے بے نیاز ہو کر اب سویا تو سورج چڑھے آنکھ کھُلی۔

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہُوں رہزن کو

اُٹھ کر شیو بنائی، گیزر (GEYSER) سے گرم پانی لے کر غسل کیا اور تازہ دم ہو کر ناشتے

کی میز پر دوسرے افسروں کے ساتھ جا بیٹھا۔ ناشتے میں توش کم اور چائے کم تر تھی، البتہ انڈے فی کس کے حساب سے پُورے تھے اور مسلمان کو اگر انڈا مل جائے، تو تمام فروگذاشتیں نظر انداز کر دیتا ہے؛ چنانچہ ہم ناشتے کی میز سے نسبتاً مطمئن اُٹھے کہ چلو پھر لنچ میں اگر دال گوبھی سے بھی دو چار ہونا پڑا تو انڈے کی تقویت تو دن بھر ساتھ دے گی۔

لیکن اصل مسئلہ لنچ یا ناشتے کا نہیں، بلکہ درمیانی وقت گزارنے کا تھا۔ مخصوص اوقاتِ کار سے مخصوص عادتیں پرورش پا چکی تھیں۔ اب اسیری کے روزِ اوّل ہی ان بیس بیس تیس تیس سالہ عادتوں کا خون کرنا آسان نہ تھا۔ پڑھنے کو نہ فائلیں تھیں نہ کتابیں، ملاقاتی تھے نہ ٹیلیفون، کھیلنے کو نہ چوگان کے گھوڑے نہ ٹینس کورٹ، جھڑکیاں دینے کے لیے نہ بیویاں تھیں نہ جھڑکیاں سہنے کے لیے شرپسند بنگالی۔ گلشن کا کاروبار چلے تو کس طور؟

مَیں نے دیکھا کہ جنرل نیازی اور جنرل فرمان، جن سے ملاقات کرنے کے لیے لوگوں کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا، اب سراپا فراغت تھے۔ اب نہ کوئی حاجت مند تھا نہ حاجت روا۔ نہ کوئی محمود تھا نہ کوئی ایاز۔ گویا اپنی مسند سے اُتر آئے ہیں خدا بھی۔ بہر حال اب وقت پر جمود طاری ہو گیا۔ گھڑیاں ٹِک ٹِک کرتیں، لیکن وقت کو دھکا نہ لگتا۔ ہم جنسِ رائیگاں کی طرح بیکار بیٹھے تضیعِ اوقات کے منصوبے بنانے لگے۔ ایک دُور اندیش اے ڈی سی نے تاش کے پتّے مہیا کر دیے۔ مَیں نے اپنی چاروں کتابیں پیش کر دیں۔ انہیں راشن کر کے پڑھنے کا پروگرام بنایا گیا، یعنی جب چار آدمی تاش کھیل رہے ہوں تو دوسرے کتابوں سے جی بہلائیں، اور پھر کتابوں اور تاش کے پتّوں کا باہمی تبادلہ کر لیا جائے۔ جنرل نیازی نہ خود تاش کھیلتے تھے، نہ شعر و ادب کو نوازتے تھے؛ البتہ پاس بیٹھ کر دونوں کی سرپرستی اکثر کیا کرتے۔

اس طور ہم نے صبح کو شام کرنا شروع کیا۔ درمیانی وقفوں میں نماز کی طرف رجوع کیا۔ چند احباب تو پہلے ہی پابندِ صلوٰۃ تھے۔ انہوں نے مشقِ مناجات جاری رکھی۔ باقی ساتھیوں نے بھی فراغت کے اوقات میں نماز قائم کرنا، وقت کا بہترین مصرف جانا اور چند دن کے اندر اندر

تقریباً سبھی نمازی بن گئے۔

ہمارے قیامِ کلکتہ کے آغاز ہی میں میجر جنرل محمد حسین انصاری (۹ ڈویژن)، میجر جنرل نذر حسین شاہ (۱۶ ڈویژن)، اور میجر جنرل عبدالمجید قاضی (۱۴ ڈویژن)، تشریف لے آئے۔ ان کے علاوہ دو بریگیڈیر صاحبان بھی ڈھاکہ سے ہمارے گروہ میں شامل ہو چکے تھے۔

ان نئے وی آئی پی حضرات کو درمیانی منزل میں ٹھہرایا گیا۔ ہماری اور ان کی ملاقات صرف کھانے کی میز پر ہوتی تھی۔ ویسے میل جول منع تھا، لہٰذا ان کے آنے سے کھانے کی میز کی رونق تو بڑھ گئی، لیکن فارغ وقت کاٹنے میں کوئی خاص مدد نہ ملی؛ چنانچہ ہم ان کی محفل سے مستفید ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت کھانے کی میز پر گزارتے۔ اتنے سارے جرنیلوں کو یوں قریب سے دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا۔ ان کی بصیرت افروز باتیں گھنٹوں سُنا کیا۔ حالاتِ حاضرہ سے لیکر تمام معاشی، معاشرتی، صنعتی اور ثقافتی مسائل پر ان کے خیالات سے مستفید ہوا۔ ان کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ مجھے چند گھنٹوں کی توجہ سے ملنے لگا؛ البتہ ایک بات کھٹکی کہ وہ پیشہ ور سپاہی ہو کر پاکستان کا حالیہ المیہ زیرِ بحث کیوں نہیں لاتے؟ کیا یہ کوئی دُکھتی رگ ہے، جسے کوئی چھیڑنا نہیں چاہتا؟ ایک دانائے راز نے رہنمائی کی کہ "کیا معلوم کھانے کا کمرہ بگ (BUG) کیا ہوا ہو، لہٰذا احتیاط لازم ہے۔" ان سپہ سالاروں میں میجر جنرل جمشید کی کمی شدّت سے محسوس کی گئی۔ بھارتی حکّام سے جب ان کا پتہ پوچھا، یہی جواب ملا کہ وہ ڈھاکہ سے افواجِ پاکستان کے انخلأ کے انتظامات میں مصروف ہیں، لیکن چند روز بعد وہ مجھے کہیں اور ملے۔

جس طرح بھارت نے مشرقی پاکستان میں ہماری کوتاہیوں سے فائدہ اٹھایا، یہاں بھی اس نے ہماری فراغت سے فیضیاب ہونا شروع کر دیا۔ تمام سینئر افسروں کو باری باری ڈسکشن (DISCUSSION) کے لیے بُلایا جانے لگا۔ یہ لفظ (INTERROGATION) کا ملائم سا نعم البدل تھا۔ بحث مباحثہ سے واپسی پر اکثر جرنیل مذاکرات کی ایک آدھ گرہ سرِ عام کھول دیتے، لیکن باقی تفصیلات اپنے تک ہی محدود رکھتے۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا "میں نے

بھارت کو آگاہ کر دیا ہے کہ تم نے بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کے جوش میں ایک جن (MONSTER) مول لیا ہے۔ یہ تمہارے لیے مستقل سر دردی کا باعث رہے گا۔" جو لوگ ایسے مذاکرات کے لیے نہ بلائے جاتے، وہ تاش سے جی بہلاتے رہتے۔ برج اور فلاش سے ناواقفی کی بنا پر سویپ (SWEEP) ہی کو اپنایا گیا۔ اس کے مستقل کھلاڑی جنرل انصاری، جنرل فرمان، ایڈمرل شریف اور مَیں تھے۔ پارٹنر بدلتے رہتے، لیکن چوکڑی وہی رہتی۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے سویپ میں سب سے زیادہ نمبر حکم کے نہلے اور دہلے کے ہوتے ہیں، ایک دفعہ جنرل فرمان کے خلاف کھیلتے ہوئے مَیں نے یہ دونوں پتے جیت لیے، تو انہوں نے ازراہِ مذاق کہا "سالک! تم دونوں اہم پتے لے گئے ہو، کچھ خیال کرو، مَیں تمہیں ڈھاکہ سے مکتی باہنی کے چنگل سے بچا کر لایا تھا۔" مجھے ان کے احسان سے انکار نہ تھا۔

ہمارے کھیل کے دوران میں کبھی کبھی جنرل نیازی بھی پاس آ بیٹھتے۔ گیروے رنگ کی شلوار قمیص، میانوالی کے ہرے بیل بوٹے والے چپل، تازہ بہ تازہ شیو، کنگھی سے سجے سجائے بال، وہ اکثر خاموش بیٹھے پتوں کو یوں دیکھتے رہتے جیسے کبھی ایسٹرن کمانڈ کے آپریشن روم میں جنگی نقشوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اور پھر مختصر الفاظ میں کھیل پر تبصرہ کر دیتے۔ ہنسی مذاق، لطیفہ بازی یا قہقہہ زنی کی جو روایتیں مَیں نے پاکستان آکر ان سے منسوب سُنیں، ان کا اظہار مَیں نے کم از کم قیامِ کلکتہ کے دوران نہیں دیکھا۔ وہ بس جی بہلانے ہمارے پاس آ بیٹھتے یا ہم میں سے کسی ایک کو اپنے پاس بُلا لیتے۔

سچ پُوچھیے تو اسیری کے یہ دس پندرہ روز قید کا آسان ترین دور تھا۔ کوئی ذہنی یا جسمانی اذیت نہ تھی۔ اوّل تو ادنیٰ اور اعلیٰ بھارتی افسر خود ہی تمیز سے پیش آتے، لیکن ان کی گفتگو یا حرکات سے اگر گستاخی کا پہلو نکلتا تو ہمارے افسر انہیں تنبیہہ کر دیتے

فقیہہِ شہر! ادب سے کلام کر ہم سے
ستم ظریف! بڑے باوقار ہیں ہم لوگ

اس بے پروبالی میں جو آرام ہمیں میسّر تھا، اس کی خبر ہمارے اہلِ خانہ کو نہ تھی، بلکہ اکثر فکر لاحق رہتی کہ ہم تو یہاں تاش اور آلو گوبھی سے عیش کر رہے ہیں، وہ سخت پریشان ہوں گے اور پتہ نہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے سابق قیدی خبر گیری کے بہانے ان کو کیسے کیسے جاں گداز قصّے سُناتے ہوں گے کہ قیدیوں سے چکّی پسوائی جاتی ہے، سڑکیں بنوانے کے لیے روڑی کٹوائی جاتی ہے اور اگر کوئی قیدی کام میں ڈھیل دکھائے تو ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے ہیں، وغیرہ

اگرچہ ہمیں اندازہ تھا کہ وقت آنے پر بھارتی آقا جاپانیوں اور جرمنوں سے کسی طور پیچھے نہیں رہیں گے، لیکن تا حال ان کا سلوک انسانی زُمرے ہی میں آتا تھا؛ چنانچہ جب ہمیں سادہ کاغذ پر اپنے اپنے گھر خط لکھنے کو کہا گیا، تو مَیں نے نہایت محتاط الفاظ میں تا حال انسانی سلوک کا مژدہ رقم کیا اور رجائیت میں رچے بسے الفاظ میں اہلِ خانہ کو صبر و تحمّل سے حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ خط تو لکھ دیا لیکن بھارتیوں پر اعتماد نہ تھا کہ وہ اسے ہمارے وطن پہنچائیں گے۔ شاید انہوں نے اپنے طرزِ عمل کے متعلق ہمارا ردِّ عمل جاننے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اپنے اپنے گھر خط لکھنے کے بعد ہم آنے والے ایّام کی تصویر کھینچنے لگے۔ کسی کا خیال تھا کہ اسیری کے باقی دن یا ہفتے یہیں گُزریں گے اور اسی طور گزریں گے۔ کسی کا اندازہ تھا کہ ہماری منزل کہیں اور ہے۔ ہم اس وقت اعراف میں ہیں۔ ایک قنوطی نے دائیں ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کر کے ناصحانہ انداز میں کہا "ہم یہاں رہیں یا کہیں اور، وطن پہنچتے پہنچتے تین مہینے لگ جائیں گے۔ اس مایُوس کُن تخمینے کے بعد کسی نے تین ماہ کے لیے شیو کے بلیڈوں کا حساب لگانا شروع کر دیا، کسی نے نہانے کے صابن اور کسی اور نے دیگر ضروریاتِ زندگی کا۔ ایک صاحب نے اس مسئلہ کا مختصر حل ڈھونڈا۔ وہ کہنے لگے "میرے پاس ایک قینچی ہے۔ جب تک چاہیں، جہاں چاہیں رکھ لیں۔ قینچی سے خود ہی سر اور داڑھی کے بال کاٹ لیا کروں گا۔ اور اگر انہوں نے ذہنی یا جسمانی اذیّت دینے کی کوشش کی تو اپنے آپ کو ذہنی طور پر سُن کر لُوں گا، کر لیں جو کچھ کرنا ہے۔" دوسرے بولے: "وہ جو چاہیں کریں اور جہاں چاہیں رکھیں، بس ذلیل نہ کریں —"

ان کا مطلب تھا کہ قید کی ذلّت سے بدتر ذلّت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ لیکن یہ سب اندازے، یہ سب وسوسے رخشِ خیال کا کارنامہ تھے۔ دراصل کسی کو پتہ نہ تھا کہ رخشِ عمر ہمیں کہاں، کب اور کدھر لے جائے گا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نَے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

ایک روز مَیں نوجوان افسروں (اے ڈی سی)، کے ساتھ بالکنی میں بیٹھ کر نالے کے پار آباد دُنیا کا تماشا کرنے لگا۔ سب سے پہلے دھوبیوں پر نظر پڑی جو گیلے کپڑوں سے پتھر کی سنگدل سِلیں توڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور اپنی ضربوں کو مؤثّر کرنے کے لیے ساتھ ساتھ چھُو چھُو کرتے جاتے تھے۔ دھوبی گھاٹ کے دائیں طرف فلیٹوں کی چار منزلہ عمارت تھی جس میں کم درجے کے فوجی مع اہل و عیال رہتے تھے۔ ہمارے بیٹھے ان فوجیوں کی شرمیتیاں رنگ برنگی ساڑھیاں پہنے ماتھے پر تلک سجائے ہاتھ میں گڑوی اٹھائے گوالے سے دودھ لینے نکلیں۔ بعض کے ہمراہ کم عمر بچّے بھی تھے۔ چند ایک نے رُک کر اپنے بچّوں کی توجّہ ہماری جانب مبذول کرانے کے لیے اُنگلی اُٹھائی۔ ضرور کہہ رہی ہوں گی۔ "مُنّے! یہ سب پاکستانی قیدی ہیں جو تمہارے سورما پتا جی نے پکڑے ہیں۔"

پتہ نہیں کیوں بعض اَن سُنی باتوں سے بھی کوفت ہونے لگتی ہے۔ مَیں اُٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

جنوری ۱۹۷۲ء کے ابتدائی دن تھے کہ میجر ورما نے مژدہ سُنایا کہ آپ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں میرے ساتھ فورٹ ولیم لائبریری سے اپنی پسند کی کتابیں لا سکتے ہیں۔ قید میں فورٹ ولیم لائبریری سے استفادہ، بھلا اس سے بڑی نعمتِ خداوندی کیا ہو سکتی ہے! مَیں جھٹ پٹ ذہن میں موضوعات کی فہرست مرتّب کرنے لگا۔ لائبریری ایک جہاندیدہ عمارت میں قائم تھی۔ اس کا طول و عرض بھارت کی طرح پُرشکوہ تھا۔ لیکن اندر جھانکا تو کتابوں کی دنیا کو بھارت

کے دل کی طرح چھوٹا پایا۔ زبان اور ادب پر کتابیں تقریباً ناپید تھیں۔ چند گلی سڑی کتابوں میں ساحر لدھیانوی اور فیض احمد فیض کے دیوان شانے سے شانہ ملائے نظر آئے۔ اس کے علاوہ ہندی مصنّفوں کی کتابیں تھیں یا ملٹری ہسٹری کی۔ دراصل یہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرز کی فوجی لائبریری تھی، جو لائبریری کم اور گودام سے زیادہ مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے چند کتابیں نکالیں۔ کچھ اپنے لیے، کچھ اپنے اعلیٰ افسروں کے لیے۔ ان دنوں (یعنی اکتوبر ۱۹۷۳ء سے پہلے تک) موشے دایان کا طوطی بولتا تھا۔ چند ایک کتابیں اس کے سوانح اور کارناموں کے متعلّق اٹھا لایا؛ اگرچہ یہ کوشش ذرا بعد از وقت تھی، تاہم ان کتابوں سے وقت کو دفع کرنے میں خاصی مدد ملی۔ ابھی ہم ان کتابوں ہی سے نبرد آزما تھے کہ ایک بھارتی افسر نے رازدارانہ لہجے میں انکشاف کیا کہ جلد ہی آپ یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ کہاں، کب، کدھر، یہ سب صیغۂ راز میں تھا۔ اُمّید خلافِ اُمّید یہی اُبھری کہ ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ بھوڑے سے تو ہیں۔ ایک چھوٹا سا جہاز کافی رہے گا۔ اور اگر بذریعہ ریل گاڑی گئے، تو بمشکل ایک ڈبّہ درکار ہو گا۔ چلو ایک دو گھنٹے میں نہیں، تو ایک دو دن میں پہنچ جائیں گے۔ ان غیر حقیقی توقعات کی بنیاد بعض گمراہ کُن اخباری تبصرے تھے کہ صدرِ پاکستان نے مجیب الرّحمٰن کو بظاہر غیر مشروط طور پر رہا کر دیا ہے، لیکن درحقیقت ایک دوست ملک نے ضمانت دی ہے کہ تم مجیب کو چھوڑ کر خیر سگالی کی فضا پیدا کرو، ہم تمہارے جنگی قیدی واپس منگوا دیں گے۔ شاید اس امّید بے جا کا نفسیاتی پہلو یہ بھی تھا کہ قیدی ہر ذرّے کی جنبش، ہر پتّے کی لرزش اور ہر کلی کی چٹک سے اپنی ہی رہائی کا پہلو نکالنے لگتا ہے۔

۶ جنوری کی شام کو وی آئی پی حضرات کو جنگی قیدیوں کی وردیاں دی گئیں، تو سب اُمّیدیں خاک ہوئیں۔ وردیوں سے پتہ چلا کہ ہم کوئے یار کی بجائے سوئے دار جانے والے ہیں۔ ہر وی آئی پی کو دو سبز پتلونیں، دو قمیصیں اور دو کمبل دیے گئے۔ ایک اردلی نے کمبلوں کو اُٹھا کر الگ کرنا چاہا، تو ان کا نصف بوجھ فالتو اُون کی شکل میں زمیں بوس ہی رہا۔ ایک وی آئی پی نے جونہی پتلون کا ناپ لینا چاہا، تو وہ کمر سے تجاوز کر کے گلے تک پہنچ گئی۔ قمیص کو جانچا تو اسے

اتنا مختصر پایا کہ کسی نازک اندام صنم کے لیے مناسب ہو تو ہو، پاکستانی سپاہی یا افسر کے لیے ہرگز موزوں نہ تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم جونیئر قیدی اس تحفے کے بارِ گراں سے محفوظ رہے۔
اگلے روز حکم ملا کہ صبح تین بجے تیار رہنا، کوچ کا وقت آپہنچا ہے۔ جرنیلوں کو کسی بہانے نیچے طلب کیا گیا اور اوپر ان کے اے ڈی سیز کی موجودگی میں ان کے سامان کی تلاشی لی گئی اور وہ ۷ جنوری کو طلوعِ آفتاب سے پہلے روانہ ہو گئے۔ ان کی منزل جبل پور بتائی گئی۔ مَیں اوپر یوسفِ بے کارواں کی طرح مغموم نگاہوں سے گردِ کارواں کا نظارہ کرتا رہا۔

مَیں حسبِ حکم وردی پہنے منتظر رہا۔ لیکن سارا دن کوئی نامہ و پیام نہ آیا۔ سوچا بنیا تاڑ گیا ہے کہ مَیں وی آئی پی کے مرتبے سے کہیں کمتر اور اے ڈی سی کے رُتبے سے ذرا بالاتر ہوں۔ ضرور کوئی منفرد جنس ہوں جس کے ساتھ منفرد برتاؤ لازم ہے۔

ہم سفر اور بھی سرگرمِ سفر تھے لیکن
مجھ کو صیّاد نے رفتار سے پہچان لیا

○ ○

قیدی نمبر ۱۰

۷ جنوری ۲۷ء کو میں سارا دن مجو کا پیاسا شعر چباتا رہا۔ غروب آفتاب کے بعد انٹلی جینس کا ایک بابو نما کارندہ آیا جس نے اطلاع دی کہ سفر کے لیے نیچے گاڑی تیار کھڑی ہے۔ پوچھا کہاں کا عزم ہے؟ اس نے اپنے ملک کی سیکورٹی کا خاص خیال رکھتے ہوئے یہ اہم راز فاش کرنے سے انکار کر دیا۔ میں شعر گنگناتا ہوا سیڑھیاں اُترنے لگا۔

جب میکدہ چُھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

نیچے اترا تو انہوں نے مجھے ایک تاریک فوجی ٹرک کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا، چار آدمیوں کی مسلّح گارڈ ساتھ ہوئی۔ روانگی سے قبل انہوں نے رسّی سے میرے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے اور آنکھوں پر تہ دار پٹّی کس کر میری قوّتِ مشاہدہ کو معطّل کر دیا۔ اب صرف مجھے ان کے قدموں کی چاپ اور ٹرک کے دروازے کُھلنے اور بند ہونے کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ چند لمحے بعد ٹرک حرکت کرنے لگا اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے خاصا سبک رفتار ثابت ہوا۔ ٹرک کے اندر مکمّل خاموشی تھی۔ لب بند، نفس بند، دہن بند، زبان بند۔ البتّہ فورٹ ولیم سے باہر نکلے تو پاس سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے ہارن سُنائی دینے لگے۔ اور کبھی سامنے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹ پٹّی کی تہوں کو چیرتی ہوئی آنکھ کی تپلیوں تک پہنچ جاتی۔ ٹرک چلتا رہا، موڑ مڑتا رہا۔ اس کی گردشِ متواتر سے سمت اور فاصلے کی لڑی ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔ جوں جوں سفر طویل ہوتا جاتا، اپنی منزلِ مقصود کے بارے میں تجسّس اور تشویش بڑھتی جاتی —— منزل ہے

کہاں تیری اے لالۂ صحرائی !

لیکن کچھ پتہ نہ چلا، ٹرک کے شور و شغب سے صرف یہ قیاس کر پایا کہ میں کسی مصروف شاہراہ سے گزر رہا ہوں ۔ لیکن شاخ سے توڑ کر یہ آندھی مجھے کہاں لے جائے گی ، اس کا تعیّن نہ کر سکا۔ کبھی سمجھتا کہ ٹرک کا رُخ جیسور (مشرقی پاکستان) کی طرف ہے، کبھی اندازہ لگاتا کہ یہ مجھے وسطِ ہند میں کسی کیمپ میں لے جا رہا ہے، کبھی وہم ہوتا کہ ..... مَیں نے ان اندیشوں سے نجات پانے کے لیے تحت الشعور سے شعر کریدنے شروع کیے۔ صرف ایک مصرعہ ہاتھ آیا۔

کہاں گیا میرا قافلہ، کہاں رہ گئے میرے ہمسفر

پھر واہموں نے گھیر لیا، شعروں اور اندیشوں کی کش مکش ابھی جاری تھی کہ ٹرک ایک جگہ رُکا، بھاری بھر کم آہنی پھاٹک کھُلنے کی آواز آئی۔ ٹرک ذرا اندر سرکا، پھاٹک بند ہو گیا۔ پچاس ساٹھ گز آگے پھر یہی مشق دُہرائی گئی۔ ایک پھاٹک اور کھُلا، پھر بند ہوا۔ تھوڑی دُور جا کر کسی نے مجھے بازو سے گھسیٹ کر اس حمارِ برق رفتار سے اُتار لیا اور بند آنکھوں اور بند ہاتھوں سمیت ایک کوٹھڑی میں کھڑا کر دیا۔ ایک شخص نے میرے ہاتھ کھولے، دوسرے نے پٹّی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو دو گھنٹے پچاس منٹ سفر میں گزار چکا تھا۔ یعنی کم و بیش ستّر اسّی میل۔ غالباً کلکتہ سے جیسور کی سرحد اتنی ہی دُور ہو گی۔ بہر حال اب مَیں ایک دس فُٹ مربّع کوٹھڑی میں کھڑا تھا جس میں کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان، کرسی تھی نہ چارپائی۔ یہاں میری اور میرے سامان کی مفصّل تلاشی لی گئی۔ کُرتہ پاجامہ چھوڑ کر ہر چیز یعنی بستر، شیو کا سامان، صابن، تولیہ، کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ اس کے بعد چار گورکھا سپاہی سنگینوں کے سائے تلے مجھے ایک احاطے سے دوسرے احاطے میں لے گئے۔ اس پندرہ فٹ چوڑے اور بیس فٹ لمبے صحن کے ایک جانب بیت الخلاء اور غسل خانے تھے اور دوسری جانب قیدِ تنہائی کی کوٹھڑیاں جنھیں عُرفِ عام میں سیل (CELL) کہا جاتا تھا۔ یہ سیل ایک پست قامت پہاڑی کا دامن کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ گارڈ کمانڈر نے سطحِ زمین سے چار فٹ نیچے اُتر کر ایک سیل کے کواڑ کھولے۔ اس کے بعد دو سپاہیوں نے جانفشانی سے لوہے کا بھاری

دروازہ وا کیا۔ اس میں داخل ہو کر کوئی چھ فٹ آگے ایسا ہی ایک اور دروازہ ملا۔ اسے کھینچ کر سپاہیوں نے راہ دینے پر مجبور کیا۔ اس کے آگے کوئی اور دروازہ، کھڑکی یا روشندان نہ تھا۔ بس ایک کال کوٹھڑی تھی جس میں مجھے ڈال کر تینوں دروازے یکے بعد دیگرے بند کر دیے گئے۔ کواڑ بند ہونے سے روشنی کی مدھم سے مدھم کرن بھی اندر نہ جھانک سکتی تھی۔ میں اس شبِ تار میں سب سے اندرونی دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دن کے شوقِ تماشا اور شب کی اختر شماری کے تمام امکانات یکسر ختم ہوئے۔ کسی شاعر نے "شہر میں دیوانے، دشت میں قیس، کوہ میں فرہاد" کی نشاندہی کی تھی، لیکن اسے اس شبِ تیرہ و تار کی تنہائی کا خیال کبھی نہ آیا۔ سوچا چند روز پہلے فورٹ ولیم میں بیٹھ کر اسیری کے آئندہ ایّام کی جو دھندلی سی تصویر بنائی تھی وہ اتنی گھناؤنی تو نہ تھی۔

غلط تھا اے جنوں! شاید ترا اندازۂ صحرا

کوئی ایک گھنٹے بعد بند دروازوں کے باہر ایک نیم جاں بلب ٹمٹمایا۔ دروازے کے اوپر دو اِنچ مربّع کے واحد سوراخ سے اس کی نیم مُردہ کرنیں اندر داخل ہوئیں جن سے آہنی دروازوں کی سلاخیں مجھ پر منعکس ہونے لگیں۔ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں باہر سے اپنی موجودہ حالت کا مشاہدہ کیا تو اپنے آپ کو ایک خالص قیدی کے مکمّل روپ میں پایا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں آہنی دروازے کھُلے۔ ایک بھنگی نما شخص نے پرانے کمبلوں کے دو ٹکڑے میرے سامنے پھینک دیے۔ انہیں جھاڑ کر دیکھا تو ان کا سینہ فگار نظر آیا۔ دل ٹٹولا تو اسے داغ داغ پایا۔ فوراً رد کرنے لگا تو نم آلود فرش کی ٹھنڈی اینٹوں نے دُہائی دی کہ جنوری کا آغاز اور سردی کا شباب ہے، کیسے بسر اوقات کرو گے؟ واقعی آئندہ دنوں میں کمبل کے یہ ٹکڑے جگر کے ٹکڑوں سے زیادہ عزیز ثابت ہوئے۔

مجھے بحیثیت قیدی سرو سامان سے لیس کرنے کی مہم ابھی جاری تھی۔ اسی بھنگی نے لوہے کی ایک پلیٹ اور ایک مگ میرے حوالے کیا۔ ان برتنوں پر کبھی ابتدائے آفرینش میں

انیمل (ENAMEL) کا لیپ چڑھایا گیا تھا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اس کے آثار مٹ چکے تھے۔ اب پلیٹ اور مگ کا اصلی سیاہ رنگ نمایاں طور پر دکھائی دیتا تھا۔ اس "ڈنرسیٹ" کی آمد کے بعد کھانے کے ارمان نے انگڑائی لی، کیونکہ کل سے کچھ نہ کھایا تھا۔ لیکن اے لبا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں پیٹ پر صبر کا بھاری پتھر رکھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک کمبل کو تہ کر کے گدّا بنا لیا اور دوسرے کو گردشِ بلا کی طرح اپنے اوپر لپیٹ لیا۔ میرے سامنے خالی پلیٹ اور مگ رکھے ہوئے تھے اور بلب کے واسطے سے سلاخوں کی عکسی چھاپ میرے سراپا پر قائم تھی۔ مَیں خاموش بیٹھا سوچا کیا۔

ہُوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش

مَیں بندۂ مومن ہُوں، نہیں دانۂ اسپند

تین بجے رات سے نیند اور بھوک، بظاہر دو متضاد عناصر نے ستا رکھا تھا۔ اب بلیک ہول (BLACK HOLE) میں محبوس ہو کر طرح طرح کے خیالات نے ستانا شروع کر دیا۔ یہ کال کوٹھڑی میرا مقدّر کیوں ہوئی؟ کیا مَیں قاتل و مجرم ہوں؟ جنرل ناگرا کے وعدے اور جنیوا کنونشن کی مراعات کدھر گئیں؟ کیا سقوطِ ڈھاکہ میں میرا اتنا بڑا قصور ہے کہ مجھے زندہ درگور کر دیا جائے؟ کیا اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید اور نیّتوں کے راز نہیں جانتا؟ اگر وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے تو مداخلت کیوں نہیں کرتا؟ ایسے ہی کئی بے ہنگم سوالات نے محشرِ خیال میں کہرام مچا رکھا تھا۔ نہ انہیں ذہن کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنے کا یارا تھا، نہ کوئی جلیس و ندیم تھا کہ اس کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ اس گھُپ اندھیرے میں نہ سایہ تھا کہ میرا ہم سبو ہوتا، نہ چاند تھا کہ ہم سخن بنتا۔ بس باہر وہی بلب چراغِ سرِ مزار کی طرح خاموش تماشائی تھا۔ ساری کائنات سمٹ کر میری ذات تک محدود ہو چکی تھی، تمام دنیوی سہارے ٹُوٹ چکے تھے۔ وہاں نہ خاندانی وقار کام آیا نہ عہدے کا لحاظ اور نہ جرنیلوں کا قرب ہی آڑے آیا۔ نہ ذوقِ شعر و ادب۔ کائنات کی ہر چیز حقیر اور بے ثبات نظر آنے لگی۔ قصرِ زیست کا کوئی ستون اگر اب بھی صحیح و سالم تھا، تو وہ

اللہ تعالےٰ پر ایمان تھا اور ایسے وقت میں یہ ایمان اور بھی مستحکم اور قوی ہو جاتا ہے۔ مَیں توکّل برخدا، چھ فٹ مربّع کمرے میں لیٹ گیا۔ ایک دیوار سر کو لوحِ مزار کی طرح چھو رہی تھی تو دوسری پاؤں کو مزید پھیلنے سے روک رہی تھی۔ عین قبر کا منظر تھا۔ عذابِ قبر کا ماحول مکمّل کرنے کے لیے وہاں بچھو اور سانپ تو نہ سہی، البتّہ مچھر، پسّو اور کھٹمل خاصی تعداد میں سرگرمِ عمل تھے۔ کچھ تو کمرے میں پہلے ہی موجود تھے اور کچھ شب خون مارنے کے لیے کمبلوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ کمبل اوڑھتا تو حشرات الارض خون پینے لگتے۔ اتار پھینکتا تو کپکپی جان نہ چھوڑتی۔ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔

اسی چھوٹے سے عذاب نے یادِ خدا تازہ کر دی اور مَیں تیسویں پارے کی آخری دس سورتیں جو کبھی بھلے وقتوں میں دیہاتی مولوی صاحب نے حفظ کرائی تھیں، بلا وضو تلاوت کرنے لگا۔ ہر آیتِ کریمہ کے ساتھ زخموں کی ٹیس میں کچھ کمی محسوس ہونے لگی۔ مَیں نے یہ وِرد جاری رکھا اور خاصا افاقہ محسوس کیا۔ سیل کے اندر یہ ہنگامہ بپا تھا، مگر باہر مکمّل سکوت تھا۔ کبھی کبھی صرف پہریدار کے بھاری بُوٹوں کی ٹھک ٹھک سُنائی دیتی تھی۔ اس نے دو اِنچ چوڑے سوراخ سے اندر جھانکا۔ مجھے لیٹا ہوا پاکر نہایت مغلّظ الفاظ میں مجھے لیٹنے سے منع کر دیا۔ مَیں حکم کی تعمیل میں بھر مرطوب اینٹوں پر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے سیدھا بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہمّت جواب دینے لگی تو مَیں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ سنتری کو جوں ہی میری اس حرکت کا علم ہوا، چند موٹی موٹی گالیاں داغتے ہوئے ٹیک لگانے سے بھی منع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مَیں ساری رات کمرے کے وسط میں بے سہارا اور بے بس اکڑوں بیٹھا رہوں تاکہ وہ گشت کرتے ہوئے سوراخ سے بآسانی مجھے دیکھ سکے۔

باہر حالات میں تعطّل تھا۔ لیکن میرے اندر کئی ہنگامے برپا تھے —— دل کی دھڑکن صدائے تیشہ کی طرح سنائی دیتی تھی، لیکن رات کا پہاڑ تھا کہ کٹنے میں نہ آتا تھا۔ خیالات اپنی بلند پروازی کے باوجود اس کوٹھڑی کے ماحول سے بالاتر نہ ہو پاتے تھے۔ بار بار خیال آتا تھا قادرِ مطلق

کا جو بیج کو مٹّی میں اور کیڑے کو پتھر میں پرورش کرتا ہے۔ مَیں لاکھ گنہگار سہی، آخر اس کی مخلوق ہوں۔ بھلا مجھے کیسے نظر انداز کر سکتا ہے! یقیناً ایک بار اور بھی دُنیا پلٹا کھائے گی۔ لیکن

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں!

گردشِ ارضی نے بالآخر عروسِ شب کو الوداع کہا اور سپیدۂ سحر تمازتِ آفتاب سے کافور ہونے لگا۔ لیکن طلوعِ آفتاب کے باوجود میری شبِ تار کی سحر نہ ہوئی۔ میرے لیے ہوا اور روشنی پر وہی قدغن رہی جو رات بھر سے تھی۔ مَیں لاچار و بے بس سیل میں بیٹھا اپنے ہی خیالات کے بوجھ تلے پستا رہا اور ہر لمحے خونِ دل رستا رہا۔ لیکن تغافل شعار میزبانوں کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔

کافی دِن چڑھے دو آدمی آئے۔ ایک باوردی گورکھا نائک تھا اور دوسرا نیم برہنہ بھنگی۔ نائک ٹھگنے قد، گندمی رنگ اور اوسط ساخت کا نیپالی باشندہ تھا۔ اس کی چپٹی ناک، اس کی گورکھالی اُردو سے پہلے ہی اس کے حسب نسب کا پتہ بتا دیتی تھی۔ وہ بولتا کم اور گھورتا زیادہ تھا۔ بھنگی اپنے پیشے کا ایک قابلِ اعتماد نمونہ تھا۔ میلی خاکی نیکر، غلیظ سیاہ ٹانگیں، پاؤں میں پھٹے ہوئے خاکی کینوس کے جوتے، اوپر ایک بنیان، ایک آنکھ اور ایک سر۔ بنیان میل خوردہ، آنکھ زخم خوردہ، البتّہ سر صحیح و سالم تھا، لیکن بھنگی کے لیے صحیح الذّہن ہونا بھلا کیا معنی رکھتا ہے! گورکھا گارڈ کمانڈر کی زیرِ نگرانی، بھنگی نے اندرونی دروازے کھولے بغیر سلاخوں میں سے مُٹھی بھر اُبلے ہوئے چاول میری پلیٹ میں ڈال دیے اور ان کی سفیدی کو سیاہی مائل کرنے کے لیے کوئی چمچہ بھر سیّال مادہ ان پر چھڑک دیا۔ مَیں نے بھنگی کے روئے سیاہ پر نگاہ ڈالی تو اس کی ٹیڑھی آنکھ میں شفقت کا شائبہ پایا۔ مَیں نے ہمّت کر کے پوچھ لیا "بھئی بتاؤ تو سہی مَیں کہاں ہوں اور کیا کوئی اور پاکستانی قیدی بھی ادھر ہے؟" قبل اس کے کہ وہ عین شفقت سے میری تشفّی کرتا، گارڈ کمانڈر بپھر گیا: "بکواس بند کرو۔ ادھر بات کرنے کا آرڈر نہیں ہے"۔ اور جھٹ سے یکے بعد دیگرے سارے دروازوں پر تالے ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس تاریک کوٹھڑی میں چراغِ رُخِ زیبا کہاں سے لاتا کہ کھانے سے پہلے ماحضر کی شناخت کرتا۔ ہاتھوں سے ٹٹولا تو ہاف بوائل (نیم برشت) چاولوں

کی انا موجود پائی۔ اگر انہیں تھوڑی دیر اور گرم پانی میں رکھا جاتا تو یقیناً ان کی اکڑ اسی طرح مر جاتی جس طرح زمانے کے گرم و سرد میں کم ہمت انسان اپنی انا کھو بیٹھتے ہیں۔ مَیں نے ایک لقمہ سیاہ مادے سے چھو کر منہ کی طرف اٹھایا تو منہ سے پہلے ناک نے اسے ردّ کر دیا۔ گھِن اور عجب غیر مانوس سی گھِن۔ نعوذ باللہ! رزقِ خدا میں گھِن کا احساس سراسر کفرانِ نعمت تھا، لیکن کیا کرتا، کوشش کے باوجود ایک لقمہ بھی تنورِ شکم میں نہ جھونک سکا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد گارڈ کمانڈر دو مسلّح سنتریوں سمیت اندر آیا اور تحکمانہ لہجے میں کہنے لگا "تم باہر آ کر پلیٹ دھو لو اور پیشاب وغیرہ کر لو، لیکن جلدی جلدی۔ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔ سُنا تم نے؟" سُنتا کیسے نہ! کسی بہانے ہی سہی دوبارہ روئے زمین پر پانچ منٹ کے لیے رونما ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ ——

مَیں نے باہر نکل کر سب سے پہلے نیلے آسمان اور اُجلی دھوپ کا نظارہ کیا۔ آنکھوں کو طراوت اور دل کو ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ "اِدھر کیا دیکھتے ہو؟ تمہارا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔" سنتری چنگھاڑا۔ مَیں نے پلیٹ سے پھینکنے سے پہلے چاولوں کو ایک نظر دیکھا۔ ان پر بھنگی کی انگلیوں کے نشان ہنوز واضح تھے۔ سیاہ سیال مادہ جس کا تعلّق شاید کسی دال کی نسل سے تھا، صحیح طور پر شناخت نہ ہو سکا۔ مَیں نے جلدی جلدی پلیٹ میں پانی پھیرا۔ چکناہٹ تو تھی نہیں کہ ٹھنڈے پانی سے نہ اُترتی۔ دو ایک کوششوں ہی سے پلیٹ کے داغ دکھائی دینے لگے۔ گویا پلیٹ صاف ہو گئی۔ مگ بھر کر بیت الخلا میں گیا۔ نظامِ قدرت تعاون کرے نہ کرے، مقررہ وقت کے اندر سارا کام پھُرتی سے انجام دینا ضروری تھا۔ باہر آ کر مگ کو کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے غسل دیا اور نل سے تازہ پانی بھر کر معدے میں محفوظ کر لیا۔ خالی انتڑیوں نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے بعد اسے قبول کر لیا۔ گارڈ کمانڈر نے دوبارہ مجھے بلیک ہول میں بند کر دیا۔ اس میں داخل ہوتے ہوتے مَیں نے کمرے کے ماتھے پر دس کا ہندسہ پڑھ لیا اور آئندہ حوالوں میں مجھے قیدی نمبر ۱۰ کے نام ہی سے پکارا جانے لگا۔ "دس نمبر قیدی اندر بکواس کر رہا ہے، اسے منع کرو۔" "اب دس نمبر کو پانچ منٹ کے لیے کھول دو۔" "اب دس نمبر کو پیش کر دو۔" وغیرہ وغیرہ۔

پہاڑ جیسی رات کاٹنے کے بعد اب دیو ہیکل دن گزارنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ سوچا ایک تہائی دن تو تقریباً گزر ہی چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد لنچ آجائے گا، پھر سہ پہر کی چائے، پھر ڈنر، چلو مینو (MENU) دال چاول ہی سہی، اسی بہانے تین بار دروازہ تو کھلے گا۔ تین بار روشنی کو خوش آمدید تو کہوں گا، خاکروب ہی سہی، کسی انسانی شکل کا دیدار تو ہوگا۔ پلیٹ دھونے کے بہانے پھر درخت پتے، گلہریاں، چڑیاں اور کوّے دیکھ سکوں گا، لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت . . . .

دن بھر کوئی گارڈ کمانڈر آیا نہ بھنگی۔ تمازتِ آفتاب کی رمق نصیب ہوئی نہ روشنی کی کرن۔ حقیقتاً دن، رات سے بھی تاریک اور بھاری ثابت ہوا، البتّہ آج کے دن کا ایک خوش آئند پہلو یہ تھا کہ سونے پر پابندی نہ تھی۔ بلاشبہ سنتری سوراخ سے بار بار جھانک کر میری موجودگی کا یقین کر لیتا، لیکن دیوار سے ٹیک لگانے یا فرش پر لیٹنے سے وہ برہم نہ ہوا۔ میں نے بھی اس کی شرافت سے خوب فائدہ اٹھایا اور دن بھر سو کر گزشتہ دو رات کی کسر پوری کر لی۔ نیند کا حملہ اتنا شدید تھا کہ بھوک حائل ہوئی نہ مچھر۔ جب آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی، کیونکہ باہر ٹمٹماتے بلب کا زرد چہرہ رات کی تاریکی میں صحت مند و توانا دکھائی دینے لگا تھا۔

اب اپنے کیے پر پچھتایا۔ دن بھر سو کر گزار دیا — تو رات کیسے بتاؤں گا؟ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا۔ عین اس مشکل میں ایک شاعر کا مشورہ یاد آیا

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا

ایک چھوڑ کئی مشعلیں جلا ڈالیں، بیتے دلوں کی خوشگوار یادوں کو جھنجھوڑا۔ احباب کی رنگینیٔ محفل کو دمساز بنانا چاہا۔ وصل کی گھڑیوں کے ایک ایک لمحے کو طول دیا کہ

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے

لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ہر حسین یاد کو فیض کا یہ بند سنایا کہ

جس گھڑی رات چلے

جس گھڑی، ماتمی، سنسان سیہ رات چلے

پاس رہو

میرے قاتل! میرے دلدار! میرے پاس رہو!

لیکن کوئی نہ مانا، سنگِ گراں خود ہی اٹھانا پڑا۔ سوچا، بے کل ایسا ہی رہا شب بھر تو بیمار کہاں! مَیں سمجھا کہ شاید میری بے صبری ہے خام کاری کی دلیل — چنانچہ مَیں نے سپاہیانہ پھُرتی سے کمرِ ہمّت باندھی اور شاعرانہ وسوسوں کو پرے پھینک کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک دیوار سے شروع کرتا، لیکن دو ڈگ بھرنے کے بعد اگلی دیوار راستہ روک لیتی۔ راستے کو طویل بنانے کے لیے مَیں نے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹہلنا شروع کیا، لیکن کوئی خاص فرق نہ پڑا! چنانچہ مَیں نے پاؤں سے پاؤں ملا کر فرش کو ناپنا شروع کر دیا۔ چھٹی بار پاؤں کا انگوٹھا دیوار کو جا چھُوتا۔ مَیں نے نیند لانے کی خاطر اپنے آپ کو تھکانے کے لیے وہیں اُچھلنا شروع کر دیا۔ ایک بار کسی جنبش میں قوّتِ پرواز ذرا زیادہ آگئی تو سر چھت سے جا ٹکرایا۔ مَیں سر کو سہلاتا ہوا پھر کمبل پر بیٹھ گیا — نیند لانے کا یہ نسخہ کارگر نہ ہوا! چنانچہ جنرل فرمان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ذہنی مشین کو سوئچ آف (SWITCH OFF) کر کے سوچ بچار کے قویٰ کو معطّل کرنا چاہا لیکن بے حاصل۔

کر چکے آہِ سحر بھی نالۂ شب گیر بھی
ہم نے دیکھا چُوکتے یہ تیر بھی، وہ تیر بھی

دنیوی ٹوٹکوں سے سکون کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو دین کو آزمانا چاہا۔ سوچا نماز پڑھنی شروع کر دوں، پر کس وقت کی؟ لیکن جب جبینِ نیاز سجدہ ریزی کے لیے بیتاب ہو تو وقت کی کیا پابندی! وضو کے لیے سنتری کو آواز دی، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چیخا چنگھاڑا لیکن آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ سنتری کو متوجّہ کرنے کے لیے آہنی دروازے کو جھنجھوڑا، لیکن یہ بھی نے ناشنیدہ ثابت ہوئی۔ بھاری تالے کو لوہے کی سلاخوں سے ٹکرایا لیکن کوئی صدائے بازگشت باہر نہ پہنچی۔ وضو کے علاوہ صبح کا پیا ہوا پاؤ بھر خالص پانی بھی اب باہر نکلنے کو بیتاب

تھا لیکن جہاں دن کو کوئی نہ پوچھتا وہاں رات گئے کون گوش بر آواز ہوتا۔ مجبوراً میں نے سیم زدہ دیواروں پر ہتھیلیاں رگڑ کر تیمّم کی رسم پوری کی اور کمبل کے ایک ٹکڑے کو مصلّے کا رتبہ دے کر حالتِ قیام میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ کعبے کی سمت کے تعیّن کا مسئلہ بھی پیش آیا لیکن حل تلاش کرنا مشکل معلوم ہوا، 'چنانچہ کعبہ وہیں سرک آیا جبیں میں نے جہاں رکھ دی' کے مصداق اپنی دانست کے مطابق قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اندھیری رات کی گھمبیر تنہائی میں قیام طویل اور سجدے طویل تر ہوتے گئے۔ رکوع کے لیے کمر جھکاتا تو پہلے دل جُھک جاتا، سجدے کے لیے جبیں بچھاتا تو اٹھانے کو جی نہ چاہتا۔ نماز کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا جو مفہوم اس کال کوٹھڑی میں سمجھ میں آیا، کبھی کوئی خطیب، کوئی مفسّر، کوئی واعظ نہ سمجھا سکا۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو یوں محسوس ہوا کہ میرا خالقِ حقیقی تاریکی کے پردے میں میرے سامنے کھڑا ہے۔ مَیں نے مالکِ دو جہاں کے سامنے اپنی چھوٹی چھوٹی، حقیر و کمتر خواہشیں دعاؤں کی صورت میں پیش کر دیں۔ اس روحانی عمل سے دل کا بوجھ ہلکا ہوا، ذہن کی کدورتیں چھٹ گئیں، وسوسوں نے دامن چھوڑا، یادِ خدا کا ورد زبان پر جاری رہا۔

اب دیکھئے جو داغ کو وہ داغ ہی نہیں
سب رنگ چھوڑ چھاڑ کے یادِ خدا میں ہے

اگلے روز پھر مٹھّی بھر چاول اور چمچہ بھر دال نصیب ہوئی۔ کل کا تجربہ ابھی بھولا نہ تھا — لہٰذا ذوقِ سلیم نے کھانے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دی۔ لیکن پیٹ نے صدا دی "انسانِ خوددار و خوش ذائقہ! ذرا کچھ خیال میرا بھی۔ مَیں نے پیٹ کے اصرار پر ایک لقمہ زبان پر رکھا لیکن دانتوں کے نیچے چاولوں کی بجائے کنکر زیادہ محسوس ہوئے۔ کنکر اور دانت کے ہر تصادم پر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، لہٰذا نوالہ منہ میں رکھنے سے پہلے میں نے اس میں سے کنکر ٹٹولنے شروع کیے۔ پہلے دن کا سکور اکیس تھا، مَیں نے انہیں کمبل کی تہ تلے محفوظ کر لیا۔ دریہ مشق روزانہ جاری

رہی اور ذخیرہ میں اضافہ ہوتا گیا۔) اس سے دوہرا فائدہ ہوا۔ایک تو دانتوں کی مشقّت کم ہو گئی، دوسرے دُکھوں کے کنکر چُھلنے کے ساتھ پتھر کے کنکر چُننے سے وقت خوب کٹنے لگا۔

آدھ گھنٹے بعد مجھے پھر روئے زمین پر آنے کی دعوت ملی۔ مَیں نے پھر مناظرِ قدرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ پیپل کے پتّے جھڑتے دیکھے۔ اس پر جنگلی چوہے چڑھتے دیکھے غسل خانے کی منڈیر پر کبوتروں کو مصروفِ غٹرغوں پایا۔ اور صحن سے ایک فاختہ کو فکرِ آشیاں بندی میں تنکے اکٹھّے کرتے دیکھا۔ غلاظت کے ڈھیر سے کوّوں کو چاول چُنتے اور چیلوں کو تلاشِ گوشت میں اس پر جھپٹتے دیکھا۔ بس کچھ نہ پوچھیے ان عیّاش آنکھوں نے کیا کیا ضیافت اُڑائی۔ رستی بستی دُنیا کی ایک جھلک دیکھ لی اور پھر چوبیس گھنٹے کے لیے زیرِ زمین دفن!

○ ○

منکر نکیر

اسی سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی میں میرے پندرہ شب و روز گزر گئے۔ اس پندرھواڑے میں میرے قلب و نظر پر کیا گزری، یہ ایک طویل داستان ہے جس سے قاری کو دلچسپی کم کم ہوگی؛ البتہ انہی ایّام کا ایک واقعہ وارداتِ قلبی کے مظہر کے طور پر رقم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مَیں ایک رات حسبِ معمول نیم زندہ، نیم مُردہ، نیم خوابیدہ، نیم بیدار اپنی قبر میں لیٹا تھا کہ ہوائی جہازوں کی لڑائی کا شور سُنائی دیا۔ ایک جہاز دوسرے جہاز کا تعاقب کرتا اور تیز چھُری کی طرح فضا کو چیرتا ہوا گزر جاتا۔ دوسرا جہاز پہلو بچا کر اپنے حریف پر راکٹ برساتا۔ گٹ گٹ گٹ ... ترڑ، ترڑ، ترڑ، ٹھا، ٹھا۔ اسی ہوائی معرکے میں چند جہاز گِرنے اور تباہ ہونے کی آواز آئی۔ پتہ چلا کہ بھارت اور چین کی جنگ چھِڑ گئی ہے۔ بنگلہ دیش کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ چینی ہوائی جہاز کلکتہ پر پے درپے حملے کر رہے ہیں اور بھارتی فضائیہ مدافعت کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ اتنے میں بجلی کڑکی۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ خواب کا طلسم ٹوٹ گیا؛ البتہ گڑگڑاہٹ متواتر کانوں کے پردوں پر دستک دیتی رہی۔ یا اللہ! کیا عالمِ بیداری میں بھی خواب کی سی کیفیت ہے؟ ذہن پر زور دینے اور حسِ سماع کو تیز تر کرنے سے پتہ چلا کہ موسمِ سرما کے بادل گرج رہے ہیں ضرور بجلی بھی چمک رہی ہوگی۔ لیکن بھارت کے خرمن پر برق گرنے کا امکان بعید از حقیقت ہے ـــــ تحت الشعور بھی کیسے کیسے لایعنی خواب تراشتا رہتا ہے۔

جنوری کے انہی ایّام میں میری ایک دیرینہ بیماری جاگ اٹھی جس سے خاصا فائدہ ہوا۔ ئیں نے تو اس دورِ ابتلا میں دانۂ اسپند بننا پسند نہ کیا، لیکن گُردے کا درد تڑپ اٹھا۔ اس کے لیے دوا دارو تو درکنار، پانی کی بکثرت آمد و رفت بھی جو پرہیزی علاج کا لازمی حصّہ سمجھی جاتی ہے، بند ہو گئی تھی۔ دردِ گردہ کہیں رات کے پچھلے پہر اُٹھا۔ ئیں پہلے درد سے کراہتا اور پھر چلّاتا رہا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بہت بال و پر پھڑپھڑائے، بہت سر دیوارِ زنداں سے ٹکرایا، لیکن دیوار ٹُوٹی نہ سر پھُوٹا۔ خود ہی دلِ ناتواں نے ہمّت ہار دی۔ جب آنکھ کھُلی تو ئیں ہسپتال کے ایک صاف ستھرے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ پلاسٹک کی ایک نلکی ناک میں اٹکی ہوئی تھی۔ اور پہلو میں ایک میز پر کچھ ایمرجنسی دوائیاں اور اوزار رکھے تھے، لیکن ڈاکٹر مجھے انجکشن وغیرہ دے کر کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ صرف چار گورکھے سپاہی سنگینیں تانے سرہانے اور پائنتی کھڑے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے سیکورٹی کی ضروریات کو نظر انداز کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ "تم سی۔ ایم۔ ایچ کلکتہ میں ہو۔ تمہیں شدید تکلیف کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ لیکن اب تم خطرے سے باہر ہو۔ ئیں نے ان (انٹلی جینس کے عملہ) کو کہہ دیا ہے کہ یہ قیدی مزید زدوکوب برداشت نہیں کر سکے گا، اس لیے تم حوصلہ رکھو۔ اب تمہارے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے گا۔" یہ انسان دوست ڈاکٹر چکرورتی تھا اور دشمن ہونے کے باوجود میرے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر چکرورتی نے مجھے ہسپتال میں داخل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سیکورٹی والے نہ مانے۔ دراصل جب ئیں نے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر کو غیر حاضر پایا، تو ہسپتال کے دوسرے حصّے میں یہی تکرار جاری تھی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ سیل میں مریض کی حالت بدتر ہو جائے گی اور سیکورٹی والے کہتے تھے کہ یہی ہمارا مطمحِ نظر ہے۔ بہرحال مجھے پھر سیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر

وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

البتّہ ڈاکٹر کی سفارش سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ میرے سیل کے تین دروازوں میں سے،

سب سے اندرونی گیٹ کو تالہ نہ لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ باقی دروازے حسبِ معمول سر بستہ رہے۔ اس کے علاوہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار روئے زمین پر آنے کی بجائے دو بار مشاہدۂ قدرت کی اجازت مل گئی۔ گویا اب میں غروبِ آفتاب کے بعد تاروں بھری رات بھی دیکھ سکوں گا۔ ان مراعات سے اتنا مرعوب ہوا کہ شاہانِ روم و عجم کی داستانِ فیّاضی بھول گیا۔

جنوری کے آخر میں دو تقریبیں شانہ بشانہ آگئیں۔ ۲۶ جنوری کو حاکموں کا یومِ جمہوریہ تھا اور ۲۷ جنوری کو محکوموں کی بقرعید۔ ۲۶ جنوری کے جشن کے ہنگاموں کی گونج تو بہت واضح تھی؛ البتّہ عید کی آمد کا اندازہ مجھے صرف مینو (MENU) میں تبدیلی دیکھ کر ہوا۔ اس روزِ سعید ایک مُٹھی چاول کی بجائے دو مُٹھّی چاول دیے گئے، چاولوں کے ہمراہ دال کی بجائے پیاز کا شوربہ ترکاری کی قائم مقامی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اور اس پر طُرّہ یہ کہ ساتھ ہی ایک لیمو بھی تھا، اگرچہ اس کی صورت ذرا کملائی ہوئی تھی۔ لیکن ہاف بوائلڈ چاولوں کو ہضم کرنے میں ضرور معاون ثابت ہو سکتا تھا؛ چنانچہ مَیں نے اسے شدید ضرورت کے وقت کے لیے محفوظ کر لیا۔ شام کو دال چاول کے عادی معدے میں پیازوں کی موجودگی سے گڑگڑاہٹ ہوئی تو مَیں نے لیمو کا سہارا لیا۔ اس کا جامہ اُتارا تو جس کو میں لیمو سمجھا تھا، گھٹیا نسل کا مالٹا نکلا۔ یعنی عید سعید کے مینو میں فروٹ بھی شامل تھا۔ مالٹا کو یادگار کے طور پر پاکستان لانے کے لیے کئی دن اپنے پاس رکھا لیکن ستم ہائے روزگار سے سوکھ کر یہ بالکل کشمش بن کر رہ گیا اور اگر یہ مزید دو سال کی صعوبتیں جھیلتا تو شاید اور سُکڑ کر خالِ رُخِ یار سے بھی خفیف ہو جاتا۔

پلیٹ دھونے باہر نکلا تو نلکے کے پاس ایک آدمی نظر آیا۔ چہرہ غریبانہ، لباس فقیرانہ لیکن جب اس نے بات کی تو نہایت مخلصانہ۔ اس نے پانی پینے کے بہانے جھک کر منہ میرے کان سے لگایا اور کہا "صاب، عید مبارک ہو۔ میرا نام فضل کریم ہے۔ مَیں ادھر سویلین ڈرائیور ہوں۔ عید ملنا چاہتا تھا، لیکن وہ (ہندو) دیکھ رہے ہیں۔ خدا حافظ۔" اس نے

سنتری کی طرف دیکھا جو اپنے ساتھی سے گپ ہانک رہا تھا اور پیچھے مڑے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں نے روزِ عید نہایت درد و کرب میں گزارا، اس لیے نہیں کہ وطن میں احباب گلے مل رہے ہوں گے، نونہالانِ چمن جوبن پر ہوں گے اور مٹیاریں پیلی پیلی اوڑھنیاں لیے جھولے جھول رہی ہوں گی اور میں ان مناظر سے سینکڑوں میل دُور زندہ درگور ہوں، بلکہ قلق اس بات کا تھا کہ یہ عید سقوطِ ڈھاکہ کے چند ہفتے بعد آئی تھی اور پتہ نہیں کیوں خوشی کے موقع پر میرے زخمِ جگر اور ہرے ہو جاتے ہیں۔

مرے وطن! ترے دامانِ تار تار کی خیر!!

قومی المیے کے پیشِ نظر ذاتی رنج والم کی اہمیت "اس بحرِ موج خیز میں تم تو حباب ہو" کے مصداق تقریباً ختم ہو چکی تھی، بلکہ ہوا کا ایک تھپیڑا اس بلبلۂ آب کو معدوم بھی کر دیتا تو بحرِ موج خیز میں کوئی فرق نہ آتا۔ میں دوسرے پاکستانیوں سے زیادہ حبِ وطن کا دعویدار نہیں، لیکن یقین کیجئے ارضِ پاکستان کی قدر و منزلت کا جو احساس اس کال کوٹھڑی میں ہوا عام حالات میں شاید کبھی نہ ہوتا۔ پاکستان! میرا پاکستان!! میرے جگر کی طرح دو نیم پاکستان!!!

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد آج پہلی بار جی بھر کر رویا۔ آج پھر دُودِ چراغِ کشتہ آنکھوں سے اُبلنے لگا، لیکن آج یہ آنسو ماتم یا نوحہ گری کے نہ تھے، بلکہ تاسف اور حسرتِ تعمیر کے آنسو تھے۔

ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر!

اب زنداں میں مجھے ایک مہینہ ہونے کو تھا۔ اس عرصے میں نہ نہا سکا نہ کپڑے بدل سکا۔ اپنا چہرہ تو دیکھ نہ سکتا تھا لیکن کپڑے میل کے ہاتھوں اپنا اصلی رنگ روپ کھو چکے تھے۔ جسم پر جا بجا مچھروں اور کھٹملوں کی چیرہ دستیوں کے واضح نشان تھے۔ جہاں مچھروں کی رسائی نہ تھی وہاں جلد متواتر کھجلی کرنے سے خراب ہو چکی تھی۔ داڑھی اور سر کے بال ایسے

سرکش ہوئے تھے کہ بیٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ شاعر نے تو قیدِ تنہائی میں لوح و قلم چھن جانے پر انگلیاں خونِ دل میں ڈبو کر حدیثِ دل رقم کرنے کی رسم نکالی تھی لیکن میرے لیے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور بڑھے ہوئے ناخنوں کا بہترین استعمال یہ تھا کہ میں ان سے بالوں میں کنگھی کرتا رہوں۔ بلاشبہ یہ مشغلہ غیر شاعرانہ سہی، لیکن ایک اہم ضرورت پوری کرتا تھا؛ چنانچہ میں پہروں داڑھی اور سر کے گندے اور گنجان بال زور زور سے کھجاتا رہتا۔ اس کارروائی میں آرام کا پہلو جو تھا سو تھا، یہ تضیعِ اوقات کا اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔

انہی دنوں انٹیلی جنیس کا ایک ادنیٰ ملازم آیا اور مژدۂ جانفزا لایا کہ چلو اپنی جمع شدہ چیزوں میں سے شیو کا سامان لے آؤ۔ گویا بھارت کے بحرِ جود و سخا میں طغیانی آگئی تھی۔ فوراً فائدہ اٹھایا۔ ساتھ والے احاطے میں جا کر شیو کے لوازمات نکال چکا تو آنکھ بچا کر ایک آدھ کتاب بھی ساتھ لانے کو نکال لی۔ لیکن چوری پکڑی گئی اور کتاب ہمیشہ کے لیے ضبط ہو گئی۔

سیل میں واپس آ کر پہلی بار شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو دہشت سے کانپ اٹھا؛ ناک اور داڑھی کے بال بے تحاشا پھیل چکے تھے۔ سر کی کھیتی جنگلی جھاڑیوں کی طرح اُلجھی ہوئی تھی۔ بالوں میں جگہ جگہ سفیدی آ چکی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں بے رنگ پہاڑوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد پیچ در پیچ سیاہ حلقے سیاہ بختی کی پوری پوری غمازی کر رہے تھے۔ یارب! تیری بنائی ہوئی صورت اتنی بے ڈھب اور بھیانک بھی ہو سکتی ہے؟ ایسے قیدی تو میں نے پاکستانی جیلوں کے بدترین مکینوں میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ بہر حال نیم تاریک کوٹھڑی میں کچھ بلیڈ کی مدد سے اور کچھ زورِ بازو سے اس فصلِ زائد کی قطع و برید شروع کی۔ دوسری تیسری کوشش میں چہرے کی جلد تک پہنچا۔ بالآخر ہونٹ، کان، ناک، گال اور آنکھیں اپنی اپنی جگہ پر قابلِ شناخت نظر آنے لگیں؛ اگرچہ مجھے پہلے بھی کبھی یوسفِ ثانی ہونے کا زعم نہ تھا، لیکن اب بیدِ مجنوں سے بھی بدتر ہو چکا تھا۔ اک چاند تھا جو گہنا گیا، اک پھول تھا جو مرجھا گیا۔

بھارتی لطف و عنایات کا دور چلا تو اگلے روز ایک اور کارندہ کپڑے دھونے کا صابن لے آیا۔ ایک اِنچ لمبا، ڈیڑھ اِنچ چوڑا۔ ساتھ ترکیبِ استعمال یہ بتائی کہ سامنے غسل خانے میں چلے جاؤ، اسی ٹکڑے سے نہالو اور کپڑے بھی دھولو۔ میں وفورِ شوق میں نکل پڑا تو خیال آیا کہ کُرتہ پاجامہ دھو ڈالا تو کیا پہن کر نکلوں گا، چنانچہ اسی کارندے کے لطفِ خاص سے کمبل کا ایک ٹکڑا ساتھ لے لیا۔ غسل خانے میں جا کر جسم و جاں اور جامہ و پیرہن کو بیک وقت بھگو ڈالا، لیکن صابن تھا کہ خیالِ یار کی طرح پھسل پھسل جاتا اور میل تھا کہ رقیبِ روسیاہ کی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ میری اس مصروفیت کے دوران غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اندر دُھلائی کی مشقّت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری تھی۔ باہر پہریدار تک شعر گنگنانے کی آواز پہنچی تو اس کی رگِ فرض شناسی پھڑکی۔ وہ چلّایا "گانا وانا بند کرو، تمہارا ٹیم ختم ہونے والا ہے۔ جلدی کرو۔" اس حکم کے مضمرات میں یہ اعتراف بھی تھا کہ یہاں اور بھی پاکستانی قیدی ہیں جن کا ٹیم ابھی شروع ہونا ہے۔ اہلِ وطن کی موجودگی کا قیافہ میں نے کئی روز پہلے بھنگی کی بالٹی سے لگایا تھا جو کبھی آدھی اور کبھی دو تہائی بھری ہوتی تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ ساری دولت میری ذاتِ واحد کیلئے نہ تھی، اور بھی اس میں حصہ دار ہوں گے۔ آج اس فرض شناس پہریدار نے اس قیافے کی تصدیق کر دی۔

میں غلیظ کمبل اوڑھے، گیلے کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے غسل خانے سے سیل کو جانے لگا تو ساتھ والے سیل کے باہر تام چینی کی بجائے اصلی چینی کی سفید مستعملہ پلیٹ، چمچ اور گلاس نظر آئے۔ برتنوں کی اعلیٰ نسل سے اندازہ ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ یعنی سیل نمبر ۱ میں کوئی وی آئی پی ہے۔ یہ میجر جنرل جمشید تھے، جن کی کمی فورٹ ولیم میں محسوس کی گئی تھی۔ ڈھاکہ کے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے ان پر ایک تہمت یہ بھی تھی کہ ۱۶ دسمبر کو دانشوروں کا قتل ان کی منصوبہ بندی اور احکام کا نتیجہ تھا۔

گزشتہ دو روز سے میری خاطر مدارات کا جو دور شروع ہوا تھا اس کی وجہ تیسرے

روز ظاہر ہوئی۔ یہ ساری تیاریاں مجھے منکر نکیر کے سامنے جانے کے لیے تھیں یعنی اب مجھ سے پوچھ گچھ کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ پہلا مہینہ تو صرف ذہنی طور پر مغلوب کرنے کے لیے وقف تھا؛ چنانچہ مَیں دو رائفل بردار سپاہیوں سمیت ملحقہ احاطے کے ایک دقیانوسی کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ اس کی ابتر حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ایک گھٹیا قسم کا دفتر ہے جہاں گھٹیا آدمی بیٹھ کر گھٹیا ذرائع سے قیدیوں سے معلومات اخذ کرتے ہیں۔ مجھے سویلین کپڑوں میں ملبوس منکر و نکیر کے سامنے بٹھا دیا گیا، اگرچہ وہ سویلین بنتے تھے لیکن درحقیقت فوجی افسر تھے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

اُس طرف سے ابتدا یوں ہوئی "ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تم چند ایک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھرڈ ریٹ ہتھکنڈوں کے متحمّل نہیں ہو سکتے، لہٰذا تمہارے اپنے مفاد میں ہے کہ جو کچھ پوچھا جائے بلا تامّل بتاتے جاؤ.... ورنہ ان کال کوٹھڑیوں سے آج تک کوئی زندہ باہر نہیں نکلا۔ تمہیں ابھی نہ جنگی قیدی نمبر الاٹ ہوا ہے، نہ کسی فہرست میں تمہارا نام ہے، تم ہمارے رحم و کرم پر ہو، اگر تم نے تعاون نہ کیا تو یہیں گل سڑ جاؤ گے۔ سمجھے! ہونہہ!!"

مَیں نے لقمہ دینے کی کوشش کی کہ "جنیوا کنونشن ایسی دھمکیوں کی اجازت نہیں دیتا۔ تمہارے ہی جنرل ناگرا نے ڈھاکہ میں ....." اس نے مجھے فقرہ مکمّل نہ کرنے دیا اور کہا "بھُول جاؤ جو کچھ جنرل ناگرا یا کسی اور نے تم سے کہا تھا، یہاں کوئی جنیوا کنونشن نہیں، تم اس وقت ہماری مُٹھّی میں ہو اور ہم ہر طرح تم سے زیادہ سے زیادہ معلومات اخذ کریں گے، اگر سیدھی طرح نہیں تو....." اس کے بعد پھر دھمکیوں کی فہرست سُنا دی گئی۔

اس تمہید کے بعد کئی بامعنی، اکثر بے معنی اور چند ایک ذومعنی سوالات پوچھے گئے۔ کبھی مائل بہ کرم ہو کر، کبھی مائل بہ ستم ہو کر۔ میرے پاس کون سے رازہائے سربستہ تھے جن کے

انکشاف سے پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچتا؛ چنانچہ میں نے ڈھاکہ میں اپنی صحافتی مصروفیات کے متعلق صحیح صحیح جواب دیے۔ جہاں بات فوجی نوعیت کے معاملات پر پہنچتی، مَیں معذرت کر دیتا لیکن یہ طرزِ تکلّم تو شرفاء کا تھا، لہٰذا بھارتی افسروں کو قطعاً نہ بھایا۔ انہوں نے میری قوّتِ مدافعت کو مزید تحلیل کرنے کے لیے پھر سیل میں ڈال دیا۔ ہر دسویں پندرھویں دن بُلا لیتے اور پُوچھ گچھ اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد پھر زندہ درگور کر دیتے۔ پوچھ گچھ کے دوران ان کا زور تین باتوں پر تھا۔ اوّل یہ کہ ڈھاکہ میں مارے گئے دانشوروں کے ناموں کی فہرست تیّار کرنے کا اعتراف کروں اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کروں کہ یہ فہرست تیّار کرنے کا حکم مجھے جنرل جمشید نے دیا تھا یا کسی اور نے۔ دوئم ۱۶ دسمبر کے بعد ڈھاکہ میں مکتی باہنی والے تمہارے خون کے پیاسے تھے، لہٰذا تمہیں بذریعہ ہوائی جہاز کلکتہ لانا پڑا۔ یہ کون سے سنگین جرائم تھے، جن کی وجہ سے مکتی باہنی نے تمہیں اتنی اہمیت دی؟ سوئم یہ کہ تم افسر تعلّقاتِ عامّہ کی حیثیت سے جنرل نیازی کے بہت قریب رہے ہو، ان کے خیالات، احکامات اور مصروفیات کی تفصیلات بتاؤ۔

وہ تقریباً ہر نشست میں انہی تین باتوں پر اصرار کرتے، مَیں ان میں سے کسی کا اقرار نہ کرتا، لیکن اس کج بحثی میں اس لحاظ سے ان کا پلّہ بھاری تھا کہ

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرے

پتہ نہیں ان طویل مذاکرات میں انہوں نے کیا پایا، کیا کھویا، لیکن مجھے یہ وقت سیل سے باہر گزار کر خاصی راحت ہوتی۔ کیا ہوا جو مخاطب ہندو یا سکھ تھے، حیوانِ ناطق تو تھے — موضوعِ سخن بھی تلخ سہی، ہمکلامی کا بہانہ تو تھا۔ ورنہ پھر وہی سیل نمبر ۱۰ تھا، جہاں وہی بارِ ستم، وہی بارِ کہسارِ غم سہنا پڑتا۔ جسمانی فرار کی کوئی راہ تھی نہ ذہنی سکون کی کوئی سبیل۔ سیل میں پڑے پڑے دل بہلانے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں سیم زدہ دیوار کے نقش و نگار پر مرکوز کیں تو وہاں عجیب و غریب مناظر نظر آئے۔ کہیں دو ٹینک ٹکراتے معلوم

ہوتے، کہیں بھاری توپ کا طویل دہانہ دکھائی دیتا۔ کہیں انسانی کھوپڑیاں بکھری ملتیں اور کہیں پھولوں کی بکھری ہوئی پتّیاں۔ پتہ نہیں یہ نقش دیوار سے اُبھرتے تھے یا میرے ذہن سے، یہ ذریعۂ تسکین بننے کی بجائے حُزن و یاس کا باعث بنے۔ مَیں نے ان سے توجّہ ہٹالی۔

اب مَیں نے کمبل کے نیچے رکھے ہوئے کنکر گننے شروع کر دیے۔ ایک، دو، تین . . . .

دس، پندرہ، بیس، چالیس، ساٹھ، ستّر . . . ان کی مجموعی تعداد چھیاسی نکلی۔ مَیں نے دانستہ طور پر اس ہندسے کو غلط قرار دے کر دوبارہ کنکر شماری شروع کر دی۔ اب یہ چھوٹے بڑے ملاکر اُناسی ہوئے۔ میرے شکّی ذہن کو ایک بار پھر گننے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو یہ صرف پچاسی نکلے۔ اس حساب کتاب سے تنگ آگیا تو جلد ہی چھت کی کڑیاں، فرش کی اینٹیں، دروازوں کی سلاخیں، تالے کے کیل، کمبل کے سوراخ اور پلیٹ کے داغ گنتا رہا ——— لیکن اتنی محنت کے باوجود رفتارِ زمانہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

مَیں روز کے اس معمول سے اُکتا گیا تو اللہ تعالٰے نے چیونٹیوں کا ایک قافلہ بھیج دیا۔ قطار اندر قطار۔ مَیں انہیں گننے لگا۔ پنتیس ایک سمت میں جا رہی تھیں اور اکتالیس دوسری جانب۔ ان میں سے اٹھارہ کے منہ میں زادِ راہ تھی اور باقی خالی الذہن۔ چلو دس منٹ چیونٹیوں کے طفیل گزر گئے۔

فروری کی کوئی شُبھ گھڑی تھی، مَیں سیل میں بیٹھا کبھی فرش کی اینٹیں گنتا، کبھی چیونٹیاں، اتنے میں کسی نے مقفّل دروازے کے باہر والا کواڑ کھول دیا ——— اور پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی جھٹ سے اسے بند کر دیا۔ ان چند لمحوں میں میری نگاہیں ایک ہی چھلانگ میں صحنِ زنداں میں پہنچ گئیں جہاں سرما کی اُجلی دھوپ کا چمنستان جوبن پر تھا۔ کیمرے کی آنکھ کی طرح میری نگاہوں نے بھی یہ خوش منظر ایک لمحے میں محفوظ کر لیا۔ اس منظر کو ایک بار پھر دیکھنے کی زبردست خواہش نے انگڑائی لی، لیکن کواڑ بند ہو چکا تھا ——— کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اُجلی دھوپ دیکھ سکتے ہیں اور کوئی ان کی آنکھوں کے سامنے کواڑ بند نہیں کرتا!

اِدھر نمازیں برابر جاری تھیں، دعائیں متواتر مانگی جا رہی تھیں۔ قیام میں، سجود میں، رٹی ہوئی عربی دعائیں جواب دے جاتیں تو اللہ تعالےٰ تک مدعائے دل سلیس اُردو میں پہنچانے کی کوشش کی جاتی۔ پھر بھی تسلّی نہ ہوتی تو مثالیں دے کر ضرورت واضح کی جاتی کہ اے باری تعالےٰ! جس طرح تُو نے ڈھاکہ میں مکتی باہنی کے چُنگل میں جانے سے بچا لیا، اب اس کال کوٹھڑی سے نجات دلا۔ ترا احسان ہوگا۔ جب متواتر کئی روز تک دعائیں عرشِ بریں تک رسائی نہ پا سکیں تو سمجھا کہ شاید

عشق ہے میرا خام ابھی، جذبہ ہے ناتمام ابھی

بہر حال اسے دعاؤں ہی کا اعجاز سمجھئے کہ چند روز بعد گارد کمانڈر اور بھنگی کے ہمراہ دال اور چاول کی بالٹیاں اٹھائے ایک شخص داخل ہوا۔ اس کا رنگ گورا چِٹّا، نقش پٹھانوں جیسے اور چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیں۔ میں نے اس کی خاکی جرسی دیکھ کر پہچان لیا کہ پاکستانی سپاہی ہے جسے بیگار کے لیے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ سچ کہتا ہوں اتنے عرصے بعد خاکی جرسی دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی جیسے پاکستان کا پرچم ستارہ و ہلال دیکھ لیا ہو۔ یہ کالا باغ کا رہنے والا سپاہی شریف تھا۔ کسی مصیبت زدہ افسر کے ساتھ بطورِ اردلی آیا، افسر کو پتہ نہیں کس کالے کنوئیں میں پھینک دیا گیا اور شریف تا حکمِ ثانی یہیں رہ گیا۔ مجھے اور سپاہی شریف کو بات کرنے کی سخت ممانعت تھی، لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ لب کشائی پہ قدغن زیادہ بارِ خاطر نہ ہوئی۔ گارد کمانڈر نے اپنا رعب جماتے ہوئے کہا "ایک چمچہ دال ڈالو اور باہر نکلو"۔ یہ حکم غیر ضروری اور بے وقت تھا لیکن اس پر میں یا شریف سیخ پا ہوتے، تو شاید پھر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتے، چنانچہ شریف آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب شریف تقریباً روز دال بانٹنے آنے لگا، سنتری اور بھنگی سے بھی اس نے کچھ راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ مجھ سے بھی حجاب کچھ کم کم ہونے لگا۔ ایک روز دال ڈالتے ڈالتے سرگوشی

میں کہہ گیا "سر! فکر مت کرو، ادھر چھ افسر اور ہے"؛ اگلی بار آیا تو ان میں سے بعض کے نام بھی بتا گیا۔ تیسری بار ذرا مہلت پائی تو کہنے لگا "گیارہ نمبر والا قیدی (جنرل جمشید) کہتا ہے، سب کو بتا دو، میں اِدھر ہی ہوں، کوئی فکر نہ کریں، دیکھو صاحب اس کے ادھر ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بھی قیدی، ہم بھی قیدی، ہم تو پھر ایک کی بجائے دو چمچہ دال دے سکتا ہے، وہ کیا کر سکتا ہے۔ بس جب جاؤ لکڑی (خالی پائپ) منہ میں لیے مسکراتا رہتا ہے"۔ شریف کو علم نہ تھا کہ وہ جنرل صاحب ہیں) گارد کمانڈر نے باہر کھڑے باتوں کی آواز سُنی تو بھونکا "بکواس بند کرو اور باہر نکلو"۔ اس وقت تو شریف باہر چلا گیا لیکن اگلے روز کسی اور مسئلے پر گارد کمانڈر سے جھگڑ پڑا۔ اس کی غصیلی آواز مجھے سیل کے اندر بھی سُنائی دے رہی تھی "خبیث کا بچّہ! سو دفعہ کہا، کھولو۔ پیشاب کرنا ہے، یہ لاٹ صاحب کھولتا ہی نہیں ہے۔ ہم تُم کو دیکھے گا۔ قید ہونے کا کبھی ہمارا باری، کبھی تمہارا۔ تم ہم کو آٹھ آٹھ پہر نہیں نکالتا ہے، جب ہمارا باری آئے گا تو ہم تم کو سولہ پہر نہیں کھولے گا۔ کافر کا بچہ۔" پتہ نہیں گور کھالی اور ہندی پر اکتفا کرنے والے بھارتی نائک کی سمجھ میں کیا آیا اور اس نے جواباً کیا کہا، لیکن شریف کی گرجدار آواز پھر سُنائی دی "کافر کا بچّہ! بتاؤ ادھر ہم کو کیوں بند کر رکھا ہے؟ ہم نے کوئی قتل کیا ہے؟ ڈاکہ ڈالا ہے؟ ہماری طرف (پاکستان میں)، تو تین سو دو (دفعہ ۳۰۲ تعزیراتِ پاکستان) والے کے ساتھ بھی یہ سلوک نہیں کرتے۔ ہمارا باری آنے دو، ہم تم کو مزہ چکھائے گا، خبیث کا بچّہ!" بعد کی پکڑ دھکڑ سے اندازہ ہوا کہ چند سپاہیوں نے مل کر اسے سیل میں بند کر دیا ہے۔

تین ماہ کی اس قیدِ تنہائی کی باقی صعوبتیں اپنی جگہ، لیکن ایک اذیت جس کا کوئی حل نہ ملا، وہ یہ تھی کہ پڑھنے کے لیے کچھ نصیب نہ ہوا — قرآنی آیات کا زبانی ورد کرتے کرتے زبان سُوکھ گئی، لیکن اس سے آنکھ کی پیاس بُجھی نہ ذہن کی بُھوک ختم ہوئی۔ مَیں نے اپنے سامان سے کتابیں لانے کی اجازت مانگی تو اسے قیدِ تنہائی کے ضوابط کے خلاف قرار دیا گیا۔

اس محرومی میں پہلی بار احساس ہوا کہ بُری عادتوں میں شراب یا سگریٹ نوشی ہی نہیں، مطالعے کی لت بھی ہے اور جس شخص نے اپنی ساری شعوری زندگی میں کھانے کا ناغہ تو گوارا کر لیا ہو لیکن مطالعے کا نہیں، اس کے لیے متواتر کئی ماہ کتابوں سے محرومی کتنی سوہانِ روح ہو سکتی ہے! اس سے قاری کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں بڑا عالم و فاضل ہوں اور عام زندگی میں بھی ہر وقت ذاتی یا پبلک لائبریری میں دفن رہتا ہوں۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں، فقط یہ کہنا مقصود ہے کہ جب تک کچھ پڑھ نہ لُوں، کھانا ہضم نہیں ہوتا، جب تک کتاب کی ورق گردانی نہ کر لُوں، نیند نہیں آتی، گویا ایک قسم کا نشہ ہے، ایک لت ہے اور ہر لت قیدِ تنہائی میں لعنت بن جاتی ہے۔

لیکن قدرت بھی بڑی کارساز ہے۔ ایک روز میں پلیٹ دھونے باہر نکلا تو نل کے پاس کسی بھارتی سپاہی کا پھینکا ہوا لائف بوائے صابن کا کاغذی پیرہن نظر آیا۔ اسے پلیٹ مانجھنے کے بہانے اٹھا لیا اور نہایت چالاکی سے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ بیت الخلا میں داخل ہوا تو وہاں رَم○ کی خالی بوتل پڑی تھی۔ بیشک بوتل سر بریدہ تھی لیکن اس کے سینے پر لیبل ابھی چسپاں تھا۔ میں نے اسے گیلا کر کے اُتار لیا اور صابن کے پیرہن سمیت اس متاعِ بے بہا کو بھی اپنے سیل میں ساتھ لے آیا۔ جب مطالعے کی بھوک چمکی تو میں نے رم کا لیبل نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ "بھارت میں ساختہ ــــ مسلّح افواج اور سنٹرل پولیس کے افراد کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ منظور شُدہ کنٹین کے علاوہ کہیں اور اس کی خرید و فروخت قابلِ تعزیر جرم ہے۔" میں نے یہ لیبل بار بار پڑھ کر گزر اوقات کی اور شدید خواہش کے باوجود لائف بوائے والا کاغذ اگلے روز کے لیے رکھ چھوڑا ــــــ بیشک اسلام اسراف کی اجازت نہیں دیتا۔

گارڈ کمانڈر جو گزشتہ چند ماہ سے اپنی کمینگی اور خباثت کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا، ایک شام مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اس عنایت ناگہانی

○ رم بھارتی ساخت کی دیسی شراب ہے جو فوجیوں کو راشن میں ملتی ہے۔

کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی، لیکن اس گفتگو کو اپنی مجبوریوں کے پیشِ نظر غنیمت جانا، حوصلہ افزا جواب دیا اور بات چل نکلی۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تم نے نیپالی ہو کر یہ اُردو کہاں سے سیکھی؟ کہنے لگا "مَیں اردو نہیں جانتا، مَیں تو ہندی بول رہا ہوں جو انڈیا میں سب فوجیوں کو سکھائی جاتی ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے فوجی کارنامے بتانے شروع کیے "مَیں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اٹاری سیکٹر میں تھا۔ ہمارے صاب نے کہا تھا تم لوگوں کو لاہور دکھائیں گے۔ وہ ہمیں واہگہ تک لے گئے، لاہور سامنے نظر آتا تھا، لیکن لاہور پہنچنے میں تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ آگے بی آر بی نہر آگئی۔" "بی آر بی یا پاکستانیوں کا آہنی عزم؟" وہ لاجواب ہو گیا یا میری بات نہ سمجھا۔ بہر حال پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ "گڈ نائٹ، سر!" کہہ کر چلا گیا۔ مڑ کر کہنے لگا: "سر! کہو تو آدھا کواڑ کھُلا رہنے دوں۔ ہمارا کوئی افسر آئے گا تو بند کر دوں گا۔" اس نے بالواسطہ طور پر مجھے اپنے اختیارات سے آگاہ کر دیا۔

مجھے اس التفات کی وجہ اگلی صبح معلوم ہوئی۔ بھنگی سمیت شریف دال بانٹنے آیا تو اس نے دو سوکھی چپاتیاں میرے سپرد کرتے ہوئے خوشی سے کہا "صاب! مبارک ہو، سُنا ہے تاشقند ہو گیا ہے۔ اب ہم لوگ ادھر سے جا رہے ہیں۔ راستے کے سفر کے لیے یہ روٹیاں ہیں۔" میں نے چپاتیاں غور سے دیکھیں تو ان پر چٹنی نما کسی سبزی کا داغ بھی تھا۔ بھارت کا مہمان بھلا رُوکھی روٹی کیسے کھائے گا! ــــ مَیں یہ خبر سُن کر اتنا خوش ہوا کہ گویا کسی کیمپ میں نہیں پاکستان جا رہا ہوں۔ یا اللہ! تُو نے مٹّی کے اس کیڑے کی سُنی، اس بلیک ہول سے نکالا ــــ الحمدللہ۔ روانگی سے پہلے ہمیں قیمتی چیزیں مثلاً نقدی، گھڑی، انگوٹھی وغیرہ چھوڑ کر باقی چیزیں لوٹا دی گئیں۔ مَیں اپنے کمبل لے کر سیل میں آیا تو رات والا گارڈ کمانڈر الوداع کہنے کے بہانے قریب آیا اور ملتجیانہ لہجے میں کہنے لگا "سر! انڈیا میں ولایتی کمبل نہیں ملتا، آپ کے پاس دو ہیں۔ ایک مجھے دے دیں، یاد رکھوں گا۔"

اب اس کی عنایت کا بھرم کھُلا اور اس ابتدائی تجربے کی تائید اسیری کے آئندہ دنوں

میں کئی بار ہوئی، جس کا حاصل یہ تھا کہ بھارتی مہربان ہو تو سمجھ لیجئے مطلب برآری کے درپے ہے۔ اور مادی منفعت اس کی کمزوری ہے۔ کوئی کمبل پہ بک جاتا ہے، کوئی گھڑی پر اور کوئی ٹرانزسٹر پہ۔ بھارتی سینا بکاؤ مال ہے، کوئی ہے خریدار؟

○ ○

نذرل سے غالب تک

مَیں اپنا سرمایۂ غم کمبل میں لپیٹے، زمین کے پیٹ سے نکلا، تو سب سے پہلے سورج کی کرنوں نے خوش آمدید کہا۔ یوں لگا کہ صحنِ زنداں میں دھوپ کے باغ و بہار چمنستان کو دیکھنے کے لیے مَیں ہی تڑپ نہیں رہا تھا، بلکہ خود حرارت بھری کرنیں بھی مجھ سے بغل گیر ہونے کیلئے بیتاب تھیں۔ زندگی کے جاڑے میں طویل فراق کے بعد سورج کی کرنوں سے ہمکنار ہونا ایک ایسا لطف تھا جو شاید وصلِ یار میں بھی نصیب نہ ہو۔ مَیں نے نیلگوں آسمان سے سنہری کرنوں کو جی بھر کر برستے دیکھا۔ نسیمِ بادِ بہاری کے بے دریغ بوسے لیے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کبوتروں کی غٹرغوں کے ترانے سُنے ——— "اِدھر اُدھر کیا دیکھتا ہے؟ باہر چل ہمارا صاب کھڑا ہے۔" سنتری نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں میری عارضی جنّت کا طلسم توڑ دیا۔ مَیں باہر نکلا تو ملحقہ احاطے میں پانچ پاکستانی فوجی افسر کھڑے تھے۔ کسی جان پہچان یا رسمی تعارف کے بغیر گلے ملنے لگے۔ درد کے تازہ رشتے نے کسی تعارف کا محتاج نہ چھوڑا تھا۔

ایک طرف سے سپاہی شریف لوہے کا ننھّا سا کالا سوٹ کیس اٹھائے آ نکلا۔ "صاب، میں بھی آپ کے ساتھ جا رہا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج اس کی باچھیں کِھلی ہوئی تھیں کہ اس کی تاشقند والی خبر درست نکلی۔ اگرچہ اس کو علم نہ تھا کہ ہم پاکستان جا رہے ہیں یا کسی کیمپ میں، لیکن سیل سے رہائی بجائے خود بہت بڑا واقعہ تھا۔

لیکن اس گروہ میں جنرل جمشید مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ شاید وہ ابھی تک دار و رسن کی آزمائش میں تھے۔ انہیں شریکِ سفر کرنے کو بہت جی چاہا، لیکن مجبوریوں نے بڑھ کر راستہ

روک لیا۔ ایک بھارتی کپتان سے ان کی رہائی کے متعلق پوچھا تو جواب ملا "وہ بھی بس جا رہے ہیں۔ تم لوگ عام کیمپ میں جا رہے ہو اور وہ خاص کیمپ میں"۔ دل نے اسے سراسر دروغ گوئی سمجھا، لیکن اعتبار نہ کرتے تو کیا کرتے! ان کے صبر و تحمل کے اعتراف میں زبان سے یہ شعر نکلا:

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
لیکن پھر بھی ہیں کہ جیئے جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ سے ان کے لیے اس آزمائش میں استقامت کی دعا کی اور انہیں خدا حافظ کہا۔

اتنے میں ایک فوجی ٹرک ہمارے پاس آکر رُکا۔ بھارتی کپتان اور اس کا عملہ، گارد کی ترتیب اور راہداری کے انتظام میں مصروف تھا۔ ہمیں اس وقفے میں درد کے باہمی رشتہ کو الفاظ کی شکل دینے کا موقع مل گیا۔ آیئے ان پانچ افسروں سے آپ بھی ملیے۔

مضبوط ڈھانچہ، مضبوط تر دل، بلند جبیں اور سرکش مونچھیں، یہ لیفٹیننٹ کرنل شعیب لودھی تھے جنہوں نے اس قیدِ تنہائی کا غالباً سب سے کم اثر لیا تھا۔ ڈھاکہ میں میری ان سے پہلے بھی راہ و رسم تھی۔ انہوں نے حسبِ عادت دائیں ہاتھ کی پوری ہتھیلی سے اپنی سرکش مونچھوں کو اور اونچا کیا اور نیچے سے مسکراتے ہوئے ہونٹوں نے کہا "کہو سالک! یہ تجربہ کیسا رہا؟" ان کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل اکبر تھے جو حرفِ ندا کی طرح سیدھے کھڑے زبانِ بے زبانی سے کہہ رہے تھے کہ چند ماہ تو درکنار، چند سال بھی تہ خانے میں رکھ کر دیکھ لو، یہ سر نگوں نہ ہو گا۔ لیفٹیننٹ کرنل امیر جو کرنل اکبر والے سیل ہی میں تھے "ہر چہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر" کی عمدہ مثال تھے۔ ان کے چہرے پر نفرت اور انتقام کا پَرتو تو تھا، لیکن اضمحلال کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان سب کو یوں باوقار دیکھ کر یہ شعر یاد آیا:

ہمیں سے سُنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کجکلہی

کرنل اکبر اور کرنل امیر کی بغل میں ایک کالے چیتھڑے کو میں نے تجسّس سے دیکھا کہ یہ کونسا خزینہ ہے جسے وہ یوں داغِ دل کی طرح سنبھالے ہیں۔ کہنے لگے کہ جنگ کے دوران میمن سنگھ سے ڈھاکہ آتے ہوئے جب ہم گرفتار ہوئے تو ہمارے پاس ایک جوڑا وردی کے سوا کوئی اثاثہ نہ تھا۔ یہ سیاہ چیتھڑا رومال وغیرہ نہیں بلکہ دھوتی ہے جو دورانِ اسیری ایک بھارتی بریگیڈیئر نے جنیوا کنونشن کے احترام میں رات کو پہننے کو دلوائی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا "انشاءاللہ یہ بھارتی تحفہ پاکستان لے جانے کا ارادہ ہے۔"

جاں نثاروں کے اس مختصر قافلے کے دوسرے دو افراد میجر سمیع اور میجر غفور تھے۔ میجر سمیع ڈیرہ غازیخاں میں پیدا ہوئے اور لاہور میں پرورش پائی، للہذا دونوں شہروں کی خوبیاں ان میں جمع ہوگئی تھیں۔ ڈیرہ کے سرداروں کی طرح وسیع الجثّہ اور وسیع القلب اور اہلِ لاہور کی طرح سُلجھے ہوئے اور ملائم دل۔ جنگ ختم ہونے پر یہ چٹاگانگ میں ہتھیار ڈالنے کی بجائے عازمِ برما ہوئے لیکن بارڈر سے ذرا اِدھر پکڑے گئے ——— ٹوٹی کہاں کمند! میجر غفور پیشے کے لحاظ سے توپچی اور جذبات وخیالات کے لحاظ سے گداز دل شاعر تھے۔ بیچارے جنگ شروع ہونے سے چند روز پہلے اپنی پوسٹ پر پہنچے تھے۔ ابھی پوری طرح بال و پر بھی نہیں اُگے تھے کہ اسیر ہوئے۔ اسی شاعر بیتاب نے تنہائی پر فتح پانے کے لیے بھارتی انٹلی جنیس افسر سے کہا تھا کہ انسان کا بچہ نہیں ملتا تو گدھے کا بچہ ہی بھیج دو، تاکہ اس سے بات تو کر سکوں، لیکن انہیں فی الحال اسی بھارتی افسر سے ہمکلامی پر اکتفا کرنے کو کہا گیا ——— رہا سپاہی شریف، تو وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کا جی بہت سی باتیں کرنے کو چاہتا تھا، لیکن حالات سازگار نہ تھے۔ چلئے، اس سے مفصّل ملاقات آگے ہوگی۔ وہ بھی ذلّت کے اسی گھوڑے پر سوار تھا، جس کے ہم شہ سوار تھے۔

ہماری روانگی سے متعلق حفاظتی اقدامات کو آخری شکل دی جا چکی، تو ٹرک میں سوار ہونے کو کہا گیا۔ یہ ٹرک اگرچہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کچھ عرصہ پہلے مجھے فورٹ ولیم کے

بالاخانے سے اس تہ خانے تک لایا تھا۔ لیکن آج ادائے صیّاد ذرا مختلف تھی۔ یعنی نہ ہاتھ رسّیوں سے کسے گئے، نہ آنکھوں پر پٹّی باندھی گئی ــــ ٹرک کے آگے پیچھے ایک ایک حفاظتی گاڑی لگادی گئی اور بس۔ اتنی سادگی سے تو کبھی کوئی سوئے دار روانہ ہوا تھا نہ بہ کوئے یار۔

پھاٹک سے باہر نکلے تو کیا دیکھتا ہوں کہ فورٹ ولیم کا وہ سہ منزلہ مہمان خانہ سامنے ہے جہاں گزشتہ دسمبر میں مَیں نے وی آئی پی قافلے کے ساتھ قیام کیا تھا۔ تو کیا، ۲ جنوری کو دو گھنٹے پچاس منٹ میں مَیں نے یہی سو گز فاصلہ طے کیا تھا؟ کیا صرف میرا احساسِ زمان و مکان مٹانے کے لیے ٹرک کو اتنا عرصہ گردش میں رکھا گیا؟ واہ رے بنیا، تیری ہوشیاری! بیچارے قیدی سے بھی ہاتھ کر گیا۔

اب ہم کلکتہ کے کوچہ و بازار سے گزر رہے تھے۔ گویا آتے وقت جس شہر کا فضائی معائنہ کیا تھا، اب اس کے تفصیلی جائزے کا موقع فراہم کیا گیا۔ کلکتہ کے مختلف حصّوں سے گزرتے ہوئے مجھے کہیں بھی ان کلبوں، ماڈرن ہوٹلوں، ناچ گھروں اور فرحت بخش پارکوں کا نشان نہ ملا جن کی خاطر، کہتے ہیں، قیامِ پاکستان کے بعد بھی بعض مسلمان لیڈروں نے کلکتہ کو خیرباد کہنا گوارا نہ کیا۔ مجھے تو اس میں کوئی ایسی کشش نظر نہ آئی، بلکہ جابجا کثافت کے ڈھیر اور غربت کے انبار نظر آئے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی کباڑ خانہ ہے جس میں کم سن و نحیف بچے ٹیڑھی میڑھی گاڑیوں کے پنجر کوٹ کوٹ کر اپنی زندگی کی گاڑی کو دھکا دے رہے ہیں۔ لمحے بھر کو خیال آیا کہ ایک ترقّی پسند شاعر نے معاشی ناہمواریوں کی تقسیم کو اُبھارنے کیلئے جو تشبیہیں (IMAGES) استعمال کی ہیں، شاید وہ کلکتہ ہی سے مستعار لی ہیں۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

یا

جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر میں یا تو بھوک اُگتی ہے جو غریبوں کو کھائے جا رہی ہے یا یہاں ناتواں کے نوالے سرمایہ دار عقاب جھپٹ کر لے جاتے ہیں۔ کلکتہ کی جو کچھ بھی رونق تھی، بس انہی دریدہ گریبانوں اور چاک دامانوں سے تھی۔

شہر سے نکل کر ہم دریائے ہگلی کے پُرشکوہ پُل پر سے گزرے۔ بنگلہ دیش کی پیدائش کے بعد اب پھر اس پُل کے نیچے سے چائے اور خام پٹ سن سے تیار شدہ مال وساور کو جانے لگے گا اور بمبئی اور دہلی کی آب و تاب میں اضافہ کا باعث بنے گا، لیکن شاید کلکتہ کی حالت اسی طرح خستہ رہے۔ کیا ہندوستان میں انسانوں کے علاوہ شہر بھی برہمن اور شودر کی تمیز کا شکار ہیں؟

میں کس دلدل میں پھنس گیا! چلو آگے چلیں۔ یہ کلکتہ کا ریلوے سٹیشن ہے۔ برِّ صغیر کا سب سے بڑا ریلوے سٹیشن۔ اس پر تِل دھرنے کو جگہ نہیں۔ خاص و عام کا ہجوم ہے۔ ساڑھی باندھے بنگالنوں کا دھوتی کمر میں ٹھونسے ہندوؤں کا، تنگ چھاتی والے بابوؤں اور موٹی توند والے بنیوں کا۔ اگر انسانوں کے اس سمندر میں کہیں کوئی جزیرہ ہے بھی تو اس پر ریلوے کے سیاہ انجن یا لال ڈبوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ دھرتی کہیں آزاد نہیں!

ہماری حفاظتی گارد اور اس کے انچارج میجر گوئل کو اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کا ہوش نہ تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ ہم میں سے کوئی دُرِّ شہوار اگر اس کی مُٹھی سے کھسک کر اس بحرِ انسانی میں کھو گیا، تو بھارت کے بڑے بڑے غواص بھی اسے تلاش نہ کر پائیں گے اور اس بیچارے کی نوکری جاتی رہے گی ــــ ہم نے اس کے بال بچّوں کا خیال رکھتے ہوئے ایسا خیال اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اور جس گاڑی کے جس ڈبے میں اس نے بٹھایا ہم بیٹھ گئے۔

ریل کا ڈبّہ در حقیقت دو مسافروں کے سونے اور چار کے بیٹھنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا ہم ساتوں اس میں ٹھونس دیے گئے اور چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔ کھڑکیوں میں پہلے ہی لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ دروازے کے باہر اور ڈبّے کے آگے پیچھے کوئی تیس چالیس سپاہی ہماری نگہداشت کو تعینات کر دیے گئے اور گاڑی چل دی۔ اس کا رُخ کھیمے کی طرف تھا۔ مکّہ

سمجھ لیجئے یا پاکستان!

گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو میجر گوئل نے اکلوتی کھڑکی کا چوبی پردہ اٹھا دینے کی اجازت دے دی گویا ہم متحرک گاڑی میں حرکت کیے بغیر ہندوستان کی سرزمین کا نظارہ کر سکتے تھے؛ البتہ اس نے یہ تاکید کر دی کہ جونہی سٹیشن قریب آئے ہم کھڑکی بند کر دیں تاکہ مشتعل ہجوم ہم "جرائم پیشہ" فوجیوں پر پل نہ پڑے۔ دشمن نے بہانہ بھی بنایا تو ایسا کہ اس کی چبھن سارے سفر میں محسوس ہوتی رہی ——— !

اگرچہ کھڑکی سے منظر محدود تھا، پھر بھی جس شخص کو ایک عرصے سے سوئی کے ناکے سے بھی مشاہدۂ قدرت کی اجازت نہ ملی ہو، اس کے لیے یہ دو ڈھائی فٹ دریچہ بہت کافی تھا، لہٰذا جی چاہا کہ ریل کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے درختوں، کھیتوں اور بجلی کے کھمبوں کا تعاقب کرتا رہوں اور جہاں کوئی مویشی، جانور، چرند یا پرند نظر آئے اس سے نظری معانقہ کروں۔ لیکن ادھر کئی مہینوں بعد یکمشت چھ ہم وطن پاس بیٹھے تھے، ان سے جی بھر کر باتیں نہ کرنا کفرانِ نعمت تھا۔ چند ہفتے پہلے جس سپاہی شریف کی خاکی جرسی دیکھ کر نظارۂ پرچمِ ستارہ و ہلال کی سی مسرت ہوئی تھی آج وہ سراپا موجود تھا۔ کیوں نہ اس سے باتیں کروں۔

سپاہی شریف بیس بائیس برس کا صحت مند نوجوان تھا۔ وہ قیدِ تنہائی سے جھنجھلایا ہوا ضرور تھا، لیکن مرجھایا ہوا ہرگز نہ تھا۔ بلکہ کریدنے پر پتہ چلا کہ اس کا دل اس کے جسم سے بھی زیادہ جوان ہے۔ اس نے بہت شوق سے جرسی کی جیب سے ایک زنانہ تصویر نکالی اور فخریہ انداز میں تعارف کرایا "یہ میری منگیتر ہے۔ کراچی اپنے چچا کے پاس رہتی ہے۔ ڈیڑھ سال پہلے جب میں مشرقی پاکستان جا رہا تھا تو اس نے چوری چوری یہ فوٹو مجھے دی تھی۔ کئی کافروں (بھارتیوں) نے یہ فوٹو چھیننے کی کوشش کی لیکن میں نے کہا یہ میری عزّت ہے۔ اگر کسی نے اسے ہاتھ لگایا تو ہاتھ کاٹ کھاؤں گا۔" بظاہر شریف باتیں مجھ سے کر رہا تھا، لیکن اس کی نگاہیں دُور خلا کے پردوں کو چیرتی ہوئی کراچی کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے نظر فوٹو پر گاڑ کر کہا "یہ پھولدار قمیص اور

ریشمی شلوار جو اس نے پہن رکھی ہے، میری ماں نے اسے میری تنخواہ سے خرید کر دی تھی۔ اب جاؤں گا تو ماں جلدی سے میری شادی کر دے گی"۔۔۔۔۔۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ابھی اس کی اور اس کی ماں کی آرزوؤں کی تکمیل میں کتنے سال حائل ہیں!

جہاں دیدہ اور عمر رسیدہ کرنل اکبر جو پاس بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے، شریف کی اشتیاق بھری باتیں سُن کر مسکرا دیے اور پھر وظیفہ میں مصروف ہو گئے۔ کرنل امیر نے لقمہ دیا "شریف فکر مت کرو، تمہارا شادی جلدی ہو جائے گا"۔ میجر سمیع نے سپاہی شریف کو چھیڑتے ہوئے کہا "ہندو کہتا ہے کہ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجیوں نے بہت بُرا بُرا کام کیا۔۔۔"۔ شریف نے فوراً بات کاٹی "کافر کا بچّہ جھُوٹ بکتا ہے۔۔۔۔ میرا اتنا خوبصورت بیوی کراچی میں انتظار کر رہا ہے۔۔۔ ادھر کالا، گندا بنگالی عورت۔ تھُو"۔ اس نے نفرت کا بھرپور اظہار کیا اور کہا "دیکھو نا، صاب، ایسا کام کرنے کا آرڈر (بمعنی اجازت)، نہ ہماری فوج میں ہے نہ مذہب میں۔۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ کافر کا بچّہ ہم کو بدنام کرتا ہے"۔

میں سفر کی یادداشتیں کاغذ کے پُرزے پر رقم کرنے لگا۔ شریف حسبِ معمول مُسکراتا، کرنل اکبر تسبیح رولتا اور میجر غفور اپنے شعر منمناتا رہا۔ اب سپاہی، میجر اور کرنل کا سرکاری امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم ایک ہی برادری کے فرد تھے۔ کوئی چھوٹا، کوئی بڑا۔ اور ہر برادری کی طرح یہاں بھی چھوٹے بڑے کا لحاظ تھا۔ اسی چھوٹی سی دُنیا کو آباد دیکھ کر جی چاہا کہ سب سے کہوں

موسمِ بہاراں ہے، محفلِ نگاراں ہے
میں بھی سازِ دل چھیڑوں، تم بھی سازِ جاں چھیڑو

لیکن پتہ نہیں کیوں کسی نے بھی تلخئ ایّام کو موضوع بنانا گوارا نہ کیا۔ کسی نے بھی زخمِ جگر کو کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ موسمِ گُل میں دار و رسن کی بات چل نکلی تو ہر بُنِ مُو سے خونِ ناب ٹپکنے لگے گا، لہٰذا بزرگ روحانی دنیا میں کھوئے رہے اور خورد لطیفہ بازی میں مشغول ہو گئے۔ نئے اور پُرانے لطیفے، اصلی اور نقلی لطیفے، اپنی ذات اور کائنات سے متعلق لطیفے،

لطیفے قطار اندر قطار وارد ہوتے رہے۔ ہم غنچوں کی طرح چٹکتے اور کلیوں کی طرح مسکراتے رہے، لیکن اس چٹک، اس مسکراہٹ، اس قہقہہ بازی میں وہ کھرا پن نہ تھا جو مَیں ڈھاکہ میں بشیر ملک، افضل کیانی اور غلام رسول سے سُننے کا عادی تھا۔ آج ہر مسکراہٹ میں درد کا پیوند نظر آیا، ہر قہقہے کے نیچے غم کی کھنکتی ہوئی تہہ دکھائی دی۔ تبسّم کے یہ پھول قبرستان کے پھولوں سے مشابہ لگے۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ریل کی پٹڑیاں پہیّوں کی چوٹ سے کانپ رہی تھیں۔ تمام ذی روح اور بے روح چیزیں بلا امتیاز دوڑ رہی تھیں۔ کہیں کہیں اکّا دکّا کسان کھیت میں کام کرتے دکھائی دیتا۔ لیکن اس کا بھرپور مشاہدہ کرنے سے پہلے گاڑی آگے بڑھ جاتی۔

اتنے میں ایک سٹیشن آیا۔ قد کاٹھ، رنگ ڈھنگ یا چال ڈھال سے اس قابل نہ تھا کہ اس کا نام یاد رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ بس ایک آدھ چھابڑی، دو چار مسافر، پانچ سات گٹھڑیاں۔ یہی اس سٹیشن کی کُل کائنات تھی۔ ریلوے گارڈ کے سبز اشارے سے گاڑی نے پھر حرکت کی اور خفیف سے دھچکے نے ہمیں احساس دلا دیا کہ ہم پھر سفر میں ہیں — اسی طرح کئی سٹیشن آئے اور گزر گئے، لیکن منزل کا کہیں نشان نہ تھا!

میجر گوئل ہمارے ڈبّے میں آ کر میرے بائیں ہاتھ بیٹھ گیا۔ گندمی رنگ، مکھی مار کہ مونچھیں، سبز وردی اور کندھے پر عہدے کی علامت کے طور پر کپڑے کے پھول۔ انگریزی بھی بولتا تھا اور اُردو بھی۔ ہماری گپ شپ میں شامل ہو گیا۔ ہم نے اس کی دلآزاری کے لیے سکھوں، بنیوں اور دوسرے بھارتیوں کے متعلق کئی لطیفے سُنائے۔ جب جب اسے ہنسنے کی توفیق ہوئی اُس نے ہمارے قہقہوں کا ساتھ دیا۔ جہاں اس کی دلآزاری کا پہلو نکلا، وہ پی گیا۔ بنیا بڑا موقع شناس ہوتا ہے!

پہلے اشاروں کنایوں میں، پھر واشگاف الفاظ میں ہم نے اسے حکایتِ معدہ سنائی کہ صبح کی خشک چپاتیاں تو دوپہر کو بھی نہ چبائی جا سکیں، سہ پہر کی چائے کا تصوّر پہلے ہی فوت ہو چکا، اب شام ہونے کو ہے، کچھ کام و دہن کا بھی خیال کیا جائے، لیکن اس خبیس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اس کا موقف یہ تھا کہ مجھے تم لوگوں کی نگہبانی کا فرض سونپا گیا ہے، دانہ پانی کا نہیں۔ پوچھا "یہی بتا دو، ہماری منزل کتنی دُور ہے، تاکہ پیٹ کو تسلّی دے سکیں۔" جواب ملا "یہ سیکورٹی کے خلاف ہے.... بس دو تین دن کا سفر سمجھ لو۔" ہم نے حساب لگا کر دلّی کو اپنی منزل گردانا کہ ہم جیسے اہم آدمی "جو خاک میں مل کر، آگ میں جل کر، خشت بنے" ضرور راجدھانی کے اہل ہوں گے ___ لیکن وہاں پہنچتے پہنچتے تو انتڑیاں بغاوت کر دیں گی۔ اس نے کہا "میں مجبور و ناچار ہوں۔ کچھ خرچ نہیں کر سکتا۔"

ہم نے پیٹ کی احتجاجی صداؤں کو دبانے کے لیے پھر لطیفہ بازی شروع کر دی۔ میجر گوئل نے کہا "بھارت کے متعلّق بہت لطیفے ہو چکے، اب کوئی پاکستان کا لطیفہ سُناؤ۔" ہم نے پھر اپنی بھوک کا قصّہ دُہرانے کے لیے دورِ ایوّبی کا یہ پُرانا لطیفہ سُنایا کہ فیلڈ مارشل محمّد ایوّب خان کے مارشل لا کے دوران میں ایک بھارتی اور ایک پاکستانی کُتّے کی ملاقات سرحد پر ہوئی۔ وہ دونوں اپنا اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے۔ لاغر و ضعیف بھارتی کُتّے نے کہا "مَیں تو بھوک سے تنگ آکر بھاگ رہا ہوں، تم تو موٹے تازے ہو، تم نقلِ وطن پر کیوں مجبور ہو گئے؟" پاکستانی کُتّے نے جواب دیا "ادھر کھانے کو بہت ملتا ہے ___ لیکن بھونکنے کی اجازت نہیں۔" ___ ہم یہ لطیفہ سنا کر بھوکے پیٹ خوب ہنسے، لیکن میجر گوئل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یعنی کھانے کو پھر بھی کچھ نہ ملا۔ گلے شکوے بھی کر دیکھے اور ___ من گھڑت لطیفے بھی سُنا دیکھے۔ بنیا گانٹھ کا بڑا پکّا ہے!

اس نشست کے دوران میں سپاہی شریف بھی موجود تھا۔ بات قیدیوں کے تبادلے کی چل نکلی۔ شریف نے میجر گوئل سے کہا "تم (ہندو) بہت حسابی آدمی ہے، اس دفعہ تمہارا قیدی تھوڑا اور ہمارا زیادہ ہے، اس لیے تم جلدی جلدی بدلی نہیں کرے گا۔ اگلی دفعہ جب تمہارا قیدی زیادہ ہوگا تو ہم بھی جلدی بدلی نہیں کرے گا۔" میجر گوئل ایک نیم خواندہ سپاہی کے جذبات سُن کر چُپ ہو گیا اور پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ یقیناً اس ڈبّے کی فضا اس کے لیے سازگار نہ تھی۔

کوئی نو بجے رات میجر گوئل پھر آیا اور ڈبّے کی کھڑکی اور دروازہ بند کرا دیا اور جاتے جاتے

یہ کہہ گیا کہ کل صبح نو بجے تک یہی صورتِ حال رہے گی؛ البتہ ایمرجنسی کی بات اور ہے"۔ ہم نے اس پابندی پر بہت احتجاج کیا، لیکن دن کو گپ شپ لگانے والا میجر رات کو خالص سرکاری آداب پر اُتر آیا — ہندو کی آنکھیں بدلتے دیر نہیں لگتی —! اس نے دس پندرہ سپاہی طلب کیے اور ہمیں زبردستی بند کر کے چلا گیا۔

درحقیقت یہ قدغن اتنی کڑی نہ تھی۔ کلکتہ کے سیل کے برعکس اب ہم اس کوٹھڑی میں ایک نہیں، سات تھے۔ یہ سیل جامد نہیں، متحرک تھا۔ تاریک نہیں، روشن تھا۔ یہ شب بھی بسر کر لیں گے ترے دیوانے۔ لیکن آدھی رات کو ہمارے ایک ساتھی کو ٹائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ضبط و تحمّل سے ضرورت کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن نظامِ قدرت گوئل سے بھی اٹل نکلا۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑے، یہ اپنی وضع نہ بدلے۔ مفت میں پس گیا بیچارہ قیدی۔ دروازہ بہت جھنجھوڑا، کھڑکی کو بہت پیٹا، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی — آخر ایک ایسی حرکت کی جس سے کھڑکی توڑ کر فرار ہونے کا شبہ ہو۔ فوراً دروازے پر متعین سنتری حرکت میں آیا اور میجر گوئل کو بُلا لایا۔ وہ آتے ہی بدمزاجی سے پیش آیا اور اس ضرورت کو "ایمرجنسی" گرداننے سے انکار کر دیا اور دروازہ دوبارہ بند کرنا چاہا۔ ہم نے اس کا بازو پکڑ کر اتنی ہی بدتمیزی سے کہا "ایمرجنسی سے تمھاری مراد کیا ہے؟ کیا یہاں زچہ بچہ کی کیفیت کی توقع رکھتے ہو، جسے ایمرجنسی کہو گے؟ ہمارے لیے یہی ایمرجنسی ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ اس تنگ ڈربے میں سات انسانوں کے سامنے ایک سینئر افسر حاجت رفع کر سکتا ہے؟ افسوس کا مقام ہے، تم افسر ہو یا...." وہ دھونس سے مرعوب ہو گیا اور دروازہ کھول دیا۔

سفر میں بمشکل تیس چالیس گھنٹے گزرے ہوں گے کہ گاڑی سے اُترنے کو کہا گیا۔ باہر دیکھا تو آگرے کا سٹیشن تھا۔ سب سے پہلے تاج محل کا تصوّر اُبھرا، پھر چچا غالب کا۔ مغلیہ خاندان کے فرمانرواؤں کے تعمیراتی کارنامے یاد آئے اور غالب کے تخلیقی معرکے۔ گویا ہمارے سفر کا انجام ایسا بُرا نہیں! آگرہ کلکتہ کی نسبت پاکستان سے قریب بھی تو ہے۔

گاڑی سے اُترے تو ایک ہجومِ بدتمیزی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک طرف پہریدار دل

کی سنگینوں کی چبھن تھی تو دوسری طرف عوام کے تیز نگاہ کی۔ یوں معلوم ہوا کہ ہم بکاؤ مال ہیں جنہیں سرِ بازار لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس رسوائی سے تو کلکتہ کی کال کوٹھڑی بہتر تھی۔

باہر نہ آتا چاہ سے یوسف، جو جانتا
لے کارواں مرے تئیں بازار جائیگا

سرِ عام اس رسوائی پر میجر گوئل سے "تُو تُو میں میں" ہوئی۔ وہ گزشتہ رات کی تلخی کا بدلہ چکانے پر تُلا ہوا تھا۔ اس نے طنز کے نشتر چلانے شروع کر دیے "میں پلیٹ فارم سے ان شہریوں کو چلے جانے کو نہیں کہہ سکتا۔ یہ پاکستان نہیں جہاں مارشل لا کی آڑ میں ایک میجر پورا شہر خالی کروالے۔ یہ ایک جمہوری ملک ہے۔" اس کی گفتگو سے بات گریبان تک پہنچی، لیکن کرنل اکبر اور کرنل لودھی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اتنے میں ٹرک ہمیں لینے آگیا اور پلیٹ فارم سے کوچ کا حکم ملا۔ پبلک کے سامنے اپنی زخم خوردہ انا کو تسکین دینے کے لیے سینہ پُھلا کر چلنے لگے۔

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

○○

قندِ مکرر

پلیٹ فارم سے باہر نکلے تو غالب و میر کے شہر میں ایک بار پھر ٹرک کی سواری کا اعزاز نصیب ہوا۔ یہ ٹرک سابقین پر کئی لحاظ سے فوقیت رکھتا تھا۔ ایک تو یہ چاروں طرف سے بند تھا، دوسرے اس کے اندر بیٹھنے کے لیے کوئی بنچ یا سٹول نہ تھا۔ بس حادثاتِ زمانہ کی ستائی ہوئی لوہے کی چادر اپنا فگار سینہ پھیلائے منتظر تھی۔ اس پر جا بجا کوٹلے اور لکڑی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ چوبِ خشک اور سیاہ رُو کوئلہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح اس میں کھڑے ہو گئے۔ لیکن ٹرک چلنے سے اس میں دھکے لگنے شروع ہوئے۔ ہاتھ رکھنے کے لیے سہارا تلاش کیا، لیکن ایسے موقعوں پر سہارا کہاں ملتا ہے! جو جواں سال اور جواں ہمت تھے وہ کسی طور کھڑے رہے، لیکن بزرگوں کو اسی آہنی چادر کے داغدار سینے پر بیٹھنا پڑا۔

برما کی سرحد سے گرفتار ہونے والے میجر سمیع کی نظر شاید اب بھی کسی راہِ فرار کی تلاش میں تھی۔ میجر سمیع نے بالآخر ٹرک کی چاردیواری میں ایک سوراخ تلاش کر لیا جو لوہے کی میخ کہیں گرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس سوراخ سے آنکھ لگا کر پہلے خود آگرہ کے کوچہ و بازار کا مشاہدہ کیا، پھر ہمیں دعوتِ نظارہ دی۔ جب مَیں نے سوراخ پر آنکھ رکھی تو سکول کے بچے رنگا رنگ یونیفارم پہنے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ شاید سکول میں ابھی ابھی چھٹی ہوئی تھی — آہ! چھٹی کا تصوّر، بالخصوص ایسے ٹرک میں کتنا حسین معلوم ہوتا ہے۔ ہاں، انہی بچوں کی پھلواری کے آس پاس چند خزاں رسیدہ اُستانیاں بھی تھیں۔ لیکن ان کی طرف دھیان کون دیتا۔

——— ہماری استانیاں تو ایسی ویران نہیں ہوتیں!

ٹرک سنٹرل جیل آگرہ کے پھاٹک کے سامنے رُکا۔ رجسٹر میں کچھ اندراج ہوا۔ ٹرک اندر سرکا۔ اسی طرح دو بڑے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے اور بند ہوئے۔ بالآخر ہمیں آہنی سلاخوں والے ایک دروازے کے سامنے اُتار دیا گیا۔ اب ہم جیل کے اندر تھے۔ خاصی کشادہ دل جگہ لگی۔ کلکتہ کا سیل، ریل کا ڈبّہ اور ٹرک تو خاصے تنگ دل تھے۔ دروازے کے اندر داخل ہوئے تو پاکستانی سپاہی جنگی قیدیوں کے لباس میں راشن کا آٹا اور ایندھن ڈھوتے نظر آئے۔ ایک کی پیٹھ بوری کے بوجھ تلے جھکی ہوئی تھی اور دوسرا بوری کو سہارا دیے ہوئے اس کے ساتھ تھا۔ ان باربردار انسانوں کے آگے پیچھے چار پانچ بھارتی سپاہی سنگینیں تانے طنزیہ ہنسی ہنستے چلے آ رہے تھے ــــ ذرا آگے بڑھے تو ایک باڑ میں ان گنت قیدی نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دانہ چُگتے کبوتروں پر اچانک جال پھینک کر غول کا غول زیرِ دام لایا گیا ہے۔ مجھے بچّوں کی کتابوں میں درج وہ کہانی یاد آئی جس میں ایسے ہی کبوتروں کا غول باہمی تعاون اور ہمّت سے جال ہی لے اُڑا تھا۔ لیکن کتابی کہانی کے کبوتروں اور ان انسانوں کے جال میں بہت فرق تھا ــــ!

ہمارے سپاہیوں نے دُور سے ہمیں سلیوٹ کیا۔ ہم نے بڑے وقار کے ساتھ سلیوٹ لوٹایا اور یوں اس منجدھار میں بھی پاکستانی نظم و ضبط کی یاد تازہ کر دی۔ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے اور ان سپاہیوں کے درمیان کئی چیزیں حائل تھیں۔

اگرچہ اب ہم جیل کی اونچی اونچی دیواروں کی حراست میں تھے؛ تاہم یہ تسلّی تھی کہ چلو کلکتّے کے بلیک ہول (BLACK HOLE) سے تو جان چھُوٹی۔ لیکن چند موڑ گھومنے کے بعد پھر اپنے آپ کو قیدِ تنہائی کی کوٹھڑیوں کے رُوبرو پایا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

صف بستہ کوٹھڑیاں گنیں تو پوری دو درجن نکلیں۔ اپنی مرضی کا قفس انتخاب کرنے کے لیے ان کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرے تو اکثر میں پاکستانی افسر زمین پر لیٹے نظر آئے۔ ان خاک نشینوں

کو دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ یہی ہماری قوم کی آن اور فوج کی شان تھے۔ یہی وہ چاق و چوبند فوجی تھے جو تقریبی پریڈوں میں قدم سے قدم ملا کر چلتے تو دیکھنے والوں کا ایمان تازہ ہو جاتا اور جب شانے سے شانہ ملا کر وطن کی حفاظت میں لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں پر ڈٹ جاتے تو کبھی ان کے پاؤں نہ اُکھڑتے۔ توپوں کے گولے پھٹنے سے زمین کا سینہ بیشک کانپنے لگتا، لیکن ان کا دل کبھی نہ دہلتا — یا خُدا! میرے وطن کے پاسبان کس انجام کو پہنچے —! میں انہی خیالوں میں غرق ایک کوٹھڑی میں داخل ہوا اور انہی کے انجام میں شریک ہو گیا۔ مجھے سیل نمبر ۲۱ ملا۔

ان پندرہ بیس اسیروں کا قصور یہ تھا کہ وہ بھارتی آقاؤں سے "تعاون" نہیں کرتے تھے اور مختلف کیمپوں سے سزا کے طور پر یہاں منتقل ہوئے تھے۔ کسی پر الزام تھا کہ وہ اپنی انا کے آبگینوں کو چُور چُور نہیں ہونے دیتا۔ کسی پر تہمت تھی کہ اپنے کُنج ° کے تمام کبوتروں کو اجتماعی طور پر کوششِ پرواز کی ترغیب دیتا ہے۔ کسی سے بنگالیوں کو شکایت تھی کہ اس افسر نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہمارا دل دکھایا ہے، اسے اسیری میں آرام نہ لینے دینا وغیرہ۔

آگرہ جیل کے سیل کلکتہ کی نسبت "آرام دہ" تھے۔ یعنی ان کا رقبہ ۶ × ۶ فٹ کی بجائے ۶ × ۹ فٹ تھا۔ تین دروازوں کی بجائے صرف ایک دروازہ تھا، وہ بھی محض سلاخوں کا یعنی اس پر قوّتِ مشاہدہ کی راہ بند کرنے کے لیے کواڑ نہ تھے۔ گویا ہم چٹکتی چاندنی کی جُھلکی، چلتی ہوا کا جھونکا اور گزرنے والے کی جھلک دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ دروازے کے آگے سربلند دیوار تھی جو مشاہدے کو ہر چند محدود کرتی تھی، تاہم کلکتے والی بات نہ تھی کہ آسمان بقدرِ بیضۂ مور کو بھی ترس جائیں۔ یہاں جب میں دہلیز کے اندر بیٹھ یا لیٹ کر سامنے والی دیوار کی منڈیر کے پار دیکھتا تو اوپر کم از کم ۲ × ۱½ فٹ قطعۂ فلک ضرور دکھائی دیتا — اور ذرا سوچئے تو اگر ساری دنیا کی مخلوق اپنے اپنے حصّے کا آسمان بانٹ لے تو شاید ہر انسان کے حصّے اتنا ہی آسمان آئے — ضرورت سے زیادہ حریص ہونا بُری بات ہے!

° کنج: پنجرہ، قفس۔

اس کے علاوہ سو سہولتوں کی ایک سہولت یہ تھی کہ پانی کے علاوہ ٹائلٹ کی جملہ ضروریات سیل کے اندر ہی مہیّا تھیں، تاکہ آڑے وقت سنتری کو آواز دینے یا بھارتی گارد کمانڈر کو "ایمرجنسی" کا احساس دلانے کی ضرورت نہ پڑے، اور ہاں، اس کے فرش کی تعریف کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ یہ کلکتے کی طرح کچّا اور سیم زدہ سیل نہ تھا، بلکہ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے انگریزوں نے اسے تعمیر کراتے وقت اس کے فرش پر سیمنٹ کا پلستر کرایا تھا۔ کیا ہوا اگر محتاجِ مرمّت ہونے کی وجہ سے کنکر سر اٹھانے لگے تھے اور نماز پڑھتے وقت گھٹنوں میں اور لیٹتے وقت پسلیوں میں چُبھتے تھے۔ اس کے سوا وہ ہمیں ہرگز نہ ستاتے تھے۔

آگرہ میں پہلی شام خلافِ معمول سرد تھی۔ ہم کلکتے میں آمدِ موسمِ گل کا سماں دیکھ کر آئے تھے۔ یہاں سخت جاڑے کا موسم تھا؛ اگرچہ نذرل اور غالب کی شاعری کی طرح کلکتے اور آگرے کے موسمی مزاج میں فرق قابلِ فہم تھا، تاہم ایسی شامِ غریباں کی توقّع نہ تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں تیر کی طرح آتیں اور ہڈیوں کے گودے کے پار ہو جاتیں۔ کاش یہاں کواڑ ہوتے، تاکہ سردی تو روکتے — ! بڑوں نے سچ کہا ہے، انسان کسی طور مطمئن نہیں ہوتا!

آگرے والوں نے حیلے بہانے سے تقریباً ایک ماہ ہمیں قیدِ تنہائی کا مزہ چکھایا۔ کلکتے کی قیدِ تنہائی کے بعد اس قندِ مکرر کے اہتمام کی مصلحت سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن ہر بات کا قیدی کی سمجھ میں آنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ رموزِ مملکتِ خویش خسروان دانند والی بات زیادہ برمحل تھی۔ ہم نے یہاں بصد صبر و شکر دھوپ سے جگمگاتے انتیس ۲۹ دن اور چاندنی میں نہائی ہوئی — اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تیس راتیں بسر کر ڈالیں۔

صبح کو بھارتی افسر آتے اور رات کو ڈیوٹی جے۔ سی۔ او۔° وہ سرگراں ہو کر آتے اور ہمیں گودام میں پڑی ہوئی بوریوں کی طرح گن کر چلے جاتے۔ ہم بھی سبک سر ہو کر نہ پوچھتے کہ بھئی ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ بس نہ انہوں نے ہم سے بات کر کے اپنی آن پہ آنچ آنے دی، نہ ہم نے بات کر کے اپنی

° جے۔ سی۔ او: جونیئر کمشنڈ آفیسر کا مخفف

انا کو مجروح ہونے دیا۔

اس دوران میں ہمارا واسطہ ادنیٰ درجے کے چند بھارتی باشندوں سے رہا۔ گارد مرکزی یا صوبائی ریزرو پولیس کی ہوتی۔ چابیوں کا مختارِ کُل بھارتی فوج کا ایک این سی او ہوتا۔ کیمپ کے لنگر سے دال روٹی لانے کے لیے سویلین حجام استعمال میں لایا جاتا۔ کھانا تقسیم کرنے میں ہمارا سپاہی شریف اس کا ہاتھ بٹاتا اور اوپر کی دیکھ بھال کے لیے کبھی کبھی کوئی جمعدار یا صوبیدار آنکلتا۔

ان دنوں چابی سے متعلق جملہ کام حوالدار میجر تارا سنگھ کے سپرد تھے جو جس کو چاہتا، جس وقت چاہتا، جتنی دیر کے لیے چاہتا کھول دیتا اور جب اس کا دل چاہتا کسی کو بند کر دیتا۔ اس کے ان آمرانہ اختیارات میں سرِ مُو مداخلت کی گنجائش نہ تھی۔ بے شک وہ اپنی ماتا کی آنکھ کا تارا ہوگا، لیکن ہمیں ایک آنکھ نہ بھایا۔ لمبے قد، پتلی ٹانگوں اور موٹے پیٹ کی وجہ سے اکثر چلتے وقت اس میں کسی اناڑی شاعر کے بے وزن مصرعے کی طرح جھول پڑتی تھی۔ اس نے مُٹھی میں حقّے کی نال کی طرح سگریٹ بھینچا ہوتا اور چابیوں کا گُچھا اس کے کندے سے لٹک رہا ہوتا۔ وہ باری باری سب کو کھولتا۔ افسر اپنی پلیٹ اور ٹائلٹ کے لوازمات اٹھائے آگے آگے ہوتا اور وہ ڈھور ڈنگر ہانکنے والے گنوار کی طرح پیچھے پیچھے چلتا۔ جب تک احاطے کے ایک کونے میں افسر اپنے کام میں مشغول رہتا، یہ کبھی سگریٹ والی مٹّھی، اپنی دوسری کلائی پر مار کر راکھ جھاڑتا اور کبھی بے ہنگم طریق سے کھڑے ہو کر چابیاں جھنجھنانے لگتا۔ وہ ایک افسر کو لا کر بند کر دیتا تو دوسرے کو کھول دیتا۔ جن کی باری پہلے آجاتی وہ ضروری حوائج سے آٹھ بجے ہی فارغ ہو جاتے، آخری آدمی نو دس بجے تک انتظار میں رہتا۔

میں نے ایک دن کسی اشد ضرورت کے تحت اسے کہا "ایچ ایم ● تالہ کھولو، مجھے غسلخانے تک ضروری جانا ہے۔" اس نے سگریٹ کی روح کھینچتے ہوئے کہا "ابھی تمہارا نمبر نہیں آیا۔ صبر کرو۔"

○ این سی او، نان کمشنڈ آفیسر کا مخفف۔ یعنی لانس نائک سے لیکر حوالدار میجر تک

● حوالدار میجر

جب اصرار کیا تو اس نے یہ دلیل دی "آج ۴۴ نمبر سے شروع کیا ہے، تمہارا نمبر جلدی آنے والا ہے۔ اگر ایک نمبر سے شروع کرتا تو تمہاری باری بہت دیر بعد آتی"۔ اس لحاظ کا بہت بہت شکریہ!

ایک رات میں گھٹنوں اور ٹھوڑی کی اجتماعی قوت سے ہوا کے سرد جھونکوں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ ایک سیل سے روح کو گرما دینے والی آواز میں سورہ رحمٰن کی قرأت سُنائی دی۔ ایک تو سورہ رحمٰن کا اپنا لفظی ترنم اور معنوی حُسن، دوسرا قاری کی سوز و گداز سے بھری آواز، تیسرے رات کا سناٹا۔ مَیں نے کمبل ہٹا کر کان سیل کے دروازے کے ساتھ لگا دیے۔ اس طرح رات کا بیشتر حصّہ آسانی سے گزر گیا۔ یہ قاری میجر قمر الدّین تھے جو میرٹھ کے کیمپ سے سزا پانے کے لیے اسی رات یہاں پہنچے تھے۔ ہم ان کی قرأت سے اتنے متاثر ہوئے کہ ہم نے ریلے سسٹم ° کے ذریعے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے سیل ہی میں کھڑے ہو کر ہمیں نماز باجماعت پڑھایا کریں۔ انہوں نے یہ درخواست بخوشی قبول کر لی اور ہمیں باقی ایّام میں ان کی امامت اور قرأت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہا۔

شاید یہ کسی روحانی ریلے سسٹم کا کرشمہ تھا کہ ہماری موجودگی کی خبر چار پانچ حصار توڑتی ہوئی کیمپ نمبر ۴۴ تک پہنچ گئی جو اسی سنٹرل جیل (آگرہ) میں چند سو گز دُور تھا۔ وہاں سے ہم وطنوں نے کسی نہ کسی طور ہم تک صابن، بلیڈ اور روزمرّہ کی دوسری چیزیں پہنچا دیں۔ اکثر اوقات یہ خدمت بھارتی عملہ ہی ادنیٰ سی قیمت ملنے پر انجام دے دیتا ——— مَیں نے کلکتّے سے چلتے وقت کہا تھا نا، کہ یہ سب بکاؤ مال ہے!

یہاں بھی ہمارے ساتھ قیدِ تنہائی کا شکار واحد سپاہی شریف تھا۔ وہ بیچارہ کلکتّے والے غول کے ساتھ زیرِ دام آیا تھا اور جب تک کلکتّے والوں کے "انتقال" کا فیصلہ نہ ہوتا وہ بھی کہیں نہ جا سکتا تھا۔ یہاں وہ دال روٹی تقسیم کرنے کے علاوہ کبھی کبھی ہماری پلیٹ بھی صاف

° (RELAY SYSTEM) سسٹم یہ تھا کہ ایک سیل والا ایک پیغام، ساتھ والے قیدی کو دیتا، وہ اگلے سیل تک پہنچاتا، وہ اس سے اگلے کو۔ اس طرح بات ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی۔

کر دیا کرتا۔ وہ سارا دن ہنستا مسکراتا رہتا اور آتے جاتے کوئی نہ کوئی خوش کُن جملہ چھوڑ جاتا۔ ہم اس کی خوش دلی اور سادہ لوحی کی داد دیتے۔

ایک رات کالا باغ کے مخصوص لہجے میں شریف کے گانے کی آواز آئی۔ شاید وہ بھی ہماری طرح سو نہ سکا تھا۔ وہ چند الفاظ مبہم اور مدّھم آواز میں ادا کرنے کے بعد تان کھینچتا۔

"جدی گل مُک جائے، جدھا دِل ٹُٹ جائے، او جا.... نے.... تے" (جس کی بات ختم ہو جائے، جس کا دل ٹُوٹ جائے، وہی جانتا ہے۔) وہ گویا نہ تھا۔ نہ اس کو موسیقی کی شُد بُد تھی اور نہ اس کی آواز میں ریاضت کا شائبہ لیکن اس کے باوجود "او جانے" کی لمبی تان متاثر کیے بغیر نہ رہتی ——— جیسے اس ساز میں ایک ٹُوٹے ہوئے دل کی صدا ہو۔

وہ اگلے روز اسی طرح مسکراتا میرے دروازے پر آیا اور پلیٹ میں دال ڈالنے کے بعد کہنے لگا "صاب! تم ہر وقت تعویذ ○ لکھتے رہتے ہو۔ مجھے گانا لکھ دو، میں رات کو گایا کروں گا۔"
میں نے اس کے رومانی ذوق کی تسکین کے لیے یہ نثر نما شعر ایک پرچی پر لکھ دیا۔

"مرا دل مانگتا ہے تُو؟ ذرا سی چیز ہے دل تو
بہت سامان رکھتی ہُوں، بھلا پرچون کیوں بیچوں؟"

شریف نے سنتری کی مداخلت پر یہ پرچی فوراً جرسی کے اندر ٹھونس لی اور چلا گیا۔ غالباً بعد میں میجر سمیع کو دال دیتے وقت اس نے یہ پرچی دکھا کر اس کا مطلب پوچھا۔ معنی تو اسے پسند آئے لیکن مصرعے غیر مترنم ہونے کی وجہ سے اس کی زبان پر نہ چڑھ سکے۔ لہٰذا اس نے "میں پرچون کیوں بیچوں" کو ازبر کر لیا اور آتے جاتے شرارت آمیز طریقے سے میری طرف دیکھ کر کہتا "ارے، میں پرچون کیوں بیچوں!" آہستہ آہستہ "میں پرچون کیوں بیچوں" کی شانِ نزول اور مقبولیت کا چرچا ساری کوٹھڑیوں تک پہنچ گیا، بلکہ شریف کا نام ہی

○ میں ان دنوں چوری چھپے کاغذ کے پُرزوں پر اسیری کے ان ایام کی یادداشتیں لکھتا رہتا تھا اور شریف نے کئی بار مجھے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔

"میں پرچون کیوں بیچوں" پڑ گیا۔

میجر سمیع میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ انہیں مُمسک ہندو سے بھی کام نکالنے کا گُر آتا تھا؛ چنانچہ انہوں نے قیامِ آگرہ کے ابتدائی ایام ہی میں بھارتی این۔سی۔او کو رام کر لیا، سنتری کو خرید لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دوسروں کے کپڑے اتارنے والا این سی۔او کبھی ملیشیا کی قمیص لا دیتا، کبھی صابن مہیّا کر دیتا، کبھی کیمپ سے کوئی باسی اخبار اٹھا لاتا۔ اسی طرح سنتری جو ہماری گفتار و کردار پر تعزیر لگانے کے لیے کھڑا رہتا تھا، ہم پر نظر رکھنے کی بجائے اپنے افسروں پر نظر رکھتا تھا۔ ہم "سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے" آپس میں آزادانہ باتیں کرتے رہتے اور سیل سے باہر شیشہ رکھ کر ایک دوسرے کا منہ بھی دیکھ لیتے اور یہ دروازے سے آنے والوں کو دیکھتا رہتا۔ جونہی اس کا کوئی افسر داخل ہوتا، یہ زور سے "اٹین شن" ہوتا جس سے ہم اندازہ کر لیتے کہ وقتی طور پر حکمِ زباں بندی کا احترام کرنا چاہیے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ آگرہ کیمپ کا محکمۂ سراغ رسانی ہم سے از سرِ نو پوچھ گچھ کرے گا اور اس کی سفارش پر آئندہ طرزِ جفا کی طرح ڈالی جائے گی۔ میں جب درِ زنداں پر پوچھ گچھ کے لیے روانہ ہوا تو دو سنگین بردار سنتری آگے تھے، دو پیچھے۔ میں ان کے درمیان سینہ پُھلائے اسی طرح اطمینان سے چل رہا تھا جیسے فلمی ہیرو تختۂ دار کی طرف نہایت باوقار طریقے سے چلتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ دار پر لٹکنے سے پہلے ضرور ہیروئن یا ہیرو کا دوست مدد کے لیے پہنچ جائے گا؛ اگرچہ یہاں کسی ہیروئن یا ہیرو کے دوست کے رونما ہونے کا کوئی امکان نہ تھا، پھر بھی یہ تسلّی ضرور تھی کہ یہاں میرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہونا ہوتا تو کلکتے میں ہو چکا ہوتا، کیونکہ اس کے لیے وہی فضا سازگار تھی، لہٰذا میں مسلّح گارد کی معیّت میں جوانوں کے کیمپ کی روشوں سے گزرتا ہوا، اپنے سپاہیوں کے سلام کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتا گیا۔ کسی کو مسکرا کر اپنی اعلیٰ ہمّتی کا مژدہ سُناتا، کسی کو دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کرتا۔

آگرے والا محتسب کلکتے والی جنس سے یکسر مختلف تھا۔ اس نے ازسرِ نو سوالوں کی بوچھاڑ کرنے کی بجائے پہلی نشست ہی میں انکشاف کیا کہ "کلکتے (اور غالباً ڈھاکے) سے تصدیق کی جا چکی ہے کہ تم نے سابقہ پوچھ گچھ کے دوران جو کچھ بتایا تھا وہ درست تھا، اس لیے مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ تم خواہ مخواہ اتنا عرصہ قیدِ تنہائی میں گزار چکے ہو۔" یہ سُن کر بھارتی عدل و انصاف کی داد دینے کو جی چاہا کہ اربابِ اختیار نے حکمِ عقوبت کے صرف چند ماہ بعد دامنِ یوسف کی طرف دیکھ کر اس کی بے گناہی کا اعتراف کر لیا اور میرا دل موہنے کے لیے ذرا سی ندامت کا رس بھی اس میں ملا دیا۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

چند روز بعد ہمیں سیل سے کیمپ میں منتقل ہونے کا اہل قرار دیا گیا۔ اس انتقال مکانی سے قبل ہمارا سامان (جس کسی کے پاس تھا) جمع کر لیا گیا۔ پہننے کو ملیشیا اور خاکی رنگ کی ملی جلی وردیاں دی گئیں، سونے کے لیے دو دو کمبل اور ایک ایک دری۔ "کراکری" کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک پلیٹ، ایک مگ اور ایک چمچ۔ برتنوں کو چھوڑ کر ہر چیز پہ انگریزی میں پی۔ڈبلیو (PXW) یعنی "جنگی قیدی" کے جلی حروف کی چھاپ لگا دی گئی۔

ہماری روانگی کے وقت شریف کو سپاہیوں کے کیمپ میں منتقل کرنے کے لیے ہم سے جُدا کر لیا گیا۔ میں نے اس کے سنجیدہ چہرے پر تبسّم کی کہکشاں لوٹانے کے لیے "میں پرچون کیوں بیچوں" کی گدگدی کی۔ لیکن وہ آبدیدہ ہو گیا۔ ہم نے اسے باری باری گلے لگایا اور دلاسا دیا۔ بھارتی عملے سے پوچھا تو انہوں نے اپنے دھرم کی سوگند کھا کر کہا کہ آج ہی سہ پہر کو یہ اپنے کیمپ میں چلا جائیگا۔ لیکن شاید شریف کو کافر کی قسم کا اعتبار نہ تھا یا اسے ہماری بیوفائی کا گلہ تھا وہ آخری وقت تک رنجیدہ خاطر رہا۔ (اسی شام سپاہی شریف اپنے کیمپ میں پہنچ کر پھر چہچہانے لگا۔ صرف ہم اس کی "میں پرچون کیوں بیچوں" کی لَے سے محروم ہو گئے۔) ہم نے سپاہی شریف اور قیدِ تنہائی کے دوسرے مکینوں کو خدا حافظ کہا اور چل دیے ۔۔ رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو، منزل: کیمپ ۲ ہم

کیمپ نمبر ۴۴

کیمپ نمبر ۴۴ میں جیل اور عام کیمپ کے تمام محاسن موجود تھے، یعنی سخت جاں سلاخیں، زرد رو دیواریں اور قد آور فصیلیں جیل کی نمائندگی کرتی تھیں اور کیمپ کا ماحول پیدا کرنے کے لیے خاردار تار کی باڑھ، ہتھیار بند سنتریوں اور تربیت یافتہ کتّوں کا معقول بندوبست تھا۔ ان کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچے اونچے برجوں پر دو تین سپاہی رائفل، مشین گن، ٹیلیفون اور سرچ لائٹ° سنبھالے ہر وقت موجود رہتے تھے، یعنی قیدِ تنہائی سے آنے والوں کا دل بہلانے کے سبھی سامان موجود تھے۔

یہ انتظامات کیمپ نمبر ۴۴ ہی کے لیے مخصوص نہ تھے، بلکہ جیل کے اندر دوسرے کیمپوں (۴۳، ۴۸) میں بھی یہی انتظام تھا۔ تینوں کیمپوں میں باہمی رابطے کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک ہی کیمپ (۴۴ اور ۴۸) کے سپاہیوں اور افسروں کو آپس میں ملنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ (کیمپ ۴۳ میں افسر تھے ہی نہیں)، گویا ہر کیمپ کی اپنی اپنی کائنات تھی، دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

کیمپ ۴۴ جیل کے ایک کونے میں ہونے کی وجہ سے باہر کی دنیا سے نسبتاً قریب تھا۔ شروع شروع میں باہر شہنائی بجنے کی آواز آئی تو احساس ہوا۔

ایک دیوار کی دُوری ہے قفس
توڑ سکتے تو چمن میں ہوتے

° سرچ لائٹ (SEARCH LIGHT) چکا چوند کر دینے والی روشنی جو اندھیری راتوں میں جیل کے مشکوک گوشوں کو منوّر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔

لیکن جب خواہش اور اس کی تکمیل کے درمیانی مراحل پر غور کیا تو پتہ چلا کہ راستے میں کئی مقاماتِ آہ و فغاں آتے ہیں۔ مثلاً حکم یہ تھا کہ خاردار باڑ کے قریب کوئی پھٹکنے بھی نہ پائے، ورنہ گردن زدنی سمجھا جائے گا اور سنتری اسے فرار کی کوشش قرار دے کر گولی مارنے میں حق بجانب ہوگا۔ بفرضِ محال آپ نے سنتری کی آنکھ بچا کر یا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باڑ کے لمس کا لُطف اٹھا بھی لیا تو آگے سنتری کی گشت کا چار فٹ چوڑا راستہ حائل ہوگا۔ آپ کہیں گے چار فٹ تو آدمی ایک مضمحل سی جست میں بھی پار کر لیتا ہے۔ آپ کا کہنا بجا، لیکن جہاں چار فٹ راستہ ختم ہوتا تھا عین وہاں سے قدآور دیوار شروع ہوتی تھی۔ جسے سنگِ آستان سمجھ کر انسان اپنا سر تو پھوڑ سکتا تھا، لیکن پھلانگ نہیں سکتا تھا، کیونکہ اس کی اپنی بلندی کے علاوہ برج نشین سنتری بھی حائل رہتا تھا۔ یہ سنتری بھی عجب شے تھا۔ ہر وقت ہم پر یوں نظر جمائے رکھتا جیسے اسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ بس کبھی کبھار لتا منگیشکر کے گانے اپنی بھونڈی آواز میں گانے لگتا۔ لیکن اس سے ہمیں فرار کی منصوبہ بندی میں کوئی مدد نہ ملتی۔ چلئے سنتری کو چھوڑیئے مانا کہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یا موسمِ باد و باراں کا فائدہ اٹھا کر اس دیوار کو عبور کر لیا تو ستّر اسّی فٹ آگے ایسی ہی ایک اور دیوار آئے گی جس تک پہنچنے کے لیے خاردار تار کے گچھوں، پہریداروں کے رہائشی خیموں اور گشت کرتے کتّوں سے گزرنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آخری دیوار کے پار ایک بارونق سڑک پڑتی تھی جہاں پہنچتے ہی عین ممکن تھا کہ کسی راہگیر سے مڈبھیڑ ہو جائے اور وہ آپ کی پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ پہچان کر آپ کو تھانے پہنچا دے۔

جیل کے باسیوں کی حفاظت کے لیے ایک بریگیڈ مخصوص تھا۔ گارد عموماً مرکزی یا صوبائی پولیس کی ہوتی تھی۔ محافظوں کو ہدایت تھی کہ جب خطرے کی گھنٹی بجے، فائر کی آواز گونجے یا سائرن چیخے تو وہ پہلے سے بتائی گئی جگہوں پر پہنچ کر فائر پوزیشن (FIRE POSITION) سنبھال لیں اور جب تک حالات معمول پر آنے کا اعلان نہ ہو وہ لبلبی پر انگلی رکھے گھٹنوں کے بل تیّار رہیں۔ ان اقدامات کی ریہرسل روزانہ ہوتی تھی —— اسیروں کے لیے حکم تھا

کہ سٹینڈ ٹو[○] کا سائرن بجتے ہی وہ جہاں کہیں ہوں ننگے سر اور ننگے پاؤں کشاں کشاں اپنے کیج میں گھس جائیں تاکہ فوراً ان پر تالا ڈالا جا سکے۔

گویا یہ تھی وہ جنّت جس میں داخل ہونے کے لیے ہم عالمِ برزخ میں پڑے رہے۔

آئیے کیمپ کے اندر چلیں۔ کیمپ کا کُل سرمایہ قطار اندر قطار چار بیرکیں تھیں۔ ایک بڑی، دو چھوٹی اور ایک بہت ہی چھوٹی۔ موخر الذکر پر بیرک کی تہمت لگانے کی بجائے اسے کمرے کا رُتبہ دینا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ اس کے دامن کی وسعت عام رہائشی کمرے سے زیادہ نہ تھی۔ بمشکل پہلو سے پہلو ملا کر چار چار پائیاں بچھ سکتی تھیں۔ آخری بیرک جہاں پندرہ لیفٹیننٹ کرنل رہتے تھے زیادہ گنجان آباد نہ تھی، یعنی وہاں آدمی چارپائی سے اُتر کر زمین پر قدم رکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس دوسری بیرکیں جہاں نیم لفٹین سے لے کر سینئر میجر تک رہتے تھے یہ عالم تھا کہ سوتے میں کروٹ بدل لی جائے تو بازو دوسرے کی چھاتی پر جا پڑتا۔ اگر پڑوسی صاحبِ دل ہوتا تو اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے ہمسائے کے دل کی دھڑکنیں گن سکتا۔ اتنا قرب خاص خاص آدمیوں کو خاص خاص حالات ہی میں نصیب ہو سکتا ہے۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ درو دیوار جن کی خستگی پر ہم دو حرف بھیج رہے تھے دراصل کیمپ نمبر ۴۴ کا ہاؤس آف لارڈز (HOUSE OF LORDS) یعنی دارالامراء تھا۔ آدھا کیمپ تو ساتھ والی دیوار کے پار تھا جسے ہاؤس آف کامنز (HOUSE OF COMMONS) یعنی دارالعوام کہا جاتا تھا۔ موخر الذکر کی چند نمایاں خوبیاں یہ تھیں کہ وہاں فرش کچّے، غسلخانے کم اور برآمدے غائب تھے۔ ذرا نیچی سطح پر واقع ہونے کی وجہ سے بارش کا پانی اکثر وہاں کھڑا رہتا تھا؛ چنانچہ جونئر افسر عموماً وہیں رکھے جاتے تھے۔ اس نسبت سے بعض اوقات اسے جونئر بلاک بھی کہا جاتا۔

کیمپ کے ان دو ایوانوں کے درمیان ایک دیوار، چند سنتری اور بہت سے امتناعی

○ (STAND TO) چوکنّا رہنے کا حکم

احکام پڑتے تھے۔ ہم درمیانی دیوار کو دیوارِ برلن کہتے تھے، کیونکہ اسے پار کرنے کا موقع صرف عید، بقر عید پر ملتا تھا۔ اگر کسی اور وجہ سے ان دنوں کے علاوہ دیوار کے پار جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمارے لیے یہ دِن بھی روزِ عید ہی ہوتا۔

ہم سیلوں (CELLS) سے نکل کر سیدھے سینٹر بلاک یعنی دارالامراء میں آئے۔ پہلے پہل جب اس میں قدم رکھا تو محدود سے صحن میں بہت سے افسر سینوں میں داغ چھپائے، چھاتی پر پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ لگائے، زمین پر بیٹھے، دھوپ تاپتے نظر آئے۔ ہمیں ان کی قسمت پر بہت رشک آیا کہ دیکھو، دن دہاڑے دھوپ پھانک رہے ہیں۔ کوئی انہیں منع نہیں کرتا۔ یہ تجمل کیا صرف ہمارے لیے مخصوص تھا؟ یہاں تو لوگ آسمان بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چڑھتے ڈھلتے سورج کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ گویا پوری کائنات کا نظام ان کے سامنے ہے۔

ان افسروں نے ہمیں نہایت تپاک سے خوش آمدید کہا اور قیدِ تنہائی سے نجات پانے پر مبارکباد دی۔ پہلی پرکھ میں یہ سب مجھے تھکے ہارے، مسافت سے رنجور اور احساس زیاں سے چُور نظر آئے۔ اگر اس خاکستر میں کوئی چنگاری تھی بھی تو پہلے مصافحہ میں محسوس نہ ہوئی۔

ان ہم قفسوں سے تفصیلی ملاقات سے قبل ضروری تھا کہ ہم اپنی اپنی چارپائیاں سیدھی کرلیں۔ ان پر سرکاری دریاں بچھالیں، یعنی بقول میجر سمیع پہلے ذرا سیٹ (SET) ہو لیں۔ کلکتہ گروپ کے تینوں لیفٹیننٹ کرنل تو سب سے چھوٹے کمرے میں چلے گئے جو بعد میں وی آئی پی لاج (VIP LODGE) کے نام سے مشہور ہوا۔ ہم تینوں میجر بڑی بیرک میں قیام پذیر ہوئے۔ مَیں نے اس بیرک کی کشادگی کے پیشِ نظر چارپائی ذرا پھیلا کر بچھانا چاہی تو ایک پُرانے قیدی نے مشورہ دیا "اس جگہ پر قبضہ نہ کریں تو اچھا ہے، کیونکہ یہ خالی جگہ ہمارے بہت کام آتی ہے۔ ہم مغرب، عشا اور فجر کی نماز یہیں پڑھتے ہیں اور جب یہ عبادت گاہ نہیں ہوتی تو طعام گاہ ہوتی ہے، کیونکہ ہم سب اکٹھے بیٹھ کر یہیں کھانا کھاتے

ہیں۔" مَیں نے مشورہ قبول کر لیا اور بان کی چارپائی ایک طرف سکیڑ لی۔

بیرک کے باقی حصّے پر طائرانہ نگاہ ڈالی تو چارپائیاں ایک دوسرے سے یوں ہمکنار نظر آئیں جیسے طویل فراق کے بعد ملی ہوں۔ ان پر سرکاری دریاں اور کمبل بچھے ہوئے تھے اور ہر چارپائی کے سرہانے کے ساتھ زمین پر شیو وغیرہ کا سامان سجا ہوا تھا۔ بیرک کے دونوں جانب آہنی سلاخوں والی دروازہ نما کھڑکیاں تھیں جن سے سردیوں میں ٹھنڈی اور گرمیوں میں گرم ہوا کی آمد و رفت میں کوئی پرت یا پردہ حائل نہ تھا۔ اس طرح کا ایک کھڑکی نما دروازہ بیرک کے ایک سرے پر کھُلتا تھا، جہاں سے ہمارا آنا جانا رہتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے بستر تک پہنچنے کے لیے تقریباً سبھی بستروں کی دو رویہ قطار سے گزرنا پڑتا تھا — ہم نے بھی اپنا گدایانہ بستر سرِ رہگذار بچھا لیا۔

ہر بیرک کا نظم و نسق جس میں بیرک کی صفائی، مکینوں کی بھلائی اور دلصورت رنجش) صلح صفائی شامل تھی ایک سینئر باشندے کے سپرد تھی جسے بیرک سینئر (BARRACK SENIOR) یعنی بیرک کا نمائندہ کہا جاتا۔ وہ پورے کیمپ میں قیدیوں کے نمائندے یعنی (SENIOR SPOKESMAN) کے ماتحت ہوتا تھا۔ کمانڈ کے اس نکتے کو فوجی قاری ایک بٹالین کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کا رشتہ سمجھ لیں اور سویلین قاری کے لیے شاید کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کا تعلّق زیادہ عام فہم ہوگا۔

ہمارے بیرک سینئر نے اپنے فرائض بجا لاتے ہوئے پہلے روز ہی ہمیں آدابِ اسیری پر چھوٹا سا لیکچر پلا دیا۔ (اور کچھ پلانے کے لیے بیچارے کے پاس تھا بھی کچھ نہیں!) اس نے کہا "صبح اُٹھتے ہی اپنی چارپائی کو دوسری چارپائیوں کی سیدھ میں رکھ کر دری اور کمبل سے اس کی ستر پوشی کریں۔ پی ڈبلیو کی چھاپ کے بغیر کوئی لباس نہ پہنیں، ورنہ واپس سیل میں بھیج دیے جاؤ گے۔ بیرک سرِ شام بند ہو جاتی ہے اور دن چڑھے کھُلتی ہے۔ ایمرجنسی کے لیے اندر ایک بیت الخلاء ہے جسے حتیّٰ الامکان (؟) استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے، ورنہ چالیس افسروں

کا اس بیرک میں سونا دوبھر ہو جائے گا۔ کیمپ کے ایک سو اٹھارہ افسروں کے لیے مشترکہ صحن کے ایک گوشے میں دو غسلخانے اور چار بیت الخلاء موجود ہیں۔ وہاں خاصا رش رہتا ہے، اس لیے موزوں وقت کا انتخاب ہر قیدی کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کھانے پینے کا انتظام اپنے آدمیوں کے ہاتھ میں ہے۔ عام بھارتی سپاہی کے راشن کا ستّر فیصد ہمیں ملتا ہے جسے ہمارے جوان پکاتے ہیں، پلیٹ وغیرہ دھونے کو اردلی موجود ہیں۔ سکیل° چار افسر فی اردلی ہے؛ البتّہ کبھی کبھی ایک اردلی کو چھ افسر بھی مل جاتے ہیں۔"

اس کے بعد بیرک سینئر نے رازداری سے ہمارے سروں سے اپنا سر جوڑ کر گیٹ کی طرف احتیاطاً دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیمپ کے اندرونی حالات اور باہمی تنازعات پر نظر رکھنے کے لیے بھارتی عملہ اِدھر اُدھر منڈلاتا رہتا ہے، ان سے ہوشیار رہنا اور کوئی لفٹ نہ کرانا۔ ان سے نپٹنا ہمارے سینئر نمائندے کا کام ہے ..... البتّہ بھارتی کیمپ کمانڈنٹ آئے تو تعظیم سے پیش آنا کہ یہی ہے فرمایا ہوا جنیوا کنونشن کے بڑوں کا۔"

ان دنوں ہمارے سینئر نمائندے لیفٹیننٹ کرنل اشفاق علی سید تھے۔ ان کا کام قیدیوں اور بھارتی حکّام کے درمیان رابطے کا تھا، یعنی وہ کیمپ کمانڈنٹ کے احکام ہم تک پہنچاتے اور ہمارے مسائل کی اطلاع ان تک لے جاتے۔ کرنل صاحب اپنے مافی الضمیر کا اظہار انگریزی، اردو اور پنجابی میں یکساں روانی اور مہارت سے کر سکتے تھے۔ اگر ریڈ کراس کے کسی یورپی نمائندے یا انگریزی زدہ بھارتی افسر سے ان کا واسطہ پڑ جاتا تو انگریزی کی پٹاخ پٹاخ دُور دُور تک سنائی دیتی۔ (پتہ نہیں قریب کھڑے سامعین کا کیا حال ہوتا ہو گا!)، اگر کوئی اہلِ زبان یعنی اردو بولنے والا مل جاتا تو اُردوئے معلّٰی کے عمدہ نمونوں سے اسے مبہوت کر دیتے اور اگر قسمت کا مارا کوئی سکھ ان کے ہاتھ چڑھ جاتا، تو لاہوری بولی کی ایسی مار دیتے کہ اس کے

° SCALE پیمانہ، شرح

اوسان خطا ہو جاتے۔

کرنل سید کا واسطہ بھارتی لیفٹیننٹ کرنل اوپادھیا سے تھا، جسے فوج سے سبکدوشی کے بعد دوبارہ بُلوا کر ہماری دیکھ بھال کے لیے کیمپ کمانڈنٹ مقرّر کیا گیا تھا۔ کرنل اوپادھیا "گرم" اور "سرد" کی پالیسی پر عمل پیرا تھا، یعنی جب غصّے کی لہر آتی تو یوں لگتا کہ ہر چیز بہالے جائے گی، لیکن بادِ مخالف کے چند جھونکوں ہی سے فرو ہو جاتی اور وہ ہندوانہ چاپلوسی پر اُتر آتا۔ کچھ عرصہ بعد دیکھتا کہ اس کی نرم روی سے کیمپ کا انتظام ڈھیلا پڑ رہا ہے تو پھر سخت گیری پر اُتر آتا، یعنی وہ اتنا ملتفت نہ ہونا چاہتا تھا کہ ہمیں کنجِ قفس میں آزادی کا مزا آنے لگے اور اتنا سخت گیر نہ بننا چاہتا کہ ہم بغاوت پر اُتر آتے۔

اس انتظامی ڈھانچے کا عضوِ ضعیف اس کا طبّی شعبہ تھا، جس کا انچارج بھارتی فوج کی میڈیکل کور کا میجر ملک تھا۔ میجر ملک ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اسیر ہو کر درگئی میں چند مہینے پاکستانی مہمان نوازی کا مزا چکھ چکا تھا۔ اس کی تاثیر کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ وہ بھارت جاتے ہی فوج سے مستعفی ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں اسے دوبارہ بُلا لیا گیا اور جنگ ختم ہونے کے بعد سنٹرل جیل آگرہ کے طبّی امور اس کو سونپ دیے گئے۔

میجر ملک کے ماتحت تین کمروں پر مشتمل واحد ڈسپنسری تھی جو جیل کے پانچ ہزار مکینوں کی طبّی ضروریات پوری کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ محلِّ وقوع کے لحاظ سے ڈسپنسری ہمارے کیمپ سے قریب پڑتی تھی۔ دوسرے کیمپوں میں پاکستانی ڈاکٹر طبّی رپورٹ لیتے تھے۔ ان بیچاروں کے ہاتھ میں سینہ بین (STETHOSCOPE) کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ فوری توجہ طلب مریضوں کو ڈسپنسری بھیج دیتے، جہاں ایک گونہ بیخودی میں ڈوبا ہوا میجر ملک کسی کو مکسچر اور کسی کو ڈانٹ ڈپٹ پلا کر چلتا کرتا۔ میجر ملک اپنا اکثر وقت جیل سے باہر اپنی سوشل مصروفیات میں گزارتا اور صرف گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ڈسپنسری میں آکر سستا لیتا۔

میجر ملک ہمارے ڈاکٹروں کی طرح بے بس نہ تھا۔ وہ دراصل وسیع اختیارات رکھتا تھا۔

اگر وہ ابتدائی معائنے کے بعد کسی کو سپیشلسٹ (SPECIALIST) کے پاس ملٹری ہسپتال° یا جنگی قیدیوں کے خصوصی ہسپتال میں برائے تشخیص و علاج بھیجنا چاہتا تو بھیج سکتا تھا۔ لیکن گاڑی، گارڈ اور دیگر لوازمات کا کون بندوبست کرے۔۔! چھوڑو کیا بھیجنا ہے کسی کو جیل سے باہر۔! خواہ مخواہ اسے باہر کی ہوا لگ جائے گی۔!!

اسی میجر کے رحم و کرم پر کچھ ایسے زخمی اور بیمار بھی تھے جو ہمارے کیمپ کی باڑ کے پار ایک بیرک میں پڑے گل رہے تھے، ان میں کچھ وہ تھے جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں زخمی ہوئے تھے اور کچھ وہ جو اسیری میں مختلف عارضوں میں مبتلا ہوئے۔ ان سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ ساری ساری رات کراہتے رہتے اور نیم بے ہوشی کے عالم میں پانی کے گھونٹ کو ترستے رہتے۔ بعض تو جنونی کیفیت میں یا شدتِ درد سے دیواروں سے ٹکریں مارتے، لیکن ان کا مسیحا کوئی نہ تھا۔ ان کی طرف دن کو کوئی توجہ نہ دیتا تھا، رات کو ان کی کون سُنتا! ہم اپنے ہم وطنوں کی دردناک چیخیں سُن سکتے تھے، لیکن ان کے منہ میں پانی کا گھونٹ نہ ڈال سکتے تھے۔ ہائے اسیری تو کتنی بڑی لعنت ہے۔

اپنے ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتے تھے، بھارتی ڈاکٹر کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی بے بسی کے عالم میں ان زخمیوں اور بیماروں میں سے چند فوت ہو گئے اور کئی مستقل طور پر معذور اور پاگل ہو گئے۔ جو سخت جان واقع ہوئے تھے وہ بعد میں زخمیوں کی کھیپ میں پاکستان چلے آئے۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ!

گویا یہ تھی ہماری نئی دنیا اور اس کی فضا جس میں ہمیں تقریباً دو سال رہنا پڑا۔ ان طویل سالوں میں ہم پر کیا بیتی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ آیئے فی الحال اس کیمپ کے پرانے مکینوں سے تو مل لیں۔

° یہ دونوں ہسپتال آگرہ چھاؤنی میں تھے۔ ان کا مفصّل ذکر آگے آئے گا۔

حدیثِ دیگراں

کیمپ ۹۴ء میں تین طرح کے قیدی تھے۔ ایک وہ جو مارچ ۱۹۷۱ء کے ہنگامے میں بچ گئے، دوسرے وہ جو دسمبر کی جنگ میں پکڑے گئے اور تیسرے وہ جو ۱۶ دسمبر کے بعد "معاہدۂ جنگ بندی" کے تحت اسیر ہوئے۔

مارچ کے پُرآشوب دَور کی یادگار چھ افسر تھے جو برہمن باڑیہ، چاٹگانگ اور کشتیہ میں باغیوں کے ہاتھ چڑھے، لیکن گولی کا نشانہ بننے کے بجائے بھارتی مہمان نوازی کا ہدف بنے۔ ان کی جاں بخشی کی اصل وجہ تو ربِّ کریم کا فضل و کرم تھا، لیکن باغیوں نے اسے ان افسروں کے دیرینہ حُسنِ سلوک سے منسوب کیا۔ ان اسیروں میں دو لیفٹیننٹ کرنل، ایک میجر، ایک کیپٹن، ایک لیفٹیننٹ اور ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔

انہیں جب مشرقی پاکستان میں مختلف مقامات سے سمیٹ کر بھارتی حکّام کے حوالے کیا گیا تو نئے آقاؤں نے انہیں گرفتارِ بلا ہونے کا سبب یہ بتایا کہ تم لوگ پاسپورٹ اور ویزا (VISA) کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انتہائے شوق میں بھارت چلے آئے، لٰہذا تم مداخلتِ بے جا یا غیر قانونی داخلے (UNLAWFUL ENTRY) کی زد میں آگئے ——— واہ رے تری حیلہ سازی!

جنوری ۱۹۷۲ء میں جب دوسرے قیدی پہلی بار سنٹرل جیل آگرہ پہنچے، تو وہ مارچ ۱۹۷۱ء کے غم گساروں کو ان کی دگرگوں حالت کی وجہ سے پہچان نہ سکے۔ وہ باور ہی نہ کر سکتے تھے کہ ہڈیوں کے یہ ڈھانچے پاکستانی افسر بھی ہو سکتے ہیں۔ بعد میں جب ان خزاں رسیدہ

افراد نے اپنا اپنا تعارف کرایا تو ان کے پرانے آشنا ان کی دھندلائی ہوئی آنکھوں، زرد چہروں اور سفید بالوں میں چھپے ہوئے مانوس نقوش تلاش کرنے لگے، لیکن انہیں پہچاننے میں ان کے خدوخال کی بجائے ان کی آواز سے مدد ملی؛ اگرچہ ان کی آواز بھی اب جسم کے ساتھ ساتھ نحیف ہو چکی تھی، پھر بھی ان کے لہجے، تلفظ اور اندازِ بیاں میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی۔ نئے اسیر انہیں پہچان کر خوش بھی ہوئے اور ناخوش بھی۔ ناخوشی کی وجہ ان کی خستہ حالی تھی اور خوشی کا باعث ان کا بقیدِ حیات ہونا۔

مارشح میں گرفتار ہونے والے گروہ کے سب سے سینئر رکن لیفٹیننٹ کرنل ملک نے تعارفی گفتگو کے دوران بتایا کہ قید و بند کے ابتدائی ایام میں مجھے قیدِ تنہائی کے علاوہ ہتھکڑیوں میں بھی رکھا گیا، یہاں تک کہ وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کافی دنوں بعد ایک بار سکھ سنتری کو مسلمان جان کر نماز کی اجازت مانگی تو اس نے ایک ہاتھ کی کلائی سے ہتھکڑی اتار لی، لیکن ساتھ ہی دوسری کلائی والی ہتھکڑی کا سرا کس کر اپنی پیٹی سے باندھ لیا۔ ملک صاحب نے اسی حالت میں بارگاہِ ایزدی میں سجدہ دیا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سجدہ ان کی ساری نمازوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس ایک سجدے نے بندہ اور بندہ نواز کے درمیان ایک ایسا رشتہ پیدا کر دیا کہ وہ امید و بیم اور یاس و حسرت کی دیواروں سے نکل کر رجائیت کی ایسی بلندیوں پر جا کھڑے ہوئے جہاں وہ بھارت کے طرزِ عمل سے بے نیاز ہو گئے۔

یہ ایک سجدہ، جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

کرنل صاحب بظاہر سادہ لوح، لیکن درحقیقت بڑے کائیاں تھے۔ وہ برہمن باڑیہ سے لیکر آگرہ تک بھارتی منکر نکیر کے جھانسے میں نہ آئے۔ وہ ان کا ہر وار نہایت سادگی سے بے اثر بنا دیتے اور جو فقرے ان کو پھانسنے کے لیے کہے جاتے ان میں خود بھارتی افسروں کو پھنسا

دیتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ بتاتے ہوئے کرنل صاحب نے کہا کہ ایک بھارتی افسرِ تفتیش (INTERROGATOR) نے پہلی نشست ہی میں اوچھا وار کیا "کرنل صاحب! آپ ہمارے مہمان ہیں!" کرنل صاحب نے فوراً گرفت کرتے ہوئے اُلٹا سوال کر دیا "برخوردار! کیا تمہارے ملک میں مہمانوں کو جیل میں رکھنے کا رواج ہے؟" ____ بیچارہ لاجواب ہو گیا۔

آئیے اب دسمبر کی جنگ کے دوران پکڑے جانے والے ڈاکٹر صاحب سے ملیے۔ یہ لکشم (ضلع نواکھلی)، میں لڑائی کے عین عالمِ شباب میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تھے ____ لکشم سے آگرہ تک کا سفر تو خاصا طویل ہے۔ جیل میں پہنچ کر ان پر جو گزری اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ سب سے پہلے جیل میں آئے اور انہیں چھوٹی بیرک یعنی وی آئی پی لاج میں تنہا بند کر دیا گیا۔ چند روز قیدِ تنہائی میں گزار کر ان کا جی اُکتا گیا تو انہوں نے آہِ سحر گاہی کو ساتھ ملا کر دعا کی "اے باری تعالےٰ، اے مالکِ کونین! اے قادرِ مطلق! تُو اپنے فضل و کرم سے مجھے اس قیدِ تنہائی سے نجات دے یا کوئی ہم نشین بھیج دے"۔ اللہ تعالےٰ نے فوراً اپنے بندے کی فریاد سُنی اور چند دن بعد ایک نہیں، سینکڑوں ہم نشیں بھیج دیے ____ کون کہتا ہے اللہ اپنے بندوں کی نہیں سُنتا!

اب ۱۶ر دسمبر کے بعد اسیر ہو کر آگرہ آنے والوں کا حال سُنیے:

ڈھاکہ سے آنے والے میجر خان نے کہا کہ تم تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جرنیلوں کے ساتھ چلے آئے، لیکن تمہارے بعد رنج و الم کا جو سفر ہمیں کرنا پڑا وہ ساری عمر یاد رہے گا۔ سفر سے پہلے شام کو کہہ دیا جاتا کہ رات دو بجے تیار رہنا۔ ہم بستر کی رسّی اور ذہن کی طنابیں کس کر آدھی رات ہی کو اُٹھ کر بیٹھ جاتے۔ آدھی رات اور آدھا دن یوں زحمت کشِ انتظار رہتے، لیکن کہیں سے حکمِ سفر نہ ملتا۔ سہ پہر کو کوئی بھارتی کارندہ آتے جاتے کہہ جاتا کہ "روانگی آج نہیں، کل ہوگی، اس لیے آج رات ڈھائی بجے تیار رہنا" ____ پھر وہی تیاری، وہی ذہنی تناؤ، وہی بیقراری اور بالآخر وہی مایوسی! ____ ذہنی ایذا رسانی کی یہ ادا کئی روز جاری رہی۔

انتظارِ بسیار کے بعد ایک دن کوچ کا وقت آہی گیا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا رختِ سفر صلیب کی طرح کندھے پر اٹھایا اور ریلوے سٹیشن (ڈھاکہ چھاؤنی) کی طرف پیدل چل دیا۔ بھارتی گارد دونوں طرف ساتھ ساتھ مارچ (MARCH) کرتی اور بھارتی افسر جیپوں میں سوار اس مارچ کی نگرانی کرتے۔ ڈھاکہ چھاؤنی سے نرائن گنج گھاٹ پہنچنا تھا جس کے لیے ڈھاکہ شہر سے گزرنا ناگزیر تھا۔ بنگلہ دیش کی عمر ابھی بمشکل ایک ماہ تھی۔ وہ نوزائیدگی کے عالم میں چیخ چلّا رہا تھا۔ اس کے شور وشغب نے گالیوں اور طعنوں کی صورت اختیار کر لی تھی؛ چنانچہ جب آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی گاڑی ڈھاکہ شہر سے گزری تو پٹڑیوں کے دونوں جانب مشتعل ہجوم نے سنگ وحشت اور الزام و دشنام کی بارش تیز کر دی ــ اس پتھراؤ میں جسم کے سوا ہر شے زخمی ہوئی۔

یہ قافلہ نرائن گنج گھاٹ سے مقامی کشتیوں اور لانچوں (LAUNCHES) میں غروبِ آفتاب کے وقت روانہ ہوا۔ اور قریہ و بازار سے ہوتا ہوا کوئی چوبیس گھنٹے میں مومن گھاٹ پہنچا جہاں سے تین میل پیدل چل کر فرید پور جانا تھا۔ یہ مختصر سفر طے کرنے میں یوں تو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے تھا، لیکن یہ سفر زندگی کا طویل ترین سفر ثابت ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پاؤں کے ساتھ سوزش اور ندامت کے بھاری پتھر بندھے ہیں اور ایک قدم آگے بڑھانا زیست کی ایک تلخ گھڑی ٹالنے کے مترادف ہے۔

یہ سفر بھی دیدنی تھا۔ آگے آگے پاکستانی قیدی دھول اُڑاتے اور خاک چھانتے جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے اپنا اثاثہ چھوٹی سی پوٹلی کی صورت میں بغل میں دبوچ رکھا تھا اور کسی نے کمبل نما بستر کندھے پر اُٹھا رکھا تھا۔ اس قافلے کے پیچھے پیچھے بھارتی سپاہی تھے جو انہیں ہانکے جا رہے تھے۔ وہ انہیں تیز تر چلانے کے بہانے کبھی رائفل کے بٹ (BUTT) اور بوٹوں کی ٹھوکریں مارتے اور کبھی طعنہ و تشنیع کے نشتر چبھوتے۔ اِرد گرد بنگالی مرد و زن ڈھاکہ سے روانگی کا منظر دہرا رہے تھے۔ جاڑے کا ڈوبتا سورج اپنی پُر آشوب آنکھوں سے

یہ منظر مُڑ مُڑ کر دیکھ رہا تھا۔ پھیلتی شفق کے پرتو میں انسانی ڈھانچے گرد آلود خاکوں میں بدل رہے تھے۔ ان ڈھانچوں کے پیٹ بھوکے اور لب سُوکھے تھے —— یہ عجب شامِ غریباں تھی!

اتنے میں ایک مردِ مومن نے رسّی میں لپٹا ہوا بستر بارِ عصیاں کی طرح پرے پھینکا اور قبلہ رُو ہو کر شام کی اذان دینے لگا۔ اس کی آواز میں پتہ نہیں اللہ تعالےٰ نے کیا جادُو بھر دیا تھا کہ جونہی اللہ اکبر، اللہ اکبر کی فلک شگاف صدا بلند ہوئی، فضا میں اک ارتعاش پیدا ہوا۔ آواز ہوا کے دوش پر کانوں سے ٹکرائی اور سیدھی دلوں میں اُتر گئی۔ فضا تھرتھرانے لگی اور سُننے والوں کے دل دہلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ نعرۂ حق باطل کی تمام آوازوں پر چھا گیا۔

پانی نہ ملنے کی وجہ سے لوگ تیمّم کر کے امام صاحب کے پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ بے ہنگم ہجوم نے ایک منظّم جماعت کی صورت اختیار کر لی اور امام صاحب نے نہایت خضوع و خشوع سے قرأت شروع کی۔ شام کے سنّاٹے میں یہ آواز بجلی کی لہروں کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ ہندو ششدر کھڑے تھے۔ بنگالی ایک ایک کر کے سر کنے لگے اور جب باجماعت نمازیوں نے سلام پھیرا تو گرد و پیش سے ذلّت کے بادل چھٹ چکے تھے۔ بیہودہ نعرہ بازی دم توڑ چکی تھی۔ فضا خاموش تھی اور نمازیوں کے پُر تلاطم دلوں میں اک صبر، اک تشکّر، اک ٹھہراؤ، اور اک سکون آ چکا تھا۔

فرید پور ریلوے سٹیشن پر گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے تین چار روز کے زادِ راہ کے طور پر کچّی پکّی روٹیاں بوریوں میں بند کر کے اور اُبلی ہوئی پتلی دال بالٹیوں میں ڈال کر مسافروں کے حوالے کر دی گئی۔ گاڑی کے ڈبّے غلیظ اور اس کے محافظوں کی زبان غلیظ تر تھی۔ ایک صاحب نے اس گندگی اور بدنظمی پر دبی زبان میں تبصرہ کیا تو ایک سردار جی بولے "تُسیں کی گلاں کر دے او! آپاں تہانوں ککڑاں طراں ڈبے چ پا کے انڈیا پچا دینا اے۔ تُسیں ذرا ویکھو تے سہی"۔ ○

○ "آپ کیا باتیں کرتے ہیں! ہم آپ کو مرغوں کی طرح ڈبے میں بند کر کے بھارت پہنچا دیں گے، آپ ذرا دیکھیں تو سہی"

اور واقعی جب گاڑی چلی تو اس کی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر کے ڈربہ بنا دیا گیا۔ ان نیم تاریک ڈربوں میں قیدی اپنے اپنے نئے قفس کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی آٹھ پہر گزرنے نہ پائے تھے کہ دال اور چپاتیاں بدبو چھوڑ گئیں۔ انہیں کھانا تو درکنار، ڈبے میں ان کی موجودگی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ لیکن راہِ فرار کوئی نہ تھی۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش، سفر جاری رہا۔

پلبنہ سے آنے والے میجر جنجوعہ نے بتایا کہ ایک ایسے ہی ذلّت آمیز سفر پر روانہ ہونے سے چند روز پہلے ان کا ایک نوجوان ساتھی پلبنہ کے عارضی کیمپ سے بھاگ نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ دھرتی کا سینہ تنگ نہیں۔ یہیں کہیں روپوش ہو جاؤں گا، لیکن تھوڑی دُور ہی وہ دیہاتیوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ خلافِ توقّع انہوں نے اسے بوٹی بوٹی کرنے کی بجائے بھارتی افسروں کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے مکتی باہنی کے چند "آزادی پسند جیالوں" کو بُلا کر کہا "اسے اُدھر لے جاؤ اور بھاگنے کا مزہ چکھاؤ۔" اگلے روز جب اس مفرور کو واپس کیمپ میں لایا گیا تو وہ نیم بیہوش تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصّوں سے خون رس رہا تھا اور جہاں سے خون رس نہ سکا وہیں جم کر نیلا ہو گیا۔ اس کے بازو لوٹ چکے تھے اور ناخن انگلیوں سے نوچ لیے گئے تھے ——— کون کہتا ہے کہ ناخن سے گوشت جُدا نہیں ہوتا!

باقی ساتھی اس نیم مُردہ مجاہد کو اپنے ساتھ لے کر بھارت روانہ ہو گئے۔ پلبنہ سے روانگی کا منظر ڈھاکہ والے منظر سے ملتا جُلتا تھا۔

دھرما نگر کے راستے کومیلا سے آنے والے کیپٹن شیخ کا کہنا ہے کہ راستے میں ان کی ٹرین کے پچیس سو مسافروں کو خشک راشن دیا گیا تاکہ وہ بوقتِ ضرورت پکا کر کھا سکیں۔ پہلے تو اس دُور اندیشی کی داد دینے کو جی چاہا۔ لیکن جب گاڑی چل پڑی اور چلتی ہی رہی تو خیال آیا کہ چلتی گاڑی میں کھانا پکا کر کھانا کیا معنی؟ کیا ہمیں بچّے سمجھ کر خشک راشن کا کھلونا دے کر بہلایا گیا ہے؟

آخر اڑتالیس گھنٹے بعد ایک ویران سی جگہ پر گاڑی رُکی اور دو گھنٹے کے اندر اندر کام ود ہن

کی خدمت سے فارغ ہونے کا حکم صادر ہوا۔ پچیس سو آدمیوں کے لیے کھانا پکانا اور تقسیم کرنا اور کھانا۔ فقط دو گھنٹے میں! اس کرم سے بہتر تھا کہ کرم نہ کرتے!

کھانا پکانے کے لیے یونٹوں کے باورچی ساتھ تھے اور ان میں سے بعض دُور اندیش باورچی اپنے دیگچے بھی اٹھا لائے تھے، کیونکہ ان کے پاس ساتھ لانے کو اور کچھ نہ تھا لیکن اصل مسئلہ دال اُبالنے کا نہیں، بلکہ چپاتیاں پکانے کا تھا، کیونکہ لوہے کے توے یا تنور وغیرہ کا نام و نشان نہ تھا۔ بھارت کی طرف سے اس کام کے لیے ایک نالی دار چادر (CORRUGATED SHEET) مہیّا کی گئی جس پر چپاتیاں پکانے کی کوشش کی گئی۔ آٹے کا جو حصّہ چادر کے گرم بل پر پڑتا، فوراً جل جاتا۔ اور جو کم گرم بل پر پڑتا، کچّا رہ جاتا۔ روٹی اُتارنے سے پہلے ہی خام اور پختہ حصّوں میں بٹ جاتی۔ بھلا کچّے اور پکّے کا کیا میل! جس کسی کے ہاتھ جو حصّہ آیا، اس نے منہ میں ڈالا، نگلے سے منہ لگایا اور پانی کی دھار کی مدد سے اسے حلق سے نیچے اُتار دیا۔ یوں ڈنر دو گھنٹے میں تمام ہوا۔

فینی (FENI) سے آنے والے لیفٹیننٹ چودھری نے بتایا کہ وہ جتنے دن تلیامورا (اگرتلہ) کے عارضی کیمپ میں رہے، سخت قحط سالی اور بدحالی کا شکار رہے۔ الگ الگ کیمپ میں افسروں اور جوانوں کو ایک ایک چپاتی فی کس دی جاتی۔ اکثر اس شرح سے بھی روٹیاں پوری نہ ہوتیں اور آخری آدمی محروم رہ جاتے۔ کسی کے ہاتھ چپاتی آتی اور کسی کے ہاتھ فقط قناعت کا دامن۔ کئی ہمدرد لوگوں نے دونوں ہاتھوں سے روٹی مروڑ کر دو حصّوں میں تقسیم کی اور ہاتھ لمبا کر کے آدھا حصّہ باڑ کے پار دوسرے ہم وطنوں کو دے دیا اور خود آدھی روٹی پر اکتفا کی۔ ایسے میں نانِ جویں کا یہ حقیر ٹکڑا دولتِ جم و کَے سے بڑھ کر تھا۔

رنگپور کی طرف سے آنے والے کیپٹن سیّد نے بتایا کہ مشرقی پاکستان سے منتقلی کے وقت اس کے دل میں آئی کہ کیوں نہ اسیری کے بندھن مضبوط تر ہونے سے پہلے ہی کوششِ فرار کی جائے۔ اس نے ہمّت باندھی اور بھاگ نکلا۔ ساتھی سمجھے، لو، چند دنوں میں پاکستان پہنچ

جائے گا، لیکن قسمت کا مارا بھارت کے وسیع پیٹ کی انتڑیوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ پکڑا گیا۔ اس کو جو سزا ملی، اس کی مختصر روئیداد خود انہی کی زبانی سنیے " مجھے پہلے تو خوب زدوکوب کیا گیا، کئی روز قیدِ تنہائی میں رکھا گیا اور کھانے پینے کو کچھ نہ دیا گیا۔ بھاگنے کی ناکام کوشش کے بعد یہ سب کچھ متوقع تھا۔ لیکن جب مجھے سرِ بازار رُسوا کیا گیا، تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میرے کپڑے اُتروا کر منہ کالا کر دیا گیا اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر شہر کے بارونق بازاروں میں پیدل پھرایا گیا۔ سرکاری طور پر رائفلوں کے کُندوں اور سنگینوں کی نوک سے تواضع کی گئی اور شہریوں کی طرف سے گالی گلوچ کے ساتھ ساتھ بازاری غلاظت مجھ پر پھینکی گئی۔ یا خُدا! گنہگار ہوں، کافر تو نہیں ہوں، کیا جنیوا کنونشن میں ناکام فرار کی یہی سزا ہے؟"

جلیسور سے آنے والے میجر آغا نے بتایا کہ جب وہ آگرہ اسٹیشن پر اُترے، تو وہاں ایک بڑا ہجوم نظر آیا، لیکن یہ ہجوم بنگلہ دیش کے ہجوم سے قطعی مختلف تھا۔ یہاں لوگ دیکھتے زیادہ اور بولتے کم تھے۔ اپنے ہم وطنوں پر اپنی برتری کی دھاک بٹھانے کے لیے لیفٹیننٹ کرنل گھن پتی نے سب پاکستانی افسروں اور جوانوں کو پلیٹ فارم پر کھڑا کر کے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ پھر حُکم دیا کہ پلیٹ فارم پر بیٹھ جاؤ اور سر جھکائے رکھو، گویا اس ملک کی رسم ہے کہ کوئی مسلمان نہ سر اُٹھا کے چلے۔

لیکن جنہوں نے سر جھکانے کی بجائے سر کٹوانے کی تربیت لی ہو وہ ایسے احکام کی تعمیل کیسے کرتے! ان کی حکم عدولی سے گھن پتی اپنی گھِن سے لبریز زبان کو کُتّے کی دم کی طرح تیز تیز چلانے لگا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ مسلّح گارد کی موجودگی میں کوئی بھی آگے بڑھ کر اس کی زبان نہیں کھینچ سکے گا۔ اس نے چنگھاڑتے ہوئے کہا، "تم ... ہو، تم ... ہو، تم نے بنگلہ دیش میں غیر انسانی مظالم ڈھائے ہیں۔ اسکے بعد تم کسی انسانی سلوک کے مستحق نہیں رہے، نیچے دیکھو، احمقو نیچے دیکھو، تم ...."○

○ (LOOK DOWN, YOU IDIOTS) گھن پتی کے سارے الفاظ غلیظ اور ناقابلِ برداشت تھے۔ انہیں ہو بہو ضبطِ تحریر میں لانا شائستگی کے خلاف ہے۔

ذلّت و رسوائی کی مختلف منزلوں سے ان گزرنے والوں سے مَیں نے پوچھا کہ کہیں بھارت کے عام مسلمانوں کا ردِّ عمل بھی دیکھنے میں آیا۔ ایک نے جواب دیا "ہاں جب ہم یو پی کے ایک غیر معروف اسٹیشن پر رُکے تو چند مسلمان ملے، مبہوت و ششدر، چند ایک آبدیدہ، ایک نے موقع پاکر کہا کہ پہلے جب بھی ہم پر فرقہ وارانہ فسادات کے بہانے ستم ڈھائے جاتے تھے، ہماری نگاہیں پاکستان کی جانب اُٹھتی تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ مضبوط پاکستان کی بغل میں رہ کر بھارت کو مسلمانوں کی نسل کُشی کی ہمت نہیں پڑے گی۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن اب بھی ہم پاکستان ہی کی طرف دیکھتے ہیں، اور کہاں دیکھیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو مضبوط اور طاقت ور بنائے۔

میرے اس جملۂ معترضہ کے بعد میجر آغا نے اپنی بات کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے کہا کہ جب ہم آگرہ اسٹیشن سے جیل پہنچے تو ہمیں ڈھور ڈنگروں کی طرح خالی بیرکوں میں بند کر دیا گیا جہاں نہ بستر تھا نہ چارپائی، نہ کمبل تھا نہ رضائی، نہ کھانا تھا نہ پانی۔ بس جنوری کی یخ بستہ بیرکوں کے ٹھنڈے فرش تھے اور ہم۔ سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کبھی ایک دوسرے سے لپٹتے اور کبھی اُٹھ کر پی ٹی کرنے لگتے۔ جب تک بھوکے پیٹ کے ساتھ اُچھلتے کودتے رہتے سردی پاس کھڑی تماشا دیکھتی رہتی اور جونہی ہم تھک کر بیٹھ جاتے، ہمیں آدبوچتی۔

میجر راجہ جو دوسرے اسیروں کے ساتھ اوّلیں قافلے میں جیل پہنچے تھے ان کا کہنا تھا کہ شروع شروع میں جیل میں کھانا تقسیم کرنے کا انتظام نہایت ہتک آمیز تھا۔ رواج یہ تھا کہ بھارتی عملہ بالٹی میں دال اور ٹوکرے میں روٹیاں لدوا کر کیج کے دروازے پر آتا۔ ہر افسر کیج کے اندر سے اپنا میس ٹِن○ آگے کرتا اور جو کچھ اس میں نازل ہوتا، بصد شکر قبول کر کے واپس اپنی جگہ پر آکر کھانے لگتا۔ جو دروازے پر دیر سے پہنچتے، اس نعمت سے محروم رہتے۔

ایک سو اٹھارہ افسروں کے اس کیمپ میں بے شمار داستانیں تھیں۔ داستانیں

○ (MESS TIN) ٹین کا بنا ہوا گولائی مائل چوکور برتن جس میں عموماً سپاہیوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔

کیا تھیں زخمِ جگر تھے جو اب کچھ کچھ مندمل ہونے لگے تھے۔ مَیں نے ان سب کو کرید کر زخموں کے منہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ بس انہی دو چار لوگوں کی زبانی مشرقی پاکستان سے سنٹرل جیل آگرہ تک کے سفر کا حال سُن کر اندازہ کر لیا کہ

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار

○ ○

سنٹرل جیل : دارالامراء

دارالامراء میں جن عجائبات نے سب سے پہلے دامنِ دل کھینچا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ یہاں لوگ بلیڈوں کی نایابی کا رونا رونے کے ساتھ ساتھ ہر ہفتے شیو بھی بنا لیتے اور صابن ناپید ہونے کے باوجود دوسرے چوتھے روز نہا بھی لیتے تھے، بلکہ ایک صاحب نے تو عیاشی کی حد کر دی۔ وہ سرکاری دری پر تکیہ لگائے محوِ استراحت تھے۔ غضب خدا کا! ہمیں مچھروں سے مدافعت کی خاطر اوڑھنے کو چادر نہیں ملتی، یہ تکیہ لگائے تھے۔ ان سے یہ خصوصی رعایت کیوں؟ ہمارے دل میں کچھ شک اور کچھ حسد کے جذبات اُبلنے لگے۔ ذہن فارغ تھا ہم نے فوراً اسے تفتیش پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موصوف کی استراحت کا سرچشمہ بھارتی فیاضی نہیں، بلکہ اس کے اپنے ذہن کی زرخیزی ہے۔ اس نے فالتو وردیاں اور کپڑے سرکاری تولیے میں سی کر سرہانہ بنا لیا تھا — چلو بُری کیا — لیکن اس نے سوئی دھاگہ کہاں سے لیا؟

اگرچہ اب قیدیوں کو ان کے عہدے کے مطابق گزارہ الاؤنس ملنا شروع ہو گیا تھا° — لیکن ان سے بلیڈ، صابن، تکیہ، تولیہ، چادر یا ضرورت کی دوسری چیزیں خریدنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بس ہر ماہ مطبوعہ پرچیوں کی صورت میں الاؤنس جاری کر دیا جاتا۔ اور لوگ اس خصوصی کرنسی کو کبھی دری کے نیچے، کبھی گریبان کے چاک میں یوں سنبھال سنبھال کر رکھتے جیسے یہ کاغذ کے پرزے نہیں، بلکہ دل کے ٹکڑے ہیں۔ ان کے استعمال میں بھی اسی کفایت شعاری اور احتیاط سے کام لیتے۔ وہی افسر جو عام حالات میں دس پندرہ روپے کسی دوست کی تواضع پر

° نیم لفٹین سے کیپٹن تک کو بانوے روپے ماہوار۔ میجر اور لیفٹیننٹ کرنل کو ایک سو دس روپے ماہوار

صرف کر دینا روز کا معمول سمجھتے تھے، اب ایک ایک روپے° بلکہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے۔ ان افسروں کے دل تو اب بھی بڑے تھے لیکن ان کی ماہوار آمدنی سکڑ کر ان کے اصل مشاہرے کا صرف دس بیس فیصد رہ گئی تھی —— قلت ہر شے کی قدر بڑھا دیتی ہے!

کچھ عرصہ بعد کنٹین (CANTEEN) اور ٹھیکیدار کا بندوبست ہو گیا اور اس کی وساطت سے بازار سے چیزیں آنے لگیں۔ اس خصوصی اہتمام کا احساس مجھے ایک روز کھانے کی چٹائی پر ہوا، جہاں پیاز کے چھلکے سلاد کے روپ میں سبزی کی ہمسری کر رہے تھے۔ ہائیں! یہ فالتو پیاز کہاں سے آ گئے؟ کیا گانٹھ کے پکے بھارت نے فالتو "اشو" (ISSUE) کر دیے؟ پتہ چلا کہ یہ جنسِ نایاب صاحبِ ثروت لوگوں نے اپنے قیمتی کوپن خرچ کر کے مہنگے داموں خریدی ہے۔ "کلکتہ گروپ" کی جیبیں ابھی خالی تھیں؛ چنانچہ صاحبِ استطاعت قیدیوں میں سے ایک نے پیاز کے چند چھلکے مجھ جیسے غریب الدیار کو بھی پیش کیے۔ میں نے بارِ احسان سے سر جھکاتے ہوئے یہ تحفہ قبول کر لیا —— اسیری میں پہلی بار سلاد کھایا، مزہ آ گیا —— کہتے ہیں پیاز ویسے بھی مقوّیِ قلب ہوتا ہے۔

کھانے کی فرشی نشست پر ہر کوئی خود کفیل تھا، یعنی کوئی کسی سے پلیٹ، مگ، چمچ یا کوئی اور چیز مانگنے یا مستعار دینے کی توفیق نہ رکھتا تھا، لیکن پھر بھی اکٹھے مل بیٹھنے سے ایک یگانگت کا رشتہ پیدا ہو چلا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھنے والے میجر سمیع اکثر میرا خیال رکھتے۔ مثلاً تانبے کے گلاس میں پانی کم ہو جاتا تو مٹکے سے اسے بھر دیتے۔ اگر انہیں کوئی پیاز کے دو چھلکے پیش کرتا تو ایک مجھے دے دیتے —— وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کے وسائل بڑھتے گئے تو ان کی عنایات بھی بے حساب ہوتی گئیں۔

میرے، میجر سمیع اور دوسرے دو افسروں کیلئے جو اردلی مقرر ہوا تھا، اسکا نام کاظمی تھا۔ وہ لاہور کا رہنے والا اور میٹرک تک پڑھا ہوا تھا۔ لنگر سے مقررہ مقدار سے زیادہ سبزی ڈلوانا، دال پر

° یہ کوپن (COUPON) کہلاتے تھے اور رشوت کے طور پر بھارتی عملے کو قابلِ قبول نہ تھے، صرف کیمپ کی کنٹین میں استعمال ہو سکتے تھے۔

ذراسی "تڑی" چھڑکوانا اور شدید ایمرجنسی میں ایک آدھ چپاتی مہیا کر لینا، کامیاب اردلی کی نشانیاں تھیں۔ کاظمی ان سب خوبیوں سے مزیّن تھا جب تک لنگر کے وسائل ساتھ دیتے، کاظمی ہمارے مطالبات پورے کرتا رہتا؛ البتہ کبھی کبھی اس کا دستِ رسا خالی بھی آجاتا، کیونکہ جب کنواں ہی خشک ہو جائے تو بہشتی کا کیا قصور!

کھانے پر کاظمی اور میجر سمیع کے مکالمے شنیدنی ہوتے۔ میجر سمیع خالص افسرانہ رعب کے ساتھ انگریزی لہجے میں کاظمی کو لنگر سے بُلاتے۔

"کیظمی!"

"یس سر!" ـــــ وہ دُور سے جواب دیتا

"کم ہیر" ـــــ (اِدھر آؤ)

"کمنگ سَر" ـــــ (آرہا ہوں جناب!)

"ہری اپ" ـــــ (جلدی آؤ)

"آل رائٹ سر!" ـــــ (بہت اچھا جناب)

اتنے میں کاظمی ہانپتا ہوا سامنے آکھڑا ہوتا ـــــ سمیع صاحب فوراً لہجے میں یگانگت کا رس گھول کر کہتے "یار! تھوڑی سی دال تو لادو ـــــ وہ سراپا انکسار بن کر جواب دیتا۔ "سر دال تو ختم ہو گئی، دیگچہ بھی دھو ڈالا" ـــــ سمیع پھر افسرانہ شان بحال کر کے انگریزی پہ اُتر آتے: "NEVER MIND, YOU CAN GO" ○

میجر سمیع تقریباً ہر کھانے کے دوران مزید چپاتی دال یا سبزی کا مطالبہ کرتے۔ بعض کوتاہ اندیش سمجھے کہ شاید کھانا ان کی کمزوری ہے، لیکن مجھ جیسے رازداں جانتے تھے کہ میجر سمیع کے اس رویّے کے پیچھے ایک ایسا فلسفہ کارفرما ہے جو پاکستان سے محبت رکھنے والا شخص ہی دیارِ غیر میں اپنا سکتا ہے۔ ایک دن میجر سمیع نے یہ راز سرِ عام فاش کر دیا۔ انہوں نے

○ کوئی بات نہیں، تم جا سکتے ہو۔

قائدِ ملت مرحوم کے انداز میں ہوا میں مُکا لہرا کر کہا "ہمارا نعرہ ! زیادہ کھاؤ، غریبی بڑھاؤ"۔° انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ اگر ہر قیدی ان کے نعرے کو اپنا کر دونوں وقت ایک ایک چپاتی ضرورت سے زیادہ کھانا شروع کر دے تو ترانوے ہزار قیدی ایک ماہ میں بھارت سرکار کو اتنے ہزار ٹن کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ (میجر سمیع کا تعلق آرمی سروس کور سے تھا) ہم میں سے اکثر نے یہ نعرہ ضرورتاً یا انتقاماً اپنا لیا۔

میجر سمیع کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کرنے میں البتہ دو چیزیں حائل تھیں۔ ایک بھوک کی کمی، دوسرے کھانے کا گھٹیا معیار۔ لیکن ان حالات میں بھی انہوں نے اپنے نعرے کو قابلِ عمل ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل دی کہ کیا ہوا اگر ہم اپنی مجبوری کی وجہ سے کھانے کا معیار بلند نہیں کر سکتے، بھوک تو تیز کر سکتے ہیں۔ صبح کی پی ٹی میں ٹرخانے کی بجائے ذرا جانفشانی سے کام لیا جائے تو خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ جو پی ٹی نہیں کر سکتے وہ شام کو والی بال کھیل سکتے ہیں۔ جو کچھ نہیں کر سکتے وہ بیرکوں کے گرد چکر لگا سکتے ہیں۔ اگر ارادہ مصمّم ہو تو کوئی رکاوٹ راستہ نہیں روک سکتی۔●

"WHERE THERE IS A WILL THERE IS A WAY"

چنانچہ اگلے روز میں پی ٹی کرنے والے افسروں میں جا شامل ہوا، لیکن وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہر کوئی بھوک بڑھانے کے لیے حسبِ توفیق دو چار بار اوپر نیچے ہو لیتا ہوگا، لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ لوگ سچ مچ پی ٹی کر رہے ہیں، گویا وہ قید میں نہیں، پی ٹی کورس پر آئے ہیں۔ ایک تربیت یافتہ گوریلا افسر نے انسٹرکٹر کے اختیارات سنبھالے ہوئے ہیں اور باقی سب اس کے اشارے پر کبھی جھک کر زمین بوس ہو جاتے ہیں اور کبھی اچھل کر آسمان سے تارے نوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پسینہ بہہ رہا ہے، خاکی پتلون بھیگ چکی ہے، جبیں سے

° ان دنوں بھارتی سیاست میں "غریبی ہٹاؤ" کی مہم کانگرس کا ترپ کا پتہ تھی۔

● عزمِ صمیم کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

عرقِ مشقّت کے قطرے منہ میں ٹپک رہے ہیں، لیکن پی ٹی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سوچا کیسے ناشکرے ہیں! اللہ تعالےٰ نے جی بھر کر سونے اور آرام کرنے کی مہلت دی ہے، اور یہ خون پسینہ ایک کر رہے ہیں!

سرکاری احکام کے مطابق مجھ پر بھی پی ٹی فرض تھی، لیکن اپنے ڈاکٹر کی سفارش سے پی ٹی گراؤنڈ میں حاضری دے کر اپنی مرضی کی ورزش کرنے کی رعایت پالی تھی۔ ایک آنریری مشیر نے میرے لیے دو ورزشیں تجویز کیں۔ اوّل: آنکھوں کی ورزش یعنی کھڑے کھڑے بھارتی پہریدار سے لیکر جیل کی چھت پر رومان لڑاتے کبوتروں کے جوڑوں تک ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا۔ دوم: کانوں کی ورزش یعنی کیمپ کے حکاّم نے قیدیوں کی اجتماعی سمع خراشی کے لیے جو لاؤڈ سپیکر لگا رکھا تھا، اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا کیونکہ مشیرِ باتدبیر کے بقول کانوں میں انگلیاں یا روئی ٹھونسنے سے کان محفوظ نہیں، بلکہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے مُفت مشورہ قبول کرتے ہوئے ہر دو ورزشیں شروع کر دیں۔

لیکن چند روز بعد سینئر قیدیوں اور مخلص ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان ورزشوں سے میری گزر اوقات نہیں ہو گی، کیونکہ اسیری کے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف آنکھوں اور کانوں کی ورزش کافی نہیں، بلکہ پورے جسم کی دیکھ بھال ضروری ہے، اس لیے لازم ہے کہ مَیں شام کو والی بال کھیلا کروں۔ مَیں نے ان کی بھی مان لی اور اسی شام والی بال گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر غرور سے پُھولی ہوئی گیند کو تھپڑ رسید کرنے لگا، لیکن تھپڑ مارنے اور کھیلنے میں ضرور کچھ فرق ہوتا ہو گا۔ ورنہ اچھے کھلاڑی مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ اتنی کثرت سے تبدیل نہ کرتے۔ مثلاً پہلے انہوں نے میرے قدوقامت کے لحاظ سے مجھے نیٹ (NET) پر کھڑا کیا۔ مَیں گیند کو ہاتھ لگانے لگتا تو نیٹ (NET) کو چُھو لیتا۔ میرے ہاتھ اسیری سے پہلے تو ایسے گستاخ نہ تھے۔ کبھی زلفِ یار کی طرف بڑھتے ہوئے رُخِ یار کو نہ چھُوتے تھے۔ پتہ نہیں اسیری میں یہ سارا رکھ رکھاؤ کیوں بھُول گئے۔ لاکھ سمجھایا، نہ سمجھے۔ کھلاڑیوں نے مجھے مجبوراً صفِ آخر میں

لاکھڑا کیا، لیکن وہاں بھی باہر جاتی گیند کو خواہ مخواہ چھُو لیتا اور سامنے گِرنے والی گیند کو اگلے کھلاڑی کی ذمہ داری سمجھ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھتا۔ دونوں ہی کوتاہیاں تھیں، لیکن بھلا ہو والی بال کھیلنے والوں کا کہ انہوں نے میری لغزشوں کو دامنِ عفو میں جگہ دی اور میں والی بال "کھیلتا" رہا۔

والی بال گراؤنڈ میں دست و بازو کے علاوہ پھیپھڑوں کی ورزش کا بھی خاص انتظام تھا۔ یعنی کیا کھلاڑی کیا تماشائی، سب خوب شور و غل مچاتے۔ مثلاً کسی نے سروس (SERVICE) کی تو حاضرین نے بآوازِ بلند دوسری ٹیم کو فوراً مشورہ دیا "چھوڑ دو، اؤٹ جا رہی ہے"۔ کسی نے شارٹ لگایا تو پہلے ہی سے بیک آواز پیش گوئی ہوئی "اوگئی نیٹ وچ" اور بعض اوقات گیند اس پیش گوئی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے واقعی نیٹ میں جا اُلجھتی۔

جن قیدیوں کے ذوقِ سلیم پر یہ کھیل گراں گزرتا تھا یا جن کے انتہائے شوق کے باوجود بھیڑ کی وجہ سے انہیں گراؤنڈ میں جگہ نہ ملتی تھی، وہ بیرک کے گرد "چکر" لگا کر جان بناتے۔ ان "چکر" کھانے والوں میں بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے۔ مثلاً تین تین، چار چار نوجوان قدم سے قدم ملائے، ٹھپ ٹھپ بھاگتے رہتے، پسینہ چھوٹ جاتا اور سانس پھول جاتا، لیکن یہ چوبیس "چکر" لگا کر تین میل پورے کیے بغیر دم نہ لیتے۔ ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر قیدی چلتے چلتے دوڑنے لگتا اور دوڑتے دوڑتے چلنے لگتا اور یوں دس چکر پورے کرتا۔ اسی طرح ایک عمر رسیدہ بزرگ اتھلیٹ کے پوز (POSE) میں ایک گھٹنا اور دونوں پنجے زمین پر ٹکائے، نظریں سامنے جمائے، چند لمحے پَر تولے رہتے۔ گویا "ابھی گو" (GO) کا حکم ملنے پر تیر کی طرح چھوٹیں گے اور پھر شاید ہی رُکیں۔ چند لمحوں بعد خود ہی اپنے آپ کو "گو" کہتے اور اُچھل کر دوڑ پڑتے، لیکن بمشکل پانچ چھ گز جا کر رُک جاتے۔ ان کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ محترم اپنا انجن چیک کرتے رہتے ہیں کہ سٹارٹ ہوتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہ اپنے وطن نیم مُردہ باڈی نہیں لے جانا چاہتے۔ ان کے علاوہ کئی افسر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں خراماں خراماں بیرک کے گرد پھرتے، گپ شپ لگاتے رہتے تاآنکہ اذان کی آواز ان کے کان میں پڑتی اور وہ مُٹھی میں سمیٹی

ہوئی دوپلّی ٹوپیاں نکال کر مسجد کی طرف چل دیتے۔

نماز کے لیے بُلاوا بلاناغہ پانچوں وقت آتا اور تقریباً سبھی لوگ باجماعت نماز میں شریک ہوتے۔ نماز کے بعد کچھ اجتماعی اور کچھ انفرادی دعائیں مانگی جاتیں، مثلاً "یا اللہ! مسلمانوں کو کافروں پر فتح نصیب کر"۔ "یا اللہ! پاکستان کو استحکام عطا فرما"۔ "یا اللہ! ہمارے لواحقین کو صبر عطا فرما"۔ یا انفرادی سطح پر "اے باری تعالیٰ! کیپٹن زیدؔ کی والدہ کو جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے جنّت میں جگہ دے"۔ "باری تعالیٰ! میجر بکرؔ کے بچّے کو بیماری سے شفا عطا فرما"۔ "باری تعالیٰ! لیفٹیننٹ عمرؔ کی گھریلو پریشانیاں دُور کر"۔ وغیرہ وغیرہ۔

نماز سے پہلے اور بعد عموماً تلاوت کا دَور چلتا۔ شروع شروع میں جب قرآنِ پاک کے نسخے کم تھے تو تلاوت کے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ وہی نسخہ کوئی صبح پڑھتا، کوئی دوپہر کو اور کوئی شام کو۔ جو لوگ قرآنِ مجید سے مستفید ہونے کی سعادت سے آج تک محروم تھے انہوں نے ناظرہ پڑھنے کی ابتدا کی۔ جو پہلے پڑھنا جانتے تھے انہوں نے اسے سمجھنا شروع کیا اور جو سمجھتے تھے انہوں نے اس پر غور و فکر کا آغاز کیا۔ زیادہ جاننے والوں نے کم جاننے والوں کو اپنے علم سے فیضیاب کیا اور کم جاننے والوں نے کم تر جاننے والوں کو۔ اس طرح دیے سے دیا جلا کر ہم نے تقریباً سارا گھر چراغاں کر لیا۔

ہماری اس عبادت گزاری پر بھارت کے مختلف افراد نے اپنی اپنی فکر کے مطابق مختلف انداز میں تبصرہ کیا۔ ایک سنتری "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کی پانچ وقتہ صدائیں سُن سُن کر اُکتا گیا تو کہنے لگا "یہ ہر وقت اکبر اکبر کو پکارتے رہتے ہیں اور وہ ان کی سُنتا ہی نہیں"۔ ایک دُنیادار بنیئے نے ہمیں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں پے در پے ادا کرتے دیکھا تو کہنے لگا "ان کے دھرم میں کمائی کا کون سا وقت رہ جاتا ہے؟" اسی طرح دن رات اللہ ہُو، اللہ ہُو کا وِرد سُن سُن کر ایک خدا ترس برہمن بولا "ایسے پجاریوں پر بنگلہ دیش میں لُوٹ مار اور قتل و غارت کا الزام لگانا سراسر زیادتی ہے۔ یہ تو سارے کے سارے پجاری ہیں پجاری!"

لیکن سارا وقت والی بال یا نماز و تلاوت میں بسر کرنا مشکل تھا، لہٰذا اکثر افسروں نے سوچا کہ فارغ وقت کا بہترین مصرف مطالعہ ہے۔ لیکن مطالعہ کیسے کرتے؟ کتابیں نایاب تھیں۔ بھارت کی طرف سے جو زہر آلود مواد تقسیم کیا جاتا ہم اسے ملتے ہی لنگر میں نذرِ آتش کر دیتے۔ البتہ سیکولرزم کے پرچار کے لیے جو ہفت روزہ "جمہوریت اور آزادی" بہ اہتمامِ خاص ہمارے لیے چھپتا، اس کا یہ حشر نہ ہوتا تھا ــ یہ انگریزی اور اُردو میں خوبصورت چکنے کاغذ پر چھپتا اور ہمارے بہت کام آتا مثلاً ہم کھانا کھاتے وقت اسے دسترخوان کے طور پر بچھا لیتے یا زمین پر پھیلا کر صابن، شیشہ، تیل وغیرہ سجا دیتے یا باہر دھوپ میں بیٹھنے کو دری نہ ملتی تو اس کے چند شمارے ملا کر کام چلا لیتے۔ ایک ہفتے بعد کاغذ میلا ہو جاتا، تو نئے بچھا لیتے۔ کنجوسی کس بات کی! بھارت کی دین تھی اور وہ بھی خاص ہمارے لیے، کیوں نہ جی بھر کر استعمال کرتے۔

ایک دفعہ ایک افسر کو یہ ہفت روزہ پڑھتے دیکھ کر ہر کسی نے اسے "ہُوٹ" (HOOT) کرنا شروع کر دیا اور "غدار اے" ــ "غدار اے" کے نعرے لگنے لگے۔ وہ بیچارہ بار بار اپنی صفائی میں کہتا کہ "مجھ سے قسم لے لو جو میں نے ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔ میں تو ممتا ° کی تصویر دیکھ رہا تھا، یارو، اتنا سا قصور تو معاف کر دو" ــ "چلو معاف کیا" کا باجماعت فیصلہ صادر ہوا اور بات ختم ہو گئی۔

کتابوں کی اس قحط سالی میں میجر جعفر بڑے خوشحال نکلے۔ ان کے پاس چھ کتابیں تھیں ــ بلا مبالغہ پوری چھ۔ موضوع میں زیادہ تنوع نہ سہی، عمدہ ذوق کی تسکین کا سامان ضرور تھا۔ آپ ان کتابوں کی مدد سے اسلام کا نظریہ، امام غزالیؒ کا فلسفہ، علامہ اقبالؒ کی شاعری اور اسد اللہ خان غالبؔ کے حالاتِ زندگی سے باخبر ہو سکتے تھے ــ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ساقی بڑا دریا دل تھا۔ جام پہ جام دینے کی بجائے مینا بھی لنڈھانے کو تیار تھا۔ اگر ایک آدمی بانگِ درا پڑھ کر واپس کرتا، تو میجر جعفر کہتے "بالِ جبریل لے جائیے، بانگِ درا سے بڑھ کر ہے"۔

° بھارت کی مقبول فلم ایکٹرس

میجر جعفر کی اس فیاضی اور دریا دلی کا شکریہ کیونکر ادا کیا جائے!

ہم نے میجر جعفر کی کتابوں کا سہارا لیکر سنٹرل جیل آگرہ میں یومِ اقبال منا ڈالا۔ اقبالؒ کے متعلق سوجھ بوجھ زیادہ نہ سہی، عقیدت بہت تھی؛ چنانچہ ہر کسی نے اس تقریب میں شرکت کرنی چاہی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مَیں نے کالج کے زمانے میں ایک مرتبہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی پر تقریر کی تھی، لہٰذا مَیں آپ کو خودی کے معانی سمجھاؤں گا۔ دوسرے صاحب بولے "مَیں فوجی مصروفیات کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں علاّمہ کے فلسفے کی گتھیاں سلجھاؤں گا"۔ اس طرح کی چار پانچ پیش کشوں کے بعد ہم ایک صبح ایک بیرک میں جمع ہوئے۔ ایک سینئر افسر کو صدر منتخب کیا اور جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے کیا۔ کسی نے اقبالؒ کے فلسفۂ خودی پر تقریر کی تو کسی نے "اقبالؒ کے مردِ مومن" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ کسی نے اس کے فلسفی ہونے پر زور دیا تو کسی نے اس کے شاعر نہ ہونے پر۔ یہ تقریب کوئی دو گھنٹے جاری رہی۔

تقریب کے اختتام پر ایک ساتھی نے علاّمہ اقبالؒ کے یہ شعر گا کر ہمارے حوصلے بلند کر دیے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند	قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے	مشک ہو جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر	کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

یومِ اقبالؒ ادبی طور پر ہی نہیں موسمی لحاظ سے بھی تقریباً موسمِ بہار میں پڑتا ہے۔ لیکن آگرہ میں یومِ اقبالؒ کے موقع پر خاصی گرمی تھی، گویا آتشِ گل کی بجائے آتشِ آفتاب برس رہی تھی۔ حیرت ہوئی کہ چند ہفتوں میں درجۂ حرارت ساٹھ ستّر سے یکدم ایک سو پندرہ کیسے ہو گیا۔

ابھی موسمِ سرما کا زوال تھا، ابھی موسمِ گرما شباب پر کیسے آگیا۔ کیا ایک کا زوال لازماً دوسرے کا شباب ہے؟ بھلے وقتوں میں تو درمیان میں موسمِ بہار بھی پڑتا تھا۔ کیا اس بار نکہتِ گل اور بوئے سمن کا موسم آیا ہی نہیں یا اسیروں سے کترا کر گزر گیا؟

کس سے پوچھیں بہار کی باتیں
اب صبا بھی اِدھر نہیں آتی

گرمیوں کے عین شباب میں جی تو بہت چاہا کہ ٹھنڈے اور میٹھے آموں کے رسیا غالب کی جنم بھومی میں بیٹھ کر چچا کی یاد تازہ کریں۔ ٹھنڈے آموں کی بالٹیاں آگے رکھ کر غالب کے شعر اور لطیفے سُنائیں۔ لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت۔۔۔۔ ہم لے دے کر کھجور کے پتّوں کا ایک پنکھا حاصل کر پائے جس سے صبح ۹ بجے سے شام ۶ بجے اور رات آٹھ بجے سے صبح ۲ بجے تک لُو اور حبس کا تدارک کرنے کی سعی کرتے رہتے۔ لیکن بھرپور کوشش کے باوجود نہ لُو کی شدت میں فرق آیا نہ رات کے حبس کا زور ٹُوٹا۔

ہم رات کو حبس کی وجہ سے سو نہ سکتے تو پہریدار خواہ مخواہ پریشان رہتے کہ یہ فرار ہونے کے لیے مناسب موقع کی تاک میں ہیں۔ دن کو پہریدار سایۂ دیوار میں کھڑے رہتے اور ہم فرش کو گیلا کر کے دریوں پر لیٹ جاتے۔ آہنی سلاخوں والی کُھلی کھڑکیوں سے لُو سیدھی آتی جس سے ہمارا سارا جسم جُھلس جاتا۔ کھڑکی سے ہٹ کر دیوار کا سہارا لیتے تو اس کی تپتی اینٹیں فوراً پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتیں۔ زمین پر گرایا ہوا پانی ہمارے جسم کی گرمی سے غائب ہو جاتا یا اسے لُو اُڑا لے جاتی۔ بہرحال ہمارا منہ سُوکھنے سے پہلے زمین کا چہرہ خشک ہو جاتا۔ پانی کی تلاش میں نِکلتے تو نلکے "شاں شاں" کی صدائیں بلند کر کے خود شدّتِ پیاس سے نڈھال ہونے کا اعلان کرتے۔

ہوئی جن سے توقّع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اب درجۂ حرارت ایک سو بیس تک پہنچ چکا تھا اور پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی لازمی پی ٹی کا حکم منسوخ نہیں ہوا تھا۔ حکمِ حاکم تھا کہ مرگِ مفاجات واقع ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن ہندو کا کہنا نہیں ٹلے گا۔ ڈاکٹروں نے دلیل دی کہ سپاہی کے لیے روزانہ ۳۲۰۰ کلوریز (CALORIES) درکار ہیں اور عام آدمی کے لیے ۲۵۰۰۔ اور ہمیں جو خوراک ملتی ہے، اس میں بمشکل پندرہ سو کلوریز (CALORIES) ہوتی ہیں۔ بدن میں قوّتِ مدافعت تقریباً ختم ہو چکی ہے، لوگ بیہوش ہو جائیں گے، گر جائیں گے، مر جائیں گے، پی ٹی معاف کر دو۔ لیکن بھارتی آقاؤں کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ حتیٰ کہ ملحقہ کیمپ میں سپاہی انور حبس سے بیہوش ہو کر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا۔ اس کی موت سے بھارتی حکّام کی آنکھیں کھُلیں اور انہوں نے پی ٹی معاف کر دی۔ پی ٹی معاف کرانے کے لیے انسانی جان کی قربانی دینی پڑی۔

دشتِ غربت کے یہ تپتے دن گزارنے کا مقبول ترین طریقہ یہ تھا کہ سب لوگ انڈرویئر (UNDERWEAR) پہن کر ہاتھ میں کھجور کے پتّوں کا پنکھا لیے ریڈیو پاکستان سے اپنے عزیز و اقارب کے پیغام سُن کر ٹھنڈک حاصل کرتے، اگرچہ روزانہ صرف دس پندرہ قیدیوں کیلئے پیغام نشر ہوتے اور ان میں شاذونادر ہی کوئی ہمارے کیمپ کے باسی کے لیے ہوتا۔ لیکن سب لوگ سارے پیغام توجّہ سے سُنتے۔ یہ پیغام اگرچہ مختلف افراد کے نام ہوتے، تاہم ان میں لپٹی ہوئی بُوئے وطن سب کے لیے یکساں تھی۔ ان سینکڑوں نشری پیغامات میں سے دو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک اَن پڑھ دیہاتی باپ کا اور دوسرا ایک تعلیم یافتہ فوجی افسر کا۔ دونوں کے الفاظ اور اسلوبِ بیان الگ الگ لیکن مضمون ایک تھا۔

دیہاتی باپ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا :

"پُترا تیرا بال بچّہ خیریں مہریں اے، تے تنخواہ وی باقاعدہ ملدی اے۔ گھر دی فکر نہ کریں تے پُتر گھبرائیں نہ۔ مصیبتاں جنیاں تے ای پیندیاں آیاں نیں۔ تے جنیاں طراں ای رہویں۔

رب راکھا" ○

فوجی افسر نے انہی جذبات کو ان الفاظ میں ادا کیا:

● HELLO SONNY ! KEEP YOUR CHIN UP_DON'T WORRY ABOUT HOME-CARRY ON !

اگر حاضرین میں سے کسی کے رشتہ دار کی آواز بر دوشِ ہوا کیج (CAGE) میں پہنچ جاتی تو سب خوشی سے اُچھلنے لگتے اور اس خوش قسمت کو پاکستان سے براہِ راست خیریت کی خبر پانے پر مبارکباد دیتے، بلکہ اہتمامِ ضیافت کے لیے اس سے روپے دو روپے کے کوپن بھی وصول کر لیتے۔ ایک فرد کی خوشی سے ساری محفل کھل اُٹھتی۔

ان پیغامات کے جواب لکھنے اور اپنی خیریت کی اطلاع پاکستان بھیجنے کے لیے قیدیوں کو ہر ماہ گنتی کے کارڈ اور لفافے ملتے تھے؛ چنانچہ انہی گرمیوں میں دوسرے قیدیوں کی طرح کلکتہ گروپ کو بھی اپنے وطن سے رابطہ قائم کرنے کے لیے دو لفافے اور دو کارڈ فی کس ملے۔ ذاتی طور پر میرے لیے جیل سے اپنے لواحقین کو مخاطب کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ خط کا آغاز کرتے وقت دل دھڑکا، ہاتھ کانپا، قلم جھجکا۔ کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں۔ جی چاہا کہ سارا بارِ غم کاغذ پر منتقل کر کے ہلکا ہو جاؤں۔ پھر سوچا اس سے نہ صرف پڑھنے والوں کو پریشانی ہوگی، بلکہ بھارت کا سنسر شپ (CENSORSHIP) کا محکمہ اسے آگے نہیں جانے دے گا؛ چنانچہ فیصلہ کیا کہ دو الگ الگ نوعیّت کے خط لکھے جائیں۔ ایک صرف بھارتی سنسر والوں کی خاطر اور دوسرا اپنے گھر والوں کے لیے۔ اوّل الذکر میں اپنے شب و روز کے کانٹے چُن چُن کر پرو دیے اور کلفتِ غم مٹانے کے لیے کھری کھری سُنا دیں کہ قید و بند میں ڈال کر انہوں نے میرے دل میں

○ بیٹے تمہارا بال بچہ خیریت سے ہے اور تنخواہ بھی باقاعدگی سے ملتی ہے۔ گھر کی فکر نہ کرنا اور بیٹے گھبرانا نہیں مصیبتیں ہمیشہ مردوں پر ہی آتی ہیں، للٰہذا مردوں کی طرح رہنا۔ خدا حافظ

● ہیلو بیٹے۔ اپنا سر بلند رکھو، گھر کی فکر نہ کرو اور اپنا کام جاری رکھو۔

نفرت کے نقوش گہرے کر دیے ہیں اور موخر الذکر میں صرف پھولوں کی پنکھڑیاں سمو دیں تاکہ

اس رنجِ بے کسی کی یارب خبر نہ پہنچے

جاتے نہ شامِ غربت سر پیٹتی وطن میں

مَیں نے یہ دونوں خط لکھ کر کیمپ والوں کے حوالے کر دیے اور انتظار میں بیٹھ گیا کہ دیکھئے کس طرف سے پہلے جواب آتا ہے۔ آیا بھارتی عملہ مجھے سزاوارِ جفا گردانتا ہے یا اہلِ وطن ہدیہ تحسین بھیجتے ہیں، لیکن افسوس کہیں سے بھی جواب نہ آیا۔ محتسبوں کی بے اعتنائی کا تو گلہ نہ تھا، لیکن اہلِ وطن کی بے رُخی پر صدمہ ضرور ہوا، کیونکہ اس عرصے میں دوسروں کے علاوہ کلکتہ گروپ والوں کے خطوں کے جواب بھی مل گئے تھے، لیکن مَیں محروم رہا۔ دوست احباب تسلّی دیتے۔ مَیں خود ان کے سامنے خط آنے نہ آنے کی اہمیت سے سراسر انکار کر دیتا، لیکن دل ہی دل میں کئی وسوسے اُٹھنے لگے۔ کیا بھارتی عملے نے میرے تلخ خط کی سزا کے طور پر میری ڈاک روک لی ہے؟ کیا میرے عزیز و اقارب مجھے بھول گئے ہیں؟ کیا سارا حلقۂ احباب بے مروّت نکلا؟ کیا تمام رشتہ داروں نے رشتہ توڑ لیا؟ دل طرح طرح کے گِلے گھڑنے لگا۔

گلشن کے طائروں نے کیا بے مروّتی کی

یک برگِ گُل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا

جب بھی باہر والا گیٹ کھُلتا اور خطوں کے منتظر نعرہ لگاتے "جنٹلمین لیٹرز°" تو مَیں بھی اشتیاق بھری نگاہوں سے نام پکار پکار کر خط تقسیم کرنے والے افسر کی طرف دیکھتا رہتا۔ کسی کے حِصّے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار خط آتے لیکن میرا نام کبھی نہ پکارا گیا۔ قید میں پہلی بار احساس ہوا کہ خط کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

کچھ یہ اندرونی خلش، کچھ موسمی تپش، کچھ سوزِ دروں، کچھ ستمِ بروں، لیل و نہار بوجھل ہونے لگے۔ سارا دن تیشہ چلاتے تو کوہِ حیات سے بمشکل ایک دن چھیل پاتے۔ اگلے دن پھر وہی تیشہ اور وہی

° (GENTLEMEN! THE LETTERS) حضرات! خطوط

کوہِ گراں۔ اس پر طُرّہ یہ کہ بھارت نے جنگی جرائم کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے تو ہم اسے مذاق سمجھتے رہے اور ایک دوسرے کو خوشدلی سے "جنگی مجرم" بھی کہہ جاتے، لیکن جوں جوں معاملہ سنگین ہوتا گیا، ہم اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ بھارتی اخبار اور ریڈیو ان "جنگی مجرموں" کی تعداد چند سو اور کبھی چند ہزار بتاتا۔ جس طرح بھی شمار کرتے افسر تو سبھی اس زمرے میں آتے، کیونکہ جنگی جرائم کی نوعیّت یا جنگی مجرموں کی وضاحت کبھی نہ کی گئی۔

دنیا کے دوسرے بہت سے مسائل کی طرح جنگی جرائم کے مسئلے پر بھی دو آرا تھیں۔ کچھ تو یہ موضوع چھڑتے ہی اپنی معصومیت کا پرچار کرنے لگتے۔ ان کا مؤقف یہ ہوتا۔

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

لیکن ایسے آدمیوں کی تعداد محدود تھی۔ اکثر مردانِ پاک طینت سرِ عام کہتے کہ ہم نے عروسِ وطن کی قبا کو رفو کرنے کے لیے کئی ٹانکے لگائے۔ اگر اس کے دوران کسی کو ٹھیس پہنچی ہو تو کہہ نہیں سکتے، لیکن ہمارا ضمیر گواہ ہے کہ یہ ٹانکے ہم نے دریدہ قبا کے متاثرہ حصّوں پر لگائے اور بہت احتیاط سے لگائے۔ اس خیال کی تائید میں دوسرے کہتے "ہاں، ہم ایفائے عہد کی خاطر حاکمِ وقت کے احکام بجا لائے ہیں۔ اگر اس جرمِ وفا پر اب ہمیں دار پر بھی کھینچ دیا جائے، تو اُف نہیں کریں گے۔ آخر فوج میں آئے کس لیے تھے ـــ!"

جنگی جرائم کا چرچا عروج پر تھا کہ پاک و بھارت میں بات چیت کی طرح پڑی۔ اس کے ساتھ ہی کشتِ امید میں کلیاں کِھلنے لگیں۔ نگاہیں شملے کی ٹھنڈی اور پُرفضا بلندیوں کا طواف کرنے لگیں۔ جیسا کہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں، قیدی تو چھوٹی سے چھوٹی بات سے اپنی رہائی کا پہلو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تو سربراہوں کی کانفرنس تھی، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔

ہم کانفرنس سے متعلق تمام خبریں اور اخباری تبصرے سنتے۔ ایک فقرے سے امید بندھتی تو دوسرے سے ٹوٹ جاتی۔ ہم ریڈیو پاکستان کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو، بی بی سی، وائس آف امریکہ،

ریڈیو پیکنگ اور ریڈیو ماسکو سنتے۔ پھر بیٹھ کر تجزیہ کرتے کہ ان میں کون سچا ہے۔ عموماً یہ تجزیہ ذاتی محسوسات ہی کا عکس ہوتا۔ یعنی اگر تجزیہ کرنے والا رجائیت پسند ہوتا تو "لو، شوق کی ترسی ہوئی شب ہوگئی آخر" کا مژدہ سناتا اور اس کی تائید میں ان خبروں اور تبصروں سے کئی فقرے سناتا اور اگر تشریح کرنے والا تصویر کا تاریک رُخ دیکھنے کا عادی ہوتا، تو کہتا ابھی کچھ عرصہ اور تسبیحِ روز و شب کے دانے گنتے رہو، کیونکہ اس شبِ تار کے جلد ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ مبصر بھی اپنے موقف کی حمایت میں انہی خبروں اور تبصروں سے کئی فقرے پیش کر دیتا۔

آخر شملہ کانفرنس ختم ہوئی۔ رات گئے خوشخبری آئی کہ سمجھوتہ ہو گیا، تفصیلات کا اعلان صبح ہوگا۔ سمجھوتے سے مراد ہم نے جھٹ اپنی رہائی کا سمجھوتہ لیا۔ کئی خوشی سے ناچنے لگے۔ صبح کو تفصیلات معلوم ہوئیں تو ان سے ہماری فوری رہائی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا، لیکن اس کے باوجود مجموعی تاثر خوشی اور کامیابی کا تھا، کیونکہ پاک سرزمین کو یوں میز پر بیٹھے بیٹھے بھارتی نجاست سے خالی کروا لینا سفارتی تدبّر کا کوئی ادنیٰ کارنامہ نہ تھا۔ ہمارا کیا ہے، اب نہیں تو چند ماہ و سال کے بعد وطن چلے جائیں گے ——— "گر آج تجھ سے جُدا ہیں، تو کل بہم ہوں گے۔"

اس عوامی تاثر کو ایک جواں سال کیپٹن نے بپھرے ہوئے انداز میں اس طرح ادا کیا:

"صدر بھٹو کے لاہور پہنچنے پر اگر میری ماں، بہن یا بھائی اس کا دامن پکڑ کر تقاضا کرے کہ میرا بیٹا یا بھائی کیوں نہیں لائے، تو بیشک میری طرف سے ان کو گولی مار دی جائے۔ ہم دو چار سال میں یہاں پگھل نہیں جائیں گے۔" ——— باقی لوگوں نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: "ہاں، ملکی مفاد کی قربانی دے کر رہا ہونا ہمیں منظور نہیں۔ بھارت نے ہماری رہائی کیلئے ضرور ایسی شرائط رکھی ہوں گی جن کے قبول کرنے سے ہمارے قومی مفاد کو ٹھیس پہنچتی ہو گی، ورنہ صدر بھٹو ہمیں چھوڑ کر جانے والے نہ تھے۔ ان کا دل ہمارے مسئلے سے غافل نہیں۔"

شملہ سمجھوتے کی کنکریاں ہمارے جذبات کے سمندر میں تھوڑی سی ہلچل مچا کر تہ میں بیٹھ گئیں۔ سطحِ آب پر پھر سکوں آگیا۔ ہم پھر آئندہ پاک و بھارت بات چیت کی راہ دیکھنے لگے۔

شملہ کانفرنس کے بعد دوسرے تیسرے روز لیفٹیننٹ کرنل اپادھیا آیا۔ خلافِ معمول ہشّاش بشّاش، متبسم اور ملنسار۔ ہم سمجھے ضرور کوئی خوشخبری لایا ہے۔ ضرور شملہ سمجھوتے کی کسی خفیہ شق کا اسے پتہ چل گیا ہے اور ہمیں بتانے آیا ہے۔ اس نے باہر بیٹھے ہوئے چند افسروں کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا، وہ شوق سے کھچے کھچے گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ ہم دُور بیٹھے سامعین کے چہروں سے خبر کا اندازہ لگانے لگے، اتنے میں اپادھیا نے باقی سارے افسروں کو بھی اکٹھا کرنے کو کہا۔ اب ساری خوش فہمی یقین میں بدل گئی۔ ہم سب اپنی مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر باہر آ گئے۔ ایڈجوٹنٹ، کوارٹر ماسٹر، صوبیدار، حوالدار، آٹھ دس سپاہی۔ ہم حیران تھے کہ خوشخبری سُنانے کے لیے اتنے گواہوں کی بھلا کیا ضرورت تھی! رہائی کی خبر تو ہم زبانی طیور کی بھی سُننے کو تیار تھے۔ یہ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم کہیں خوشی سے پاگل ہو کر ہر چیز تہس نہس کر دیں گے؟ بھئی ہمیں اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ ذرا کہو تو.... !

اپادھیا نے یکدم پینترا بدل کر کہا "کوئی افسر بیرک میں نہ جائے۔ مَیں ہر افسر کی تلاشی لوُں گا اور میرا سٹاف بیرک کی۔" اس اعلان کے ساتھ ہی سٹاف بیرک کھنگالنے لگا۔ مجھے شک گزرا کہ مَیں نے حقیر پُرزوں پر جو یادداشتیں لکھ رکھی ہیں، شاید ساری تقریب انہی کی ضبطی کے لیے ہے۔ میری نگاہ بار بار بیرک کی طرف اُٹھتی جہاں بھارتی عملہ دری ایک طرف پھینک رہا تھا، چارپائی کو اُلٹ کر دیکھ رہا تھا، تکیے کا جگر چیر رہا تھا، ٹوتھ پیسٹ کی ہوا نکال رہا تھا، حجامت کی مشین کھول کر دیکھ رہا تھا، یا اللہ! ان کی ایسی کون سی قیمتی شے گم ہو گئی ہے جس کے لیے اتنی چھان بین ہو رہی ہے۔ آخر کار ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ تلاشِ بسیار کے بعد پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ کے بغیر ایک انڈر ویئر (UNDERWEAR) ان کے ہاتھ آ ہی گیا۔

ادھر اپادھیا "وی آئی پی لاج" میں سب کو باری باری بلا کر جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ مَیں بھی اس تجربے سے گزرا۔ وہ بھارتی کرنسی تلاش کرنے کے بہانے ہر چیز ٹٹولنے لگا۔ اس جستجو میں

اس کے ہاتھ کئی چیزیں لگیں، لیکن گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ آخری افسر کی تلاشی لے کر کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا باہر آ گیا اور ہم سے آنکھیں چراتا گیٹ سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک صاحب نے مجھے کہا "اگر کبھی فرار کی صورت بنے تو پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ کے بغیر کپڑوں کا ایک جوڑا میں دے سکتا ہوں۔" دوسرا بولا "میرے پاس بھارتی کرنسی کے ایک سو بتیس روپے ہیں۔ جب ضرورت پڑے آپ لے سکتے ہیں۔ اپادھیا اور اس کا ان پڑھ عملہ تو کیا، اگر حکومتِ ہند کے محکمۂ کسٹم کا سارا اسٹاف بھی آ جائے تو اس دفینے کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔"

لوگ ابھی اپادھیا کی تازہ ترین حرکت پر تبصرہ ہی کر رہے تھے کہ مجھے درخت کے نیچے بھارتی حجام خلافِ معمول بیکار کھڑا نظر آیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً حجامت بنوانے کا فیصلہ کیا۔ حجام کے پاس گیا تو اس نے "نمستے" کہہ کر میرا سواگت کیا۔ میں نے بنچ پر بیٹھ کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً میرے سر پر مشین چلانی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد سر پر ہاتھ پھیرا تو بالکل فارغ البال پایا۔ آپ پوچھیں گے کہ بال کیسے بنائے، تو ٹھہریئے ذرا شیشہ دیکھ کر بتاتا ہوں۔ یہ دیکھئے بالکل قیدیوں جیسے، کہیں سے بڑے کہیں سے چھوٹے.... چلو کوئی بات نہیں، وطن واپس جانے تک ایک جیسے ہو جائیں گے۔

میں حجامت کروا کر ابھی کپڑے جھاڑ ہی رہا تھا کہ ایک اور صاحب آ گئے اور کہنے لگے "منّے ذرا شیو بنا دو۔" اس نے تھوڑا سا پانی لگا کر بازو کے زور سے اُسترا نئے شکار کے گالوں پر چلانا شروع کر دیا۔ گند استرے سے بچنے کی خاطر مضروب نے پہلو بدلا اور اپنی کوفت کو فراموش کرنے کی خاطر مجھے کہنے لگا "آپ کو پتہ ہے ہمارا حجام ماشاءاللہ مسلمان ہے۔" میں نے مُڑ کر اپنے ہیئر ڈریسر (HAIR DRESSER) کی شکل صورت کا معائنہ کیا اور تصدیق چاہی تو اس نے کہا "جی ہاں میرا نام عبدالسلام ہے۔" میں نے پوچھا "پھر مُنّا کیوں کہلواتے ہو؟" کہنے

لگا" اس نام سے ہندو یا مسلمان ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ وقت اچھا پاس ہو جاتا ہے۔ مسلمان نام سے ہمارے کئی افسر چڑتے ہیں۔۔۔۔ بس نوکری کا معاملہ ہے۔ ایک دفعہ روزگار چھن جائے تو بڑی مشکل سے ملتا ہے" ——— واقعی بعض اوقات پیٹ کے تقاضے مذہب کے تقاضوں پر غالب آجاتے ہیں۔

اپادھیا، منّے اور ان کے دیگر ہم وطنوں کے متعلق مَیں نے کیا رائے قائم کی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ آئیے یہ باب ختم کرنے سے پہلے اپنے ہم وطنوں کے کردار اور نفسیات کے بارے میں چند مشاہدات اور تاثرات رقم کر لیں۔

پہلا مشاہدہ یہ تھا کہ دار الامرا میں ابتدائی چند ماہ قیام کے دوران جب کبھی المیۂ پاکستان اور سقوطِ ڈھاکہ کا ذکر ہوتا تو عموماً شخصیات زیرِ بحث آتیں اور چھوٹے منہ بڑے لوگوں کے متعلق بے دریغ رائے زنی کرتے۔ شخصیات کی اس بحث میں بعض اوقات مجھے بھی گھسیٹنے کی کوشش کی گئی، تو مَیں نے ایک دانا کے قول میں پناہ ڈھونڈ لی۔ مَیں نے موٹے حروف میں یہ مقولہ لکھ کر اپنی چارپائی کے پاس دیوار پر چسپاں کر دیا کہ "چھوٹے آدمی شخصیات پر بحث کرتے ہیں، اوسط آدمی واقعات پر اور اعلیٰ آدمی نظریات پر"۔ لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی صاحب آ کر پوچھ بیٹھتے "سالک صاحب جنرل نیازی کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟" یعنی وہ "شخصیت" کی نہیں نظریے کی بات کر رہے ہیں۔ اسیری کے دوسرے سال شخصیات کے متعلق یہ اندازِ فکر یکسر بدل چکا تھا۔

دوسرے مشاہدے کا تعلق ڈسپلن سے تھا۔ جوں جوں بھارتی رویے میں ذلت، تضحیک اور طعن کا عنصر بڑھتا گیا، ہماری صفوں میں اتحاد بڑھتا گیا اور جب بھارتی عملے کا کوئی رُکن حکم سُنانے آتا تو اسے صاف صاف سُنا دیتے کہ جو کچھ کہنا ہے ہمارے نمائندے (SPOKESMAN) سے کہو۔ ہم صرف اسی کا حکم مانیں گے۔ کوئی بھارتی جے سی او یا این سی او ہمیں براہِ راست حکم سُنا کر ذلیل نہ کرے۔

تیسرے اور آخری مشاہدے کا تعلق پھر انسانی نفسیات سے ہے۔ یعنی ایک بار حکم چلانے کی عادت پڑ جائے تو اسیری میں بھی حکم چلانے کو جی چاہتا ہے۔ حاکمیت کی اس حِس کو تسکین دینے کے لیے کئی دوستوں نے آپس میں باری باری حکم دینے اور حکم سہنے کا فیصلہ کیا۔ مثلاً پہلے ایک صاحب اپنے "ماتحت گروپ" کی کمان سنبھال کر ایک ساتھی افسر کو ڈانٹتے "جوان اپنا ٹرن آؤٹ° ٹھیک کرو، کمپنی کی عزت کا معاملہ ہے۔" دوسرا دبی زبان میں جواب دیتا "صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ایک ہی یونیفارم ہے، جو رات کو بھی پہن کر سوتا ہوں۔" اس پر ایک اور ڈانٹ پڑتی "دیکھو بہانے بناتے ہو! اچھے سپاہی بنو اور آگے سے جواب مت دو۔ بس جاؤ جا کر اپنا ٹرن آؤٹ ٹھیک کرو۔" وہ "ٹھیک ہے صاحب" کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتا۔ پھر انہی ماتحتوں میں سے ایک حاکم بنتا اور انگریزی لہجے میں پوچھتا "جوان! تمہارا مورال کیسا؟" "بہت اچھا صاحب۔" "گھر سے چِٹھی وِٹھی آتا؟" "جی صاحب، آتا۔" "اور کوئی ٹکلیف لو نہیں؟" "نہیں صاحب، بس روٹی کپڑا کا تکلیف ہے۔" "فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی پاکستان سے گفٹ پارسل آنے والا ہے۔ او،کے (O.K.) ٹم جا سکتا۔"

ایسے سینکڑوں نفسیاتی نکتے تھے جو روزمرہ کی زندگی میں مشاہدے میں آتے، لیکن ان سب کا اگر ذکر کیا جائے تو شاید ایک الگ کتاب بن جائے، لہٰذا فی الحال انہی تین مشاہدوں پر اکتفا کرتا ہوں اور اب دیوارِ برلن کے اُس پار "دار العوام" آپ کو لیے چلتا ہوں۔ کہتے ہیں اُدھر بھی آباد ہے، اک ویرانہ۔

° (TURN OUT) لباس کا رکھ رکھاؤ

سنٹرل جیل: دارالعوام

دارالعوام کا ماحول نسبتاً عوامی اور وہاں کا سارا انتظام ہنگامی تھا۔ ماحول کے عوامی پن کی وجہ یہ تھی کہ اس ایوان میں کرنیل صاحبان کی رہائش نہ تھی، اس لیے بار بار اٹینشن (ATTENTION) ہونے، بات بات پر "سر، سر" (SIR, SIR) کرنے اور ہر حکم پر تسلیم بجالانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تقریباً سبھی برابر تھے۔ قید تو بڑے بڑے امتیاز مٹا دیتی ہے، چند ماہ وسال کی سینیارٹی یا ایک آدھ عہدے کا فرق کہاں تک قائم رہتا! لہٰذا چند ہفتوں ہی میں سب آپس میں گھل مل گئے۔ محمود و ایاز کی تفریق علامتِ بیگانگی سمجھی جانے لگی۔

دارالعوام کا سارا انتظام ہنگامی یوں تھا کہ ہمارے اسیر ہونے سے پہلے جیل کے اس حصّے کو خطرناک حد تک خستہ و ریختہ قرار دیا جا چکا تھا، چنانچہ یہاں باورچی خانہ، غسلخانہ، بجلی یا پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ سب ضروریات ہنگامی طور پر مہیا کی گئی تھیں۔ اس سارے ہنگامے میں صرف ہمارا قیام ہنگامی نہ تھا۔

جب ہم دارالامرا سے دارالعوام میں پہنچے تو گرمیاں عروج پر تھیں، لہٰذا اس کی توقع تھی کہ جیل میں پانی کی کمیابی کا مسئلہ اس کی نایابی کا مسئلہ بن جائے گا، لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔ جب ہم تیس چالیس افسر اس ایوانِ زیریں میں منتقل ہوئے تو سب سے پہلے دو بیرکوں کو انگریزی حرف وی (V) کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹیک لگائے پایا۔ اندر جھانکا تو فرش کچّے اور غلیظ تھے۔ صرف ایک بیرک کا ایک چوتھائی حصّہ پلستر شدہ تھا۔ جو بلند ہمّت تھے انہوں نے لپک کر اس صاف ستھرے ٹکڑے پر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی چارپائیاں بچھا کر قبضہ کر لیا۔ سُست رو خاک

چھاننے لگے۔

جلد ہی ان بلند ہمتوں کی پہل پریشانی کا موجب ثابت ہوئی، کیونکہ ۱۲۰ درجہ حرارت میں فرش تپنے لگا۔ اس کے تپتے سینے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی تلاش کیا، تو ایک بوند میسر نہ آئی، کیونکہ پانی مقررہ وقت پر مقررہ مقدار میں ملتا تھا، اس لیے نہ خود نہانے کا امکان تھا نہ فرش کو نہلانے کا۔ مجھ جیسے خاک نشین نسبتاً فائدے میں رہے، کیونکہ دھرتی کا سینہ انسان کے بنائے ہوئے فرش سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔

پانی کا ذکر چلا ہے تو اس کا کچھ بیان اور ہو جائے۔ دارالعوام کی باقی سہولتوں کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پانی کی متوقع آمد سے پہلے برہنہ جسم انڈر وئیر پہنے "کیو" (Q) لگانا شروع کر دیتے۔ جھُلسے ہوئے جسم، مرجھائے ہوئے چہرے، سُوکھے ہوئے ہونٹ اور نیند بھری سُرخ آنکھیں۔ ایسے میں گرمی اور لُو کے ستائے ہوئے ان انسانوں کے لیے آزادی کا واحد مطلب پانی تھا۔ پانی جو وہ جی بھر کر پی سکیں، پیاسے جسم پر چھڑک سکیں اور یوں دیدہ و دل کو ٹھنڈک پہنچا سکیں۔ لیکن اسیری میں یہ نعمت کہاں! نلکے سے پہلے تو "شوں، شوں، شاں، شاں" کی آواز سے پانی کی آمد آمد کا اعلان ہوتا اور پھر ایسے ان گنت اعلانات کے بعد پانی آتا۔ قطرہ بہ قطرہ، اشک بہ اشک۔ ٹونٹی کے نیچے سر رکھ کر سیراب ہونے کا تو امکان ہی نہ تھا۔ بالٹی تک بھرنے میں نہ آتی۔ جونہی اس میں چند قطرے جمع ہوتے، جلتے جسم پر ڈال لیے جاتے اور پھر مزید چند قطروں کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ہر شام بمشکل چار پانچ آدمی اپنے آپ کو نہانے کا دھوکہ دے سکتے۔ باقی تشنہ کام لوٹ آتے۔ ہمیں "قطرہ قطرہ بہم شود دریا" کی ضرب المثل کی عملی صورت دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

پانی کے جملہ معترضہ کے بعد آئیے دارالعوام سے آپ کا بالتفصیل تعارف کرائیں۔ یہاں دونوں بیرکوں کے درمیان اور آس پاس ذرا سا صحن تھا، جس کے اِرد گرد خاردار تار کی باڑ تھی۔ باڑ کے باہر سنتری کی گشت کے لیے مخصوص روش، اس سے آگے وہی فصیلوں، زندانوں اور پہریداروں کی اجارہ داری تھی۔ کیمپ نمبر ۸ ہمارے ساتھ ہی شمال مغرب میں تھا۔ دارالعوام اور کیمپ نمبر ۸

کے درمیان جو ۷۰ × ۲۵ فٹ جگہ بچتی تھی اس میں قیدِ تنہائی کی پانچ کوٹھڑیاں تھیں جن کے فرش میں لوہے کے کڑے اور زنجیریں اس امر کی گواہ تھیں کہ یہاں کبھی سگِ لیلیٰ کی برادری کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ ان کوٹھڑیوں میں سے دو کو ہم نے راشن سٹور اور کچن میں منتقل کر لیا تھا اور باقی تین کوٹھڑیوں میں آٹھ دس اردلی سوتے تھے۔

ان کوٹھڑیوں کے آس پاس جو جگہ بچتی تھی، اس میں ہم دن کے وقت قدم رکھ سکتے تھے؛ البتہ غروبِ آفتاب سے پہلے اپنے اندرونی صحن میں سمٹ آنے کا حکم تھا۔ دن کو ہم یہ خالی جگہ پی ٹی، والی بال اور چہل قدمی کے لیے استعمال کرتے تھے اور جب جیل کی مغربی فصیل پر رنگِ شفق کا پھیلنے لگتا تو ہم اپنے دالان میں واپس آجاتے۔

دارالعوام میں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد کنٹین اور ٹھیکیدار کا انتظام ذرا فعّال ثابت ہونے لگا۔ اب ہم اپنے ماہوار گزارہ الاؤنس سے مقامی طور پر چیزیں خرید سکتے تھے۔ ہمارے اور اشیائے ضرورت کے درمیان بنئے (ٹھیکیدار) کے علاوہ کیمپ کا سیکنڈ اِن کمانڈ (SECOND IN COMMAND) میجر گلاب سنگھ پڑتا تھا۔ میجر گلاب سنگھ بھی اپادھیا کی طرح ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ بُلایا گیا تھا۔ یہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ وہ ہماری ضروریات کی فہرست منظور کر کے ٹھیکیدار کو دیتا اور پھر ٹھیکیدار بازار سے منظور شدہ چیزوں میں سے جو دستیاب ہوتیں مہیا کر دیتا۔ ٹھیکیدار بازاری بھاؤ سے دس فیصد زیادہ دام وصول کرتا، لیکن جب ہمیں مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ ہی کا اندازہ نہ ہوتا تو ہم اس کی بتائی ہوئی قیمتوں پر کیا گرفت کرتے! پھر اسے میجر گلاب سنگھ اور کوارٹر ماسٹر وغیرہ کو بھی خوش کرنا ہوتا تھا۔

گزشتہ دس ماہ سے ہم دال سبزی اور سبزی دال کھاتے کھاتے تنگ آچکے تھے اور حیاتین کی خاصی کمی محسوس کرتے تھے۔ بینائی بھی متاثر ہونے لگی تھی اور جسم میں قوتِ مدافعت جواب دے رہی تھی، للٰذا ہم نے نئے انتظام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لنگر کو آفیسرز میس (OFFICERS MESS) یعنی افسروں کے طعام خانے کے طور پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ ایک افسر نے رضا کارانہ طور پر میس سیکرٹری کے فرائض

سنبھالے۔ دوسروں نے اپنے اپنے الاؤنس میں سے تیس روپے اس کے پاس جمع کرائے۔ میس سیکرٹری نے مینو (MENU) بنا کر اپنے ہی افسروں پر مشتمل، میس کمیٹی سے منظور کرایا اور گلاب سنگھ کے توسط سے ٹھیکیدار کو ضرورت کی اشیاء مہیا کرنے کا "آرڈر" دیا۔

اس کے علاوہ میس سیکرٹری نے لنگر کے لانگریوں کو میس کے کُک (COOK) بنانا شروع کر دیا۔ خود باورچی خانے میں کھڑے ہو کر انہیں شوربہ گھنا اور روٹی پتلی پکانے کی تربیت دینے لگا۔ اس کی کوششوں سے ہمارے کھانے پینے کا انتظام خاصا قابلِ قبول ہو گیا اور میجر ساجد خدمت کرتے کرتے مخدوم ہو گیا ——————— میس سیکرٹری کے فرائض باری باری دوسرے افسروں نے بھی انجام دیئے۔

میس کی ضروریات کے علاوہ کتابیں اور دوسری چیزیں بھی میجر گلاب سنگھ کی منظوری سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ میجر گلاب سنگھ جس چیز کی جو قیمت چاہتا وصول کرتا اور فہرست میں سے جس چیز کو چاہتا کاٹ دیتا۔ پچاس چیزیں لکھتے تو پانچ منظور کرتا۔ خسیس جو ٹھہرا!

میجر گلاب سنگھ قیدیوں کے علاوہ اپنے سٹاف میں بھی خاصا غیر مقبول تھا۔ ایک دفعہ جونہی دل بہلانے کی خاطر وطن واپسی کا ذکر ہو رہا تھا تو حوالدار میجر تارا سنگھ حُقّے کے سٹائل میں سگریٹ پیتا ہوا گزرا۔ سیل (CELL) کے دلوں کی پُرانی جان پہچان تھی۔ وطن واپسی کا ذکر سُن کر رُک گیا اور بے تکلفی سے کہنے لگا "چھوڑو جی، پاکستان جانے کی کیا جلدی ہے! اچھا ہے اِدھر لنگڑوں، لُنجوں کا روزگار لگا ہوا ہے۔ تم چلے گئے تو ان لوگوں کے گھر میں مفت چلینی پتّی کہاں سے جائیگی!"

میجر گلاب سنگھ کی مہربانی سے بھارت میں شدید مہنگائی کا احساس ہوا۔ گوشت سات روپے سیر، انڈہ پانچ روپے درجن، سیب دس روپے سیر، چاول دو روپے سیر۔ توبہ توبہ! اتنی مہنگائی! ہم نے بھلے وقتوں (۱۹۷۰-۱۹۷۱ء) میں جب پاکستان چھوڑا تھا تو قیمتیں گوارا تھیں۔ اس مہنگائی پر ہم بھارتی سٹاف کو طعنے دیتے کہ ایشیا کی عظیم طاقت بننے کے خواب دیکھتے ہو، پہلے اپنے عوام کو مہنگائی کے بوجھ سے تو نکالو۔ ہمارے پاکستان میں اگر کوثر و تسنیم نہیں بہتیں تو کم از کم عام

ضرورت کی اشیاء تو سستے داموں میسّر آجاتی ہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی اپنا پیٹ آسانی سے بھر سکتا ہے۔

کھانے پینے کے مقامی انتظام کے ساتھ ساتھ پاکستان سے آنے والی ڈاک کا نظام بھی بہتر ہونے لگا۔ اب اوسطاً مہینے ڈیڑھ مہینے میں پاکستان سے خط آجاتا اور تقریباً اتنے ہی عرصے میں کیمپ سے بھیجا ہوا خط پاکستان پہنچ جاتا یعنی اوسطاً تین ماہ میں ایک ایک خط کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ خطوں کی آمد و رفت بہتر ہونے کے باوجود ان کا انتظار اتنا ہی شدت سے رہتا جتنا کہ شروع شروع میں ہوتا تھا، بلکہ کئی دفعہ جب نہانے کے لیے طویل قطار لگی ہوتی تو کوئی منچلا گیٹ پر دستک دے کر سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا کر زور سے نعرہ لگاتا "جنٹلمین لیٹرز"° — یہ نعرہ سُنتے ہی سب کیو (Q) چھوڑ کر گیٹ کی طرف لپکتے اور وہ منچلا خود بھاگ کر غسل خانے میں گھس جاتا۔

خطوں کی اس ریل پیل میں میرے خط بھی آنے لگے۔ سب سے پہلے جو خط میرے نام آیا وہ کرنل محمدؐ خاں• کا تھا۔ کرنل صاحب کی شگفتہ تحریر قید و بند کی گھٹن میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ پاکستان سے پہلا خط آنے پر دوستوں نے گلے لگایا اور مبارکباد دی۔ میں نے ان کا منہ میٹھا کرانے کے لیے اسی خط کے لذیذ حصے انہیں سُنائے۔ اس کے بعد عزیز و اقارب اور دوسرے دوستوں کے خط بھی آنے لگے۔ گویا خط نہ آنے کی وجہ سے مجھے جو امتیاز حاصل تھا، مَیں اس لذّتِ یکتائی سے محروم ہو گیا۔

جس ڈاک میں میرا خط آیا تھا، اسی میں ہمارے خاکروب مینوئل (MANUEL) کا بھی گھر سے خط آیا، لیکن میری طرح اس کا یہ پہلا خط نہ تھا۔ اس کے کئی خط آچکے تھے۔ اس کی ماممتا کی ماری ماں نے اسے لکھا تھا:

° (GENTLEMEN! LETTERS) یعنی حضرات! خطوط

• پاکستان کے ممتاز مزاح نگار، بجنگ آمد کے مصنف۔

"بیٹے! تمہارے خط بھی باقاعدہ ملتے ہیں اور تنخواہ بھی ہر پہلی کو مل جاتی ہے، لیکن ہمیں تمہاری یہ نوکری پسند نہیں، کیونکہ تمہیں سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے اور تمہیں چھٹی نہیں ملی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم نوکری چھوڑ کر سیدھے گھر چلے آؤ، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو کام اور بھی مل جائے گا۔"

خطوں کے ساتھ ساتھ اب تحائف بھی آنے شروع ہو گئے تھے۔ ریڈ کراس کے تحائف کی جو کھیپ سب سے پہلے ہمیں ملی وہ ہم نے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔ اس طرح پاکستانی اشیاء استعمال کرنے کی سعادت تو صرف چند ایک کو ہوئی، لیکن ان کا دیدار ہر کسی نے کیا۔ جس کے ہاتھ جو چیز لگی، اس نے اسے باغِ ارم سے آنے والا بیش بہا تحفہ سمجھ کر چوما، آنکھوں سے لگایا اور چارپائی پر کھڑے ہو کر سب کو دکھایا۔ اس موقع پر زائرین کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ میں اس ہجوم میں شگاف ڈال کر پاکستانی مصنوعات کا دیدار نہ کر سکا۔ اتنے میں ایک کرم فرما نے پاکستانی ٹوتھ پیسٹ کا خول اُتار کر مجھے اور میرے پاس کھڑے دوسرے ساتھیوں کو دیا کہ لو، خانہ ساز ہے، ذرا سونگھو تو، وطن کی مہک کتنی انوکھی، کتنی البیلی، کتنی دلآویز ہے۔ ہم نے اپنی مصنوعات پر فخر کرتے ہوئے بھارتی سٹاف کے سامنے کہنا شروع کیا "بنئے کی بنائی ہوئی چیزیں پاکستانی مصنوعات کا کہاں مقابلہ کر سکتی ہیں!" حاضرین میں سے ایک نے نعرہ لگایا "واہ پاکستان، تیریاں نہیں رلیساں۔" (واہ پاکستان تیرا جواب نہیں)، "پاکستان"—— "زندہ باد"، "پاکستان زندہ باد" نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ یہ شور سُن کر سنتری چوکنّے ہو گئے کہ شاید کسی طوفان کی آمد آمد ہے۔ انہوں نے رائفل سیدھی کی۔ خطرے کی سیٹی ہونٹوں میں دبائی...... پر تماشا نہ ہوا۔ وہ جسے کسی طوفان کی آمد سمجھے تھے، محض جذبۂ حُبّ وطن کی ننھّی سی لہر تھی۔

پاکستان سے آنے والے خطوط اور تحائف میں ہم ایک دوسرے کو شریک کرتے۔ خط میں کوئی اچھی خبر، کوئی اچھا جملہ یا اچھا لطیفہ ہوتا تو دوسروں کو ضرور سُناتے۔ اسی طرح تحائف میں صابن، سگریٹ، بنیان، تولیہ یا دوسری چیزیں آتیں، تو انہیں ضرورت مندوں میں بانٹ دیتے۔

آزادی کے دنوں میں کسی کو سگریٹ پیش کرنا مجلسی آداب کا ادنیٰ سا تقاضا ہے، لیکن جیل میں جہاں لوگ سگریٹ کے ٹکڑے پینے پر مجبور ہو گئے ہوں، وہاں پورے کا پورا سگریٹ یا دس سگرٹوں کا پیکٹ مرحمت کر دینا حاتم طائی کے ہم پلّہ ہونے سے کم نہیں۔

پاکستانی یا ولائتی پارسلوں کی آمد پر بھارتی عملے کا ردِّ عمل دیکھنے کے قابل ہوتا۔ وہ چیزوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جیسے ایک دیہاتی پہلی بار شہر کی دکانوں میں سجے ہوئے نوادرات دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان کے دل میں رشک کے جذبات کروٹیں لینے لگتے (قیدی بننے کا رشک نہیں، تحائف وصول کرنے کا) کئی دفعہ ان کی دبی خواہش بے قابو ہو کر چوری، سرقہ یا بددیانتی کی صورت اختیار کر لیتی۔ کئی چیزیں سرے سے غائب ہو جاتیں اور کئی ایک کی جگہ ادنیٰ چیزیں رکھ دی جاتیں، لیکن جب پھر بھی ان کی بھوکی آنکھیں نہ بھرتیں تو صاف صاف الفاظ میں منّت کرتے "بھئی، یہ سلیپنگ سوٹ (SLEEPING SUIT) یعنی شب خوابی کا لباس مجھے دے دو یا ایسا ہی سلیپنگ بیگ (SLEEPING BAG) یعنی سونے کے لیے ولائتی تھیلہ مجھے بھی منگوا دو" —— ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!

تحفے تحائف کی ریل پیل ہوئی تو ہمارا افسرانہ رکھ رکھاؤ بھی بحال ہونے لگا۔ مَیں نے بھی اپنے حُلئے کو افسرانہ وقار بخشنے کے لیے بھارتی حجام سے کہا کہ میرے بال انگریزی طرز پر کاٹو۔ پہلے تو وہ میرا منہ تکنے لگا کہ اس قیدی چہرے پر انگریزی حجامت کیا معنی؟ لیکن جب میں نے اپنی خواہش کو ذرا موثر الفاظ میں دُہرایا، تو وہ اوزار لیکر تیار ہو گیا۔ کارروائی شروع کرنے سے پہلے اس نے پوچھا "سائڈ (SIDE) پر مشین لگاؤں یا قینچی؟" قیدی سے پہلی بار کسی نے اس کی پسند پوچھی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ گفٹ پارسل میں آئی ہوئی ساری مونگ پھلی اس کی نذر کر دوں، لیکن ہاتھ روک لیا البتہ اس کا ہاتھ چلنے لگا۔

یہ حجام ہندو تھا اور اپنے ہندو افسروں سے خاصا نالاں۔ اس نے قینچی کے بیک گراؤنڈ میوزک میں جو باتیں کیں ان میں یہ انکشاف بھی تھا کہ "پہلے میں سپاہیوں کے کیمپ میں کام کرتا تھا۔

ہمارے ایک افسر نے کہا کہ قیدیوں کو افیون پر لگاؤ۔ مَیں ہر روز تھوڑی سی افیون لے جاتا اور جو قیدی مجھ سے بے تکلف تھے، انہیں دے دیتا۔ ایک دن ہمارا کوئی سینئر افسر معائنے پر آیا تو تین چار ماہ کی اکٹھی کی ہوئی افیون قیدیوں نے اس کے حوالے کر دی اور شکایت لگائی کہ ہمیں نشہ آور چیزوں کا عادی بنایا جا رہا ہے، افسر تو بچ گئے، نزلہ مجھ پر گرا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ ہوئی، نوکری جاتے جاتے بچی۔" مَیں نے پوچھا "اب بھی کوئی گولی پاس ہے۔" کہنے لگا "جی نہیں، اب تو گیٹ پر آتے جاتے قیدیوں کی طرح میری تلاشی لی جاتی ہے۔۔۔۔ ویسے آپ کو ضرورت ہو تو شیو کے برش میں رکھ کر تولہ دو تولہ لا سکتا ہوں۔"

مَیں حجامت کرا رہا تھا اور لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ کوئی تن سازی کے شوق میں شرابور تھا، کوئی کپڑے کی ٹوپی پہنے مسجد میں تفسیرِ قرآن پڑھ رہا تھا، کوئی باہر دری بچھا کر ملٹری ہسٹری کی کتابوں میں مگن تھا، کوئی سُست الوجود چارپائی پر لیٹے لیٹے کسی سستے ناول سے جی بہلا رہا تھا، کوئی درخت کے نیچے تاش یا شطرنج کی بازی لگا رہا تھا اور جوں جوں سایہ سرکتا جا رہا تھا یہ چوکڑی بھی سرکتی جاتی تھی۔ اور بیرک کے اندر سب سے جُدا، سب سے الگ ایک صاحب کبھی پُرانی پتلون سے نیکر اور کبھی رومال سے ٹوپی بنانے میں محو تھے۔ ان کے اندر بیٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مونچھیں بنانے والی جس کی قینچی انتخاب کرتے، اٹھا کر اس سے کپڑے کاٹنے شروع کر دیتے۔ جب ایک قینچی کے دانت کھٹے ہو جاتے، تو دوسری اٹھا لیتے۔ کوئی ان سے ناراض نہ ہوتا کیونکہ یہ ہر کسی کے کام آتے تھے۔

مَیں حجامت سے فارغ ہوا تو مجھے دار العوام کی وہ معروف شخصیت مل گئی جس کا دل بخیہ گری میں لگتا تھا نہ کتب بینی میں۔ وہ جم کر شطرنج کھیل سکتے تھے نہ برج۔ بس ہر وقت گردش میں رہتے۔ ہر چوپال چوکڑی کے پاس جاتے، چند دل پسند مکالمے بولتے اور آگے نکل جاتے۔ آئیے ان کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے۔

یہ صاحب ملٹری ہسٹری کے طالب علم کے پاس سے گزرتے تو کہتے "پارٹنر!

رومیل° (ROMMEL) کی کیا بات ہے! اپنی بے مائیگی کے باوجود انگریزوں کو صحرائے اعظم کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دھکیل کرلے جاتا اور خود پسپا ہوتا تو کسی کے ہاتھ نہ لگتا۔ واقعی لومڑ تھا، لومڑ۔۔۔ اور ہاں سلِم° (SLIM) کو دیکھو، جب ہٹنے لگا تو ہمارے کو میلہ اور سلہٹ تک آ گیا اور جب چڑھائی پر اُترا، تو جاپانیوں کو پُورے برما سے نکال باہر کیا اور مین سٹین° کو دیکھو، فتح فرانس کا کیا خوبصورت نسخہ تیار کیا۔ دکھایا دایاں ہُک (HOOK)● اور مارا بایاں۔۔۔۔ اور فرانس کو چت کر دیا۔ یار ایسی چالیں ہمیں بھی سیکھنی چاہئیں، کیا خیال ہے؟"

وہ اپنے سوال کے جواب میں قطعاً دلچسپی نہ لیتے۔ بس اپنی کہہ کر آگے چل دیتے۔ مسجد کے پاس سے گزرے تو رُک کر کہنے لگے "پارٹنر! بہت تفسیریں پڑھتے رہتے ہو، یہ تو بتاؤ کہ ہمیں نماز قصر پڑھنی چاہیے یا پوری۔۔۔۔؟ اچھا چھوڑو، یہ مسئلہ تو پاکستان اور بھارت کے علماء سے متّفقہ طور پر بھی حل نہ ہو سکا، تم کیا حل کرو گے، ذرا یہ بتاؤ کہ ترجمان القرآن اچھی ہے یا تفہیم القرآن؟"

لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنا خیال ظاہر کرتا، موصوف تاش کے کھلاڑیوں کے پاس پہنچ چکے ہوتے۔ چند منٹ تاش چوکڑی کے سرہانے کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے اور کھیل ختم ہونے پہ ہارنے والے کھلاڑی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے "پارٹنر! اگر تم پانچواں ہینڈ (HAND) ہارٹ سے چلتے تو وَن ڈاؤن (ONE DOWN) نہ ہوتے۔۔۔۔ ہاں ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہارٹ کو ٹرمپ (TRUMP) کرتا، لیکن اس کے بعد سپیڈ (SPADE) چلتا۔ تم سپیڈ کو ٹرمپ کر کے ڈائمنڈ کھیلتے تو تمہارے دونوں پتّے گُڈ ہوتے۔۔۔۔ کوئی بات نہیں، بس اسی تندہی سے کھیلتے رہو۔ وطن واپسی تک برج کھیلنا سیکھ جاؤ گے۔"

پھر ذرا آگے بڑھ کر شطرنج کے بورڈ پر سر جُھکائے سوچ میں ڈوبے کھلاڑیوں کو جا جگاتے۔

° رومیل، سلِم اور مین سٹین دوسری جنگِ عظیم کے نامور فیلڈ مارشل تھے۔

● کہنی

پارٹنر! پیادہ چلو، پیادہ۔ پہلے اس کی کوئین (QUEEN) کو بلاک کرو، ورنہ تمہارا رُخ مَرجائے گا۔ ....اور ہاں کنگ (بادشاہ)، کا حصار نہ ٹوٹنے دینا.... وش یو گڈ لک°۔" اس کے بعد وہ اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر آگے نکل جاتے۔

سامنے انہیں ایک لحیم شحیم شخص بے وقت پیٹ گھٹانے کی ورزش کرتا دکھائی دیتا تو اس پر تبصرہ کرتے" پارٹنر! کیوں ننّھی سی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے! نکلا ہوا تیر اور بڑھا ہوا پیٹ بھی کبھی واپس آئے ہیں....! اس مشقت سے تو بہتر تھا کہ یہ دس سیر فالتو چربی پاکستان ہی چھوڑ آتے، کم از کم صابن بنانے کے تو کام آتی!"

باہر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر اب آپ بیرک کے اندر تشریف لے جاتے تو بستر پر لیٹ کر ناول پڑھنے والے کو مشورہ دیتے "پارٹنر! لیٹ کر پڑھنے سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ اِدھر پہلے ہی حیاتین کی کمی ہے اور پیپر بیک (PAPER BACK) ناولوں کا تو پرنٹ (PRINT) بھی بہت باریک ہوتا ہے.... بھلا کون سا ناول پڑھ رہے ہو آج کل؟"

یوں باتیں کرتے کرتے ان کی نظر ایک بخیہ ادھیڑا، ایک بخیہ سیا کی مشق کرنے والے صاحب پر پڑتی تو اُدھر مُڑ جاتے۔ اس کے پاس جا کر ایک ٹانگ چارپائی کی پٹّی پر رکھ کر کہتے "پارٹنر! سرکاری تولئے سے تم نے بڑا خوبصورت تھیلا بنایا ہے، اس میں کیا رکھو گے؟ گفٹ پارسل والے کپڑے نا؟ اچھا آئیڈیا (IDEA) ہے....اور ہاں پارٹنر! یہ لو رومال اور مجھے بھی اپنے جیسی ایک ٹوپی بنا دو، نماز پڑھتے وقت رومال سر سے سرک جاتا ہے۔ ثواب کماؤ، مفت میں، پارٹنر! ثواب...."

اس تبصرہ آمیز گشت کے دوران اگر کوئی انہیں بیٹھنے کی دعوت دیتا تو کہتے نہیں پارٹنر! میں چلتا ہوں۔ تمہیں ڈسٹرب (DISTURB) کرنا نہیں چاہتا۔"

آخر ایک دن اس ہنستی کھیلتی دُنیا پر پانی پھر گیا۔ موسم برسات کیا آیا، ہر طرف پانی ہی پانی

° (WISH YOU GOOD LUCK) اللہ کرے قسمت تمہارے ساتھ ہو۔

ہوگیا۔ ہم نے لاہور، مری، پنڈی اور ایبٹ آباد جیسے شریفانہ شہروں میں کئی بار بارشیں ہوتی دیکھی ہیں، لیکن آگرے جیسا منظر کہیں نہ دیکھا۔ باہر تو پتہ نہیں کیا حال ہو، جیل کے اندر یہ حالت تھی کہ بیرکوں کے اندر چھوٹے اور باہر بڑے بڑے جوہڑ اور تالاب بن گئے تھے۔ بال برابر جگہ خشک نہ رہی۔ بیرک سے باورچی خانے تک جانا ہو یا غسلخانے تک، بس ننگے پاؤں پانی میں شپ شپ کرتے جائیے۔

بیرک کے اندر رنگین بارش ہوتی۔ کمر خمیدہ چھت میں پرانی سُرخی مائل اینٹیں جڑی تھیں۔ پانی ان سے رس رس کر نیچے گرتا اور جس کپڑے یا فرد پر پڑتا، اسے لہولہان کر دیتا۔ کئی بار ہم نے ٹپکے سے بچنے کے لیے چارپائی کے نیچے سونا چاہا، لیکن وہاں کچا فرش پہلے ہی دلدل بن چکا ہوتا۔

موسمِ برشگال میں اردلیوں کا بُرا حال تھا۔ گرمیوں میں وہ جلی سڑی زمین کے سیلنے سے سینہ لگائے رہتے تھے۔ بارش نے اسے بھی شرابور کر دیا۔ اب وہ ۹ × ۶ فٹ کی ایک ایک کوٹھڑی میں سات سات آٹھ آٹھ بند رہتے تھے۔ جب تک بارش ہوتی رہتی، صورتِ حال قابلِ برداشت رہتی، لیکن جونہی بارش تھمتی، ہوا رُک جاتی اور حبس کا دَور شروع ہوتا، تو ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں سونا تو درکنار، سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا۔ ہم نے لڑ بھڑ کر کیمپ کمانڈنٹ سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ جب بارش نہ ہو، یہ باہر سو سکتے ہیں، لیکن اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بیچارے جس روز مطلع صاف دیکھ کر باہر زمین پر کمبل بچھاتے، اسی رات بارش ایک بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوتی۔۔۔ اور جب تک یہ چیخ چلا کر سنتری کو بُلاتے، گارد کمانڈر آتا، کوٹھڑیوں کا دروازہ کھُلتا، یہ بارش زدہ افراد اپنے اپنے کمبل سمیت بھیگ چکے ہوتے۔

جب آندھی، جھکڑ اور بارش ہم پر مشترکہ حملہ کرتے تو بیرک کی خمیدہ چھت کی لیلیاں کانپنے لگتیں، سلاخوں سے برسات کے چھینٹے اندر پڑی ہر شے کو زیرِ آب لے آتے۔ ایسے میں اردلیوں کی متاعِ حیات یعنی کمبل، انڈرویئر، نیکر وغیرہ اُڑ جاتی۔ وہ تعاقب میں نکلتے، آگے خاردار باڑ آجاتی، نیکر کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو تار کے کانٹے انہیں پکڑ لیتے اور وہ انگلیاں فگار لے کر

پسپا ہو جاتے۔

قفس کا ماحول کچھ بارش سے گیلا گیلا تھا، کچھ اسیری کی وجہ سے گھٹا گھٹا سا کہ ۱۴ اگست کا تاریخی دن آپہنچا۔ آزادی کا دن جسے ہم ہر سال خوشی کا تہوار سمجھ کر مناتے ہیں۔ آج بھی ہم نے خوش ہونے کی کوشش کی، لیکن خوشی کے ہر سالس کے ساتھ خون کا گھونٹ اُبل آیا۔ بس ختمِ قرآن کے بعد اس کی طول عمری اور خوشحالی کی دعا کر کے چُپ ہو گئے، لیکن چُپ کی ہر آہٹ سے یوں محسوس ہوتا کہ میرے نالوں کی صدا اس میں لرزاں ہے۔

۱۴ اگست کا دن تو جوں توں گزار لیا، لیکن رات کاٹنی مشکل ہو گئی۔ رات کو جب بی بی سی اور دوسرے نشری اداروں سے پاکستان کے متعلق خصوصی پروگرام سُنے، تو ایک ایک لفظ سُن کر یوں محسوس ہوا کہ کوئی ناخنِ نشتر سے زخمِ جگر کرید رہا ہے اور ایک ایک فقرہ سوچ کا بھاری پتھر بن کر سینے پر گر رہا ہے۔ ہر فقرے کے ساتھ بوجھ بڑھتا رہا۔ دُکھ اس بات کا نہ تھا کہ ایسے تاریخی موقعے پر کُنجِ قفس کیوں مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں کیوں طوق و رسن بنے، بلکہ تاسف اس وجہ سے تھا کہ اگر آج جوانِ دلپذیر پاکستان اپنے اصلی روپ میں موجود ہوتا تو پورے پچیس سال کا ہوتا، عین شباب کا زمانہ!

اس رات دل کو لاکھ سمجھایا کہ ماضی کی دلدل سے نکل کر مستقبل کی طرف دھیان دو —— وہ دیکھو، دُور روشنی کی کرن نظر آرہی ہے، وہ منزل کا نشان بُلا رہا ہے، بھُول جاؤ قصۂ پارینہ کو اور نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ آگے قدم بڑھاؤ، لیکن دل ایسا ڈھیٹ تھا کہ ایک نہ مانا۔ شاید اس لیے کہ سقوطِ ڈھاکہ کو صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے اور اس کے زخم ہرے تھے، شاید اس لیے کہ جب بھی اس کے زخم بھرنے لگتے، سوچ کے نشتر انہیں پھر چھیڑ دیتے۔ شاید یہ دل ہی سراپا زخم تھا جو مندمل ہو جاتا تو سلسلۂ حیات ٹوٹ جاتا۔

مَیں عموماً ایسے جذباتی کھچاؤ سے فرار پانے کی خاطر شعروں کا سہارا لیتا ہوں، بس کسی کُنجِ تنہائی میں بیٹھ کر چند آنسو بہا لیے، چند سوز بھرے شعر گنگنا لیے، چند آہیں بھر لیں اور

یوں دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ لیکن آج ایک ایسا درد تھا جو کسی شعر میں نہ ڈھل سکا — "اک کڑا درد جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں"

گردشِ لیل و نہار نے اپنا کرشمہ دکھایا اور دس بارہ گھنٹے کی طویل رات ختم ہو گئی، لیکن جو تاریکیاں یہ رات مرے دل کے نہاں خانے میں چھوڑ گئی، شاید وہ کبھی نہ مٹ سکیں۔

اگر میں جیل میں تنہا ہوتا تو پتہ نہیں کب تک اندر ہی اندر غلطاں و پیچاں رہتا، لیکن بھلا ہو میرے زندہ دل ہم قفسوں کا کہ انہوں نے مجھے زندہ درگور ہونے سے بچا لیا۔ انہوں نے نت نئے ہنگاموں، نت نئے ڈراموں اور نت نئے کارناموں سے ساری فضا ہی بدل ڈالی۔ وہ مجھ سے زیادہ باہمت ثابت ہوئے کہ انہوں نے اپنا غم مٹانے یا چھپانے کے کئی اسلوب تلاش کر لیے۔

ایک رات انہوں نے مل کر محفلِ رقص و سرود کا اہتمام کیا۔ بالٹیاں ڈھولک بن گئیں، مٹکے طبلہ اور چمچ مضراب۔ جب بالٹیاں جھنجھنائیں، مٹکے پر تھاپ پڑی اور چمچ کے مضراب نے کانسی کی پلیٹ سے ساز چھیڑا، تو موسیقی جاگی۔ تال اٹھی، دُھن بڑھی، راگ جوان ہوئے تو ایک عجب فضا پیدا ہو گئی۔ اتنے میں ایک نوجوان افسر اُٹھ کر والہانہ رقص کرنے لگا۔ دوسرے صاحب نے ایک اور افسر کو بازو سے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لیا اور یہ جوڑی بھی محوِ رقص ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری چوپال چوکڑی ناچنے لگی۔ جو صحیح طور پر ناچ نہ سکتے تھے وہ تالیاں بجا بجا کر ایک ٹانگ پر اُچھل اُچھل کر اپنی شرکت کا یقین دلانے لگے۔ جوں جوں سازندے لَے اونچی کرتے، رنگِ محفل اور نکھرتے لگتا۔ میں دل ہی میں گنگنانے لگا۔

ہستی کا آہنگ نہ ٹوٹے
مطرب! ساز بجاتے رہنا

کچھ دیر بعد رقص کی محفل ختم ہوئی تو سازوں کی سنگت میں سنگیت چھڑ گیا، میجر شیر، میجر یامین اور کیپٹن اکبر نے باری باری ماہیا، ڈھولا اور فلمی گیت سُنانے شروع کیے —

دارالعوام میں یہ تینوں حضرات کھلنڈرے اور ہنس مکھ سمجھے جاتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے اپنے گانے کے جو بول منتخب کیے وہ یاس وغم کی غمازی کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گانے کے بول نہیں، بلکہ درد کے ٹانکے ہیں اور ایک ایک بول سے ایک ایک ٹانکا ٹوٹ رہا ہے۔ مسرّت و انبساط کی اس محفل میں یہ درد بھرے گیت سُن کر دل پسیج گیا۔ گانے کے اختتام پر مجھ سے غزل سُنانے کی فرمائش کی گئی۔ مَیں نے دو ایک بار معذرت کی، لیکن یار کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے! ان کا اصرار بڑھا تو مَیں نے ناصر کاظمی مرحوم کی غزل کے یہ دو شعر حاضرین کی نذر کیے:

اب شہر میں اس کا بدل ہی نہیں، کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں
ایوانِ غزل میں لفظوں کے گلدان سجاؤں کس کے لیے؟
مدّت سے کوئی آیا نہ گیا، سُنسان پڑی ہے گھر کی فضا
ان خالی کمروں میں ناصرؔ اب شمع جلاؤں کس کے لیے؟

خدا خدا کر کے موسم برسات ختم ہوا تو کیمپ کی بیرونی گہما گہمی بحال ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ کوئی والی بال اور بیڈمنٹن میں لگ گیا، کوئی کتابوں میں کھو گیا، کوئی بخیہ گری کے بہانے زندگی کے ٹانکے ادھیڑنے اور سینے میں مصروف ہو گیا۔

ایک دن میجر خالق نے خلافِ توقع ذرا سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ تم مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں مثلاً فرخ، خالد، عارف، یوسف، بہرام اور راٹھور کو "بانگِ درا" کا سبق دیا کرو۔ میں اس تجویز سے کچھ حیران اور کچھ پریشان ہوا۔ حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ آخر ان پیشہ ور انجینئروں کو اچانک "بانگِ درا" پڑھنے کی کیا سوجھی اور پریشانی اس بات کی تھی کہ میں خود اقبالؒ کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے کلام کی روح دوسروں تک کیسے پہنچاؤں گا! میجر خالق جو اس گروہ میں جسم کی ساخت اور فوج کی مدّتِ ملازمت کے لحاظ سے سب سے سینئر تھے تقریباً حکم کے انداز میں کہنے لگے "کچھ عرصہ ہوا تم نے یومِ اقبالؒ منانے کی تحریک کی تھی۔ تمہاری یہ خطا اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتی جب تک ہمیں بھی کلامِ اقبالؒ سے روشناس نہ کراؤ۔

رہا ہمارا ذوق وشوق تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو اقبالؒ ہمارے قومی شاعر ہیں، ان کی شاعری کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اگر جیل میں قرآنِ پاک پہلی مرتبہ پڑھا جا سکتا ہے تو کلامِ اقبالؒ کا سبق کیوں نہیں لے سکتے!" دوسری وجہ انہوں نے ذرا سرگوشی کے لہجے میں بتائی کہ "میرا خیال ہے اقبالؒ خشک فلسفی نہیں بلکہ زندہ دل رومانی شاعر تھے۔" میں نے اسی رازدارانہ فضا کو برقرار رکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "آپ پر یہ انکشاف کب اور کیسے ہوا؟" وہ جواب میں بانگِ درا اٹھا لائے اور فہرستِ مضامین کے حصہ دوئم (غزلیات) میں ایک ایک عنوان پر انگلی رکھ کر کہنے لگے ذرا دیکھو "محبت"، "حقیقتِ حُسن"، "حسن وعشق"، "....." کی گود میں بلی دیکھ کر"، "وصال"، "سلیمیٰ"، "عاشقِ ہرجائی"، "جلوہ حُسن"، "پیامِ عشق"، "فراق"— کیوں ہیں نا سارے کے سارے رومانی عنوان؟ بس شروع کر دو۔

چنانچہ جب باقی لوگ نمازِ عصر کے بعد کھیل کُود میں وقت ضائع کرتے، ہم اقبال پڑھنے بیٹھ جاتے۔ غسلخانوں سے ذرا ہٹ کر ایک خاموش گوشہ کلاس روم کے طور پر منتخب کیا۔ اُستاد کے لیے مونڈھا اور کلاس کے لیے بنچ بچھائے گئے۔ اور ہم ایک غزل یومیہ کے حساب سے پڑھنے لگے۔ چند ہی دن میں کلاس کی تعداد بڑھنے لگی اور مجھے اپنی مقبولیت کا احساس ہونے لگا— لیکن اے طائرِ فریب خوردہ! تُو کس دام میں آ پھنسا؟ جلد ہی مجھ پر وا ہوا کہ میجر خالق نے بہلا پھُسلا کر اس کام میں مبتلا کیا ہے۔ انہوں نے محض میرا مذاق اُڑانے کی خاطر اقبالؒ سے اپنی ناواقفیت کا ڈرامہ کھیلا تھا۔ دراصل وہ سب حضرات کلامِ اقبال مجھ سے بہتر سمجھتے تھے۔ مجھے اس کا علم یوں ہوا کہ کئی دفعہ میں کسی شعر کی "استادانہ" تشریح کر بیٹھتا تو میجر خالق یا کلاس کا کوئی اور رکن نہایت شاگردانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے کی اجازت طلب کرتا اور جب میں استادانہ وقار کے ساتھ سر اثبات میں ہلا کر عرضِ مدعا کی اجازت دیتا تو وہ اسی شعر کے مرکزی خیال کے گہرے سمندر سے معانی کے ایسے دُرِ شہوار نکال لاتا کہ مجھے اپنے سطحی علم پر ندامت ہونے لگتی۔ دراصل سب حاضرین علامہ اقبالؒ سے دیرینہ لگاؤ رکھتے تھے اور زندگی کے

کسی نہ کسی حصے میں نہ صرف کلامِ اقبال پڑھ چکے تھے، بلکہ اس کے لفظی اور معنوی محاسن کو حرزِ جاں بنا چکے تھے۔

میں اس دام میں پھنس کر بہت پھڑپھڑایا، لیکن میجر خالق ٹھہرے سینئر۔ حکم ہوا "پڑھاؤ گے اور ضرور پڑھاؤ گے، جب تک کلامِ اقبالؒ ختم نہیں ہوتا یا وطن واپسی نہیں ہوتی (جو بھی پہلے ہو) یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

اس پر ستم یہ ہوا کہ ایک دن میجر سمیع نہا کر واپس آئے تو کہنے لگے "مَیں بھی کل سے بانگِ درا والی کلاس میں شریک ہُوں گا تاکہ اِدھر اُدھر وقت ضائع کرنے کی بجائے آپ کے علم سے استفادہ کر سکوں۔" میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ دوسرے میجر خالق ثابت ہوں گے، لیکن مَیں نے پسپا ہونے سے پہلے استادانہ رکھ رکھاؤ سے پوچھا "کلاس تو کئی روز سے جاری ہے، آج آپ کو اس میں شرکت کا اچانک کیسے خیال آیا؟" کہنے لگے "مجھے پتہ نہیں تھا کہ اقبالؒ کی شاعری میں لڑکیوں کے خوبصورت نام ہیں۔ مَیں نے آج نہا کر آتے ہوئے آپ کو بانگِ درا پڑھاتے دیکھا تو "نگہت"، "گلزار" اور "شمیم" کے نام کانوں میں پڑے○۔ معلوم ہوتا ہے اقبالؒ تو بڑے باذوق آدمی تھے۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟" مَیں نے سوچا پہلے بھی اقبالؒ کے ماتھے سے رومانی شاعری کا داغ دھونے کی خاطر مَیں نے اس میدان میں قدم رکھا تھا اور احساسِ جہالت کے بوجھ تلے پسا جا رہا ہوں۔ اب میجر سمیع بھی کچھ ایسے ہی داؤ پیچ لڑا رہے ہیں۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ بھئی توبہ ہی بھلی۔ مَیں اقبال پڑھانے سے رہا۔

اور اگلے روز مَیں نے مزید تضحیک کا نشانہ بنے بغیر یہ "استادی" ختم کر دی۔

میری لکھائی پڑھائی کی خبر بھارتی حکام تک بھی پہنچ چکی تھی، اس لیے ان کی نظرِ عنایت

○ "حُسن و عشق" کے پہلے بند کا یہ شعر:

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

مجھ پر بھی ہونے لگی۔ ایک دفعہ رات گئے میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا، باقی سب حضرات محوِ خواب تھے۔ اتنے میں کیمپ کا کوارٹر ماسٹر مان سنگھ چیکنگ کے لیے آیا۔ اس نے کیج کے دروازے سے آواز دی "لائٹ آف کر دو"۔ میں نے کہا "لائٹ کا کنٹرول ادھر نہیں، تمہارے دفتر کے پاس ہے"۔ اس نے کہا "ادھر آؤ"۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو اس کے منہ سے دیسی شراب (RUM) کی بدبو آ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ دیا "تم نے لائٹ آف نہ کی، تو تمہارے بیرک سینئر (BARRACK SENIOR) کو کہوں گا کہ لائٹ آف کر دے"۔ میں نے سوچا کہ جب سوئچ (SWITCH) ہی اِدھر نہیں تو بیرک سینئر کیا کرے گا۔ اتنے میں کوارٹر گارڈ کی بارہ گھنٹیوں نے بارہ بجنے کا اعلان کر دیا۔ اب میں سمجھا کہ مان سنگھ کی قوم پر دن کے بارہ بجے ہی کا نہیں، رات کے بارہ بجے کا بھی اثر ہوتا ہے۔

شاید اگلے روز مان سنگھ نے کیمپ کمانڈنٹ کو اپنی کارگزاری بتاتے ہوئے یہ چغلی بھی کھائی تھی کہ اس نے رات گئے مجھے لکھتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن کرنل اپادھیا آیا تو اس نے دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے روئے سخن میری طرف کیا اور پوچھا "سناؤ، تمہاری کتاب کہاں تک پہنچی؟" "بس تقریباً مکمل ہو چکی ہے"۔ "گڈ، ویری گڈ، کدھر ہے؟" میں نے شہادت کی انگلی سے اپنی کھوپڑی کو چھوا اور کہا "ساری کتاب یہاں محفوظ ہے"۔ "تو گویا تم لکھ نہیں رہے!" "لکھوں کیوں جب مجھے پتہ ہے کہ تم فوراً اسے ضبط کر لوگے"۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھا اور یہ کہتے ہوئے چلتا بنا "تم جیتے، میں ہارا . . . او، کے . . . !"

اپادھیا کے چلے جانے کے بعد ایک ساتھی نے مجھ سے پوچھا "یار! یہ بتاؤ، کتاب لکھنے سے ناشر کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے یا مصنف کو؟" عرض کیا "عموماً مصنف گھاٹے میں رہتا ہے، لیکن اگر مصنف ESTABLISHED (مسلّمہ) ہو تو ناشر پیچھے پیچھے پھرتے ہیں"۔ اس پر میرے ساتھی نے نہایت سنجیدگی سے کہا "ایسی صورت میں تو بہتر ہے کہ آدمی

کتاب لکھنے سے پہلے ESTABLISH (مسلّمہ) ہولے۔" میں نے ان کے مشورے کو پلّے باندھا اور وطن پہنچ کر اس نسخۂ کیمیا کو تمام مصنّفین کی فلاح و بہبود کے لیے عام کرنے کا وعدہ کیا۔

ماہِ صیام کی آمد نے ہمارے معمولات میں آفرق ڈالا۔ پہلے تو کیج سرِ شام بند کر دیے جاتے تھے اور طلوعِ آفتاب کے بعد کھُلتے تھے۔ اب نمازِ عشا اور نمازِ تراویح کے بعد کیج کے آہنی دروازے پر قفل ڈالا جاتا اور سحری کے لیے کھول دیا جاتا۔ سحری کے اہتمام کے لیے ہم نے بے دریغ کوپن خرچ کیے۔ میس سکیرٹری کو ہم نے فی کس تیس روپے کی بجائے چالیس روپے جمع کرائے۔ ٹھیکیدار اور میجر گلاب سنگھ کو مذہبی آداب کا رعب دے کر بازار سے بہتر اشیا منگوانی شروع کیں۔ گویا ماہِ رمضان کی حسبِ مقدور بہت تواضع کی۔

سحری کے بعد سب اکٹھے بیٹھ کر تلاوت کرتے، باجماعت نماز پڑھتے اور صبح ہونے پر ساری رات عبادت کرنے والے سو جاتے اور جنھوں نے اس مبارک مہینے میں چار پانچ قرآن ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوتا وہ پھر تلاوت کرنے لگتے۔ کئی ایسے بھی تھے جو روزے کو تاش، شطرنج یا کتب بینی سے بہلانا ضروری سمجھتے تھے۔ /

افطاری کے لیے کھجوروں اور مشروبات کا تو نام و نشان نہ تھا۔ شام کے کھانے ہی کو افطاری کا نعم البدل سمجھ کر اذان ہوتے ہی کھانا شروع کر دیتے۔ قیدی کا کھانا بھی کون سا لمبا چوڑا ہوتا ہے! بس دو تین چپاتیاں مروڑ کر پیٹ میں پھینکیں، اوپر سے دو گلاس پانی پیا ٹوپی سنبھالی اور نماز کے لیے صف بستہ ہو گئے! البتہ ماہِ صیام میں عیاشی کا ایک پہلو نیا تھا یعنی چائے کی جو پتّی اور چینی دن کے وقت بچ جاتی تھی ہم نمازِ مغرب کے بعد اس کی چائے بنا لیتے اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر نہایت سکون سے پیتے، کبھی ایک جرعہ، کبھی نیم جرعہ اور کبھی تپتے ہوئے مگ (MUG) کے کنارے تک ترسے ہوئے لب لے جاتے اور چائے کو چھوئے بغیر انھیں واپس بُلا لیتے۔ جب زیادہ عیش و عشرت کے موڈ میں ہوتے تو اپنے اپنے

مگ اٹھائے باہر چاندنی رات میں چاند کو ہم سبو بنا لیتے، بلکہ یوں کہئے کہ بس چاندنی پینے لگتے۔

جیل میں یوں بھی عبادت گزاری ایک مرغوب مشغلہ تھا، لیکن ماہِ صیام میں اس طرف رجحان زیادہ ہی ہو گیا۔ کئی لوگ ساری ساری رات عبادت کرتے رہتے۔ کئی اللہ ہُو، اللہ ہُو کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ جاری رکھتے اور بعض دل ہی دل میں آیۃ کریمہ کا سوا لاکھ والا ورد کرتے رہتے ــ گویا آیاتِ الٰہی کے نگہبان آیاتِ الٰہی کی تلاوت کو اپنی عبادت کی معراج سمجھنے لگے۔

ماہِ صیام کے آخری عشرے میں بعض بارِیش حضرات کو اعتکاف بیٹھنے کی سوجھی، یعنی دیارِ غیر کی جیل کے ایک کیج (CAGE) کے اندر بھی اعتکاف! لیکن اس کے لیے بھی کیمپ کمانڈنٹ کی اجازت ضروری تھی تاکہ عبادت کی آڑ میں کنجِ اعتکاف میں سرنگ نہ کھود لی جائے۔ اعتکاف بیٹھنے کے لیے اونچی نیچی زمین نرم کرنے کے لیے ریت کا بندوبست کیا گیا۔ جب تک سرکاری ذرائع سے اعتکاف بیٹھنے کی اجازت نہ آئی یہ ریت بیرک کے اندر پڑی رہی۔ ایک دن ایک "عقابی آنکھ" والے سنتری نے ریت کی یہ ڈھیری دیکھی تو جا کر گارڈ کمانڈر کو اطلاع کردی (کیونکہ ریت اور سرنگ کا چولی دامن کا ساتھ سمجھا جاتا ہے)، گارڈ کمانڈر نے پہلے خود آکر معائنہ کیا، سنتری کو سرنگ کی نشاندہی پر شاباش دی اور پھر اپنے جے، سی، او کو مطلع کیا۔ اس نے اپنے افسر کو آگاہ کیا، چلتے چلتے بات ایڈجوٹنٹ اور کمانڈنٹ تک پہنچی۔ گویا

فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو

ایک سکھ افسر کی سرپرستی میں تفتیش پارٹی آئی۔ کافی دیر وہ اِدھر اُدھر سونگھتے رہے۔ زمین کو ٹھوکریں مار مار کر سوئی ہوئی سُرنگ کو جگانے کی کوشش کرتے رہے۔ دیوار کے اِس پار اور اُس پار چکر کاٹتے رہے اور جب سُرنگ کا کوئی کھوج نہ ملا تو سکھ افسر نے ہمیں ریت اُٹھا دینے کو کہا کہ کوئی سینئر افسر دیکھ لے گا تو خواہ مخواہ انکوائری شروع ہو جائے گی۔ چند جملوں کے بعد اس کی انگریزی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تو اس نے اُردو میں اپنی مجبوری بیان کی کہ "میری نوکری کا معاملہ ہے۔ ویسے بھی پرموشن زون (PROMOTION ZONE) یعنی ترقی کی زد میں ہوں۔

اور جب اردو بھی بے اثر ثابت ہوئی تو پنجابی میں کہنے لگا "ایہہ ریت تسیں ایتھوں چکو ادوو... ویکھو نا ایتھے پئی چنگی وی نہیں لگدی۰" ہم نے اس کی پنجابی کے صدقے اس کی بات مان لی اور ریت اٹھوا کر باہر رکھ دی۔

اعتکاف کی اجازت ملنے پر ریت مقررہ کونے میں بچھا دی گئی اور کمبلوں اور چادروں سے ایک حجرہ بنا کر اعتکاف نشین گوشہ نشین ہو گئے۔ رات کو کیج (CAGE) کے ارد گرد گشت کرنے والے سنتری کو خصوصی ہدایت تھی کہ وہ ان اعتکاف نشینوں پر خاص نظر رکھے۔ چنانچہ وہ آتے جاتے ٹارچ کی روشنی کا ایک آدھ چھینٹا ان پر ڈال کر تسلی کر لیتا کہ ابھی مرغ زیرِ دام ہی ہیں۔ لیلۃ القدر کا موقع آیا تو سب نے مل کر اعتکاف نشینوں سے درخواست کی کہ آج رات جب خالقِ حقیقی سے آپ کا رابطہ قائم ہو تو ہماری رہائی کے لیے دُعا کرنا۔

لیلۃ القدر کی فضیلت سب پر عیاں تھی۔ سب عبادت میں مصروف ہو گئے۔ لوگوں نے ساری رات رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے وقف کر دی۔ رات کے پچھلے پہر جب ہر شخص سجدے میں گر کر خدا تعالےٰ سے دُعا مانگ رہا تھا تو اعتکاف نشین کو تجلّی کا پَرتَو نظر آیا۔ لمحہ بھر کو تاریک کونہ روشن ہوا اور جاتے جاتے سینے کو بھی منوّر کر گیا۔

اہلِ نظر سے اس کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے اسے قبولِ دُعا کی نشانی قرار دیا۔ چنانچہ ہم سب انتظار کرنے لگے کہ ابھی کوئی درِ زنداں پر دستک دے کر شبِ انتظار بیت جانے کا مژدہ سُنائے گا ــــ اور واقعی دروازے پر حرکت ہوئی۔ کیج کا دروازہ بھی کھُلا، لیکن یہ کوئی فرشتۂ رحمت نہیں، بلکہ بھارتی سنتری تھا جو سحری کے لیے قفل کھول رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم جسے تجلّی کی ضَو سمجھے تھے وہ دراصل گشتی سنتری کی ٹارچ کا ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ گنہگاروں کی دُعائیں بھلا اتنی جلدی کہاں قبول ہوتی ہیں۔!

ماہِ رمضان ختم ہونے سے پہلے ہی ہم نے عید کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جنگی قیدیوں کی

---

۰ یہ ریت آپ یہاں سے اٹھوادیں...... دیکھئے نا یہاں پڑی اچھی بھی نہیں لگتی۔

وردی کا ایک جوڑا دھو کر سرہانے کے نیچے استری ہونے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ عید سے ایک روز پہلے ہم نے اسے تکیے سے نکالا۔ اس پر پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ سجائی اور اگلی صبح پہننے کو کھونٹی پر سجا دیا۔

عید کے روز علی الصبح ہم نے یہ کپڑے زیب تن کیے اور نمازِ عید ادا کی، لیکن صحیح معنوں میں عید تب ہوئی جب ہمیں خوشخبری ملی کہ ہم اپنے کیمپ کے جوانوں سے عید ملنے جا سکتے ہیں۔ اور وہاں اگر بھارتی گروپ کمانڈر (بریگیڈیئر ٹامس) نے مناسب سمجھا تو کیمپ ۸۰ کے افسروں سے بھی ملاقات کا امکان ہے — اے بھارت! تیری فیاضیوں کے قربان!

پہلے ہم دیوارِ برلن کے پار گئے، جہاں دارالامراء کے مکینوں سے ملے۔ پھر بھارتی گارد کی معیت میں کیمپ ۴۴ کے سارے افسر جوانوں کے کیج میں گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی جوانوں کے چہرے تمتما اٹھے۔ اسیری میں جوانوں اور افسروں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ کسی نے نہ پوچھا کہ تم پنجاب رجمنٹ سے ہو یا فرنٹیئر فورس سے؟ تمہارا تعلق آرڈیننس کور سے ہے یا کور آف آرٹلری سے؟ اب سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ اسیروں کی برادری، غریب الوطنوں کی برادری، کشتگانِ ستم کی برادری۔ سب بلا تعارف نہایت جذب و شوق سے گلے ملنے لگے۔ بعض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بعض وفورِ جذبات سے گنگ ہو گئے۔ ان جوانوں نے اپنا سارا راشن پکا کر دسترخوان پر سجا رکھا تھا۔ ان بارہ سو نفوس نے اپنے افسروں کے انتظار میں ایک لقمہ بھی منہ میں ڈالنا گوارا نہ کیا تھا، لیکن اس مختصر سی ملاقات میں کسی کو کھانے کا ہوش نہ تھا۔ بس سارا وقت گلے ملنے، آنسو پونچھنے اور تسلی دینے میں گزر گیا۔

بریگیڈیئر ٹامس آیا تو اس نے دلی کے حوالے سے فوجوں کی واپسی کے متعلق واہگہ بارڈر پر پاکستان اور بھارتی کمانڈروں کی کامیاب کانفرنس کا ذکر کیا اور مژدہ سنایا کہ جونہی فوجوں کی واپسی مکمل ہو گی قیدی بھی واپس چلے جائیں گے۔ ٹامس نے یہ خبر "عید کے تحفے" کے طور پر سنائی۔ گویا اس نے دن دہاڑے ایک حسین خواب کا تصور پیش کیا۔ اعتبار تو نہ تھا لیکن ہم نے

عدمؔ کا مشورہ قبول کر لیا۔

کیوں نہ اِک جھوٹی تسلّی پہ قناعت کر لیں
لوگ کہتے ہیں عدمؔ! خواب حسیں ہوتے ہیں

لیکن بریگیڈیر ٹرٹامس کا حقیقی تحفہ یہ جھوٹی تسلّی نہیں، بلکہ کیمپ ۸۸ء کے افسروں سے ملاقات کی اجازت تھی۔ ملاقات کے لیے آدھ گھنٹے کی گنجائش رکھی گئی اور اس دوران سنتریوں کو چوکنّا (STAND TO) رہنے کا حکم دیا گیا۔

کیمپ ۸۸ء کا بیرونی پھاٹک کھُلا تو ہم میں سے ہر ایک نے پہلے اندر جانے کی کوشش کی، لیکن چند گز آگے لوہے کا جنگلہ (RAILING) تھا جس کا چھوٹا دروازہ کھُلے بغیر ہم آگے نہیں جا سکتے تھے اور یہ دروازہ اس وقت تک نہیں کھل سکتا تھا جب تک پچھلا پھاٹک بند نہ کر لیا جاتا۔

جنگلے کے باہر ہم کھڑے تھے اور اندر کیمپ ۸۸ء کے اسّی نوّے افسر۔ یہ عجب بیقراری کا عالم تھا۔ ہر کوئی جذبات کی گرفت میں تھا۔ بُجھے ہوئے چہروں پر خوشی کے دیپ جل اُٹھے تھے۔ آنکھیں شدّتِ جذبات سے بھیگ گئی تھیں۔ ہم جنگلے کے پار سے ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو عید مبارک کہنے لگے۔ جن سے صبر نہ ہو سکا وہ جنگلے کے پار ہی سے ایک دوسرے کی پیشانی چومنے لگے۔ جن کے ہونٹ پیشانی تک نہ پہنچ سکے انہوں نے جنگلے میں ہاتھ ڈال کر پیشانی اور گالوں کو چھوُا اور پھر ان انگلیوں کی وساطت سے اس کے چہرے کا لمس اپنے ہونٹوں تک پہنچایا۔

اتنے میں جنگلے کا دروازہ کھُل چکا تھا۔ تقریباً ایک سال کے بچھڑے ہوئے سینہ چاک گلے ملنے لگے۔ کوئی کسی کو چوم رہا تھا، کوئی کسی کو بازوؤں میں جکڑ کر جھُولے کی طرح جھُلا رہا تھا، کوئی کسی کے کندھے پر سر رکھے اپنے ساتھی کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا اور کوئی اپنے ہاتھوں کے فریم میں اپنے دوست کا مُرجھایا ہوا چہرہ رکھ کر دیکھ رہا تھا کہ اسیری کے ایک سال نے اس پر کیا اثر چھوڑا ہے۔

آدھ گھنٹے کی قلیل مدت میں کسی سے یہ پوچھنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ اے یار! پچھلی ملاقات کے بعد تجھے گردشِ بلا نے کہاں پھینکا؟ کدھر پھینکا؟ بس ابھی ملنے ملانے کی تقریب جاری تھی کہ واپس اپنے کیج میں جانے کا حکم ملا۔ ایک بار پھر الوداعی بوس و کنار اور بغل گیری کا مختصر دور چلا ___ اور ہم پھاٹک کے باہر تھے۔

اب کیمپ ۸۸ کے اسیر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے، لیکن ان کے چہرے اب بھی سامنے تھے۔ باریش چہرے، عبادت گزار چہرے، زرد اور مضمحل چہرے ___ اور ہر پژمردہ چہرے پر تبسم کی جھلک، یہ چہرے ان چہروں سے کس قدر مختلف تھے جو ہم نے بھلے وقتوں میں مشرقی پاکستان میں دیکھے تھے!

ہم نے اپنے کیج میں واپس آنے کے بعد بھی کیمپ ۴۴ کے سینئر بلاک اور کیمپ ۸۸ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ سینئر بلاک میں جانے کے لیے کیمپ ۴۴ کے کیمپ کمانڈنٹ کی اجازت درکار تھی اور کیمپ ۸۸ تک رسائی پانے کے لیے دونوں کیمپوں کے کمانداروں کے علاوہ بریگیڈیئر ٹامس کی بھی رضا ضروری تھی۔ اتنی منازل کون طے کرے اور کیسے کرے؟ ہم نے رابطے کا ایک مختصر اور سہل طریقہ ایجاد کیا۔ وہ یہ کہ ہم نے دارالعوام سے ایک رقعہ ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ باندھ کر دیوارِ برلن اور اس سے ملحقہ گارد کے خیموں کے پار پھینکا۔ اس پیغام کا متن یہ تھا:

"HELLO EVERY BODY! NEVER HEARD FROM YOU SINCE EID. ALL QUIET ON WESTERN FRONT. INTIMATE YOUR WELFARE. HAVE ALREADY LAUNCHED ANOTHER MISSILE. APPROXIMATE SPLASH DOWN AREA VOLLEY BALL GROUND/BATH ROOMS. REPLY BY SIMILAR PROJECTILE".

(ہیلو ہر کس و ناکس! گزشتہ عید کے بعد آپ کی خیریت کی اطلاع نہیں ملی۔ مغربی محاذ بالکل خاموش ہے۔ اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔ ایسا ہی ایک میزائل پہلے بھی چھوڑا جا چکا ہے۔ اس کے سطحِ زمین پر اُترنے کا علاقہ والی بال گراؤنڈ/ غسلخانہ ہے..... اس سے ملتے جلتے میزائل کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔)

آدھ گھنٹے کے اندر اندر پیغام کا جواب آ گیا۔ ایسے پیغامات کا تبادلہ دن میں دو تین بار ہوتا۔ جب یہ سلسلہ کامیاب نظر آیا تو ایک میزائل کیمپ ۸۸ کی طرف چھوڑا۔ تجربہ کامیاب رہا اور رابطہ کی یہ صورت خاصی مقبول ہو گئی، لیکن دوسرے تیسرے دن کسی میکانکی یا فنی خرابی کی وجہ سے یہ میزائل فیل ہو گیا۔ راستے میں پتھر سے لپٹا ہوا کاغذ اُتر کر کہیں اور جا گرا اور دھاگے میں اُلجھا ہوا پتھر سنتری کے ٹخنوں سے جا ٹکرایا۔ تفتیش شروع ہوئی اور پیغام رسانی کا یہ ذریعہ بھارتی حکام کے نوٹس میں آ گیا، لیکن وہ سزا کسے دیتے۔ پیغام دینے والے کا نام تو درج نہیں ہوتا تھا۔ بس اجتماعی سرزنش کے بعد چھوڑ دیا اور درمیانی چھت پر ایک سنتری متعین کر دیا۔

لیکن ہم نے یہ مشغلہ نہ چھوڑا۔ صرف طریقِ کار میں ذرا تبدیلی کر لی۔ اب ہم پتھر کا کام والی بال سے لیتے۔ ہم والی بال کی ہوا خارج کر کے اس میں رقعہ اور بعض اوقات رسالہ یا پوری کتاب ڈال کر کیمپ ۸۸ میں پھینکتے اور درمیانی چھت پر کھڑے پہرے دار کو کہتے۔ "سنو ذرا، اُدھر کہنا، والی بال میں ہوا بھر دیں، ہمارے پاس پمپ نہیں ہے۔" وہ پیغام پہنچا دیتا۔ کیمپ ۸۸ والے تحائف قبول کر لیتے اور شکریے کی پرچی سمیت والی بال (ہوا بھر کر) واپس پھینک دیتے۔ جب ان کا ارادہ جوابی تحائف بھیجنے کا ہوتا تو وہ یہ چیزیں ہمارے خالی والی بال میں ٹھونس کر واپس پھینک دیتے اور سنتری کو کہتے "انہیں کہو، ہمارا پمپ خراب ہے، کوئی اور بندوبست کر لیں!"

سب سنتریوں سے کام لینے کی خاطر دروغ گوئی اور فریب دہی کے ہتھیار استعمال نہیں کرنے پڑتے تھے۔ مثلاً سنتریوں میں ایک سپاہی اس تاک میں رہتا کہ ہم اسے کوئی کام کہیں اور

وہ اسے بجالائے۔ عموماً ایسے سپاہی چھوٹی موٹی رشوت کے لالچ میں ایسے اشتیاق کا اظہار کرتے تھے. لیکن ایک ان میں ایسا بھی نکلا جو بغیر کسی رشوت کے ہر کام نہایت خلوص سے کرتا۔ اس نے کئی بار آتے جاتے مجھے نمستے بھی کہا اور وہ بھی کچھ اس لہجے میں کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف کہیئے۔ مَیں نے اس سنتری کے متعلق پوچھ گچھ کی تو ہمارے اردلیوں میں سے سپاہی اسحاق نے بتایا "یہ سپاہی مسلمان ہے، اس کا نام زاہد ہے، مجھے در پردہ کئی جذباتی خط لکھ کر تھما چکا ہے۔ کہتا ہے آپ میرے بھائی ہیں۔ کاش میں آپ کے کسی کام آسکتا!" مَیں نے اسحاق سے پوچھا "تمہارا دوست السلام علیکم کی بجائے نمستے کیوں کہتا ہے؟" کہنے لگا "وہ بہت ڈرتا ہے۔ ماں کے علاوہ پانچ بہن بھائیوں کا بوجھ اسی پر ہے۔ کہتا ہے نمستے کہنے سے ہمارے افسر بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ مجھے نوکری سے نکالیں گے نہیں۔"

ہم نے وقت کے پہیے کو دھکا دینے کے لیے کئی ایسے ہی مشاغل ایجاد کر رکھے تھے۔ دن اچھے گزر رہے تھے کہ اتنے میں ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء آگیا۔ قیامِ بنگلہ دیش کی پہلی سالگرہ اور متحدہ پاکستان کی برسی پر جو ہمارے دل پر گزری، اس کی کارروائی کہیں نشر نہ ہو سکی، کہیں شائع نہ ہو سکی۔ شاید یہ تھی ہی ناقابلِ اشاعت، شاید یہ ایسا تلخ باب تھا جسے تاریخ کی کتابوں سے پھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا، لیکن کتاب سے باب حذف کرنے سے ذہن سے اس کی یاد مٹائی نہیں جا سکتی! آج پھر میری سوچ کے دھارے پھوٹ پڑے، لیکن اب میری سوچ کا محور یہ نہیں تھا کہ تقسیمِ پاکستان کا ذمہ دار کون ہے، بلکہ سوچ کا پھندا اب میری گردن کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ اگر مَیں اور مجھ جیسے دوسرے ادنیٰ پرزے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کام کرتے، تو مشینری کیوں فیل ہوتی؟ کیا مجرم مَیں ہوں؟ کیا آئندہ نسلیں مجھے موردِ الزام ٹھہرائیں گی اور کیا میرے بچے میری قبر اکھاڑ کر کہیں گے کہ یہ اس شخص کا پنجر ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے پاکستان کا آدھا دھڑ گور میں اُتار دیا؟ نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، مجھ جیسا حقیر شخص اتنا بڑا المیہ کیسے تخلیق کر سکتا ہے؟ نہیں، مَیں بالکل بے گناہ ہوں..."

۱۶ر دسمبر مجھے ایسی ہی اُلجھنوں میں چھوڑ کر چلا گیا۔ مَیں خیال کرنے لگا کہ کیا میری سوچ ایک نفسیاتی مریض کی سوچ ہے؟ کیا میں ذہنی لحاظ سے مفلوج ہو چکا ہوں؟ کیا میں اپنی ذات کے بھنور سے نکل کر مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں؟ کیا مَیں مریض ہوں؟

○ ○

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اسیری میں نفسیاتی الجھنیں پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں، کیونکہ نظر بندی کے گھُٹے گھُٹے ماحول میں صحت مندانہ سوچ کے دھاروں کو رواں رکھنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ متحدہ پاکستان کی پہلی برسی پر میری سوچ کیا واقعی مریضانہ تھی، میں کہہ نہیں سکتا، کیونکہ اپنی ذات کا بے لاگ تجزیہ میرے لیے ممکن نہیں؛ البتہ میں نے اپنے ارد گرد کئی ایسے افراد دیکھے جو اسیری کے ایک سال میں کئی بیماریاں پال بیٹھے۔ میری مراد نزلہ، زکام، کھانسی، بخار یا پھوڑا پھنسی سے نہیں، کیونکہ یہ بیماریاں تو بھارتی کوششوں کے بغیر بھی آتی جاتی رہتی ہیں؛ البتہ وہاں کئی افسروں اور جوانوں کو تپ دق، فالج، ناسور (ULCER) اور سرطان (CANCER) جیسی مہلک بیماریاں لگ گئی تھیں۔ جسمانی عارضوں سے جو لوگ محفوظ تھے، ان میں سے کئی فقدانِ نیند، پریشان خیالی، غیر حاضر دماغی اور پاگل پن جیسی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے ذہنی اور جسمانی قواء کو صحیح و سالم لے کر قید سے وطن واپس آ گئے!

کیمپ ۴۴ کے جن مریضوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ ان ناچار زخمیوں اور بیماروں کے علاوہ تھے جنہیں دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے چند ماہ قبل پاکستان بھیج دیا گیا تھا۔ ان کی وطن واپسی کی وجہ بھی انسانی ہمدردی نہیں، بلکہ بھارت کا حسابی کتابی ذہن تھا۔ ایک بھارتی افسر سے پتہ چلا کہ بھارت نے دو جمع دو چار کر کے فیصلہ کیا کہ ان مریضوں پر صرف ہونے والی ادویات کی قیمت ان مریضوں کی یرغمالی حیثیت سے تجاوز کر جائے گی، اس لیے بھارت میں ان کا مزید قیام بھارت کے لیے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ بھارت اور گھاٹے کا سودا! ناممکن!!

لٰہذا مریضو! چلو پاکستان!

البتہ جو پیچھے رہ گئے ان کے علاج معالجے کے لیے نہ وسائل تھے نہ ارادہ، نہ توجہ تھی نہ لگن۔ اب وہ اس امید پر جی رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن پاکستان جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ہمیں کیمپ ۴۴ میں جیل کے باسیوں کی طبی حالت کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کیمپ ۸۸ اور کیمپ ۷۷ سے جو لوگ ڈسپنسری میں حاضری دیتے، وہ سنتریوں کے منع کرنے کے باوجود ایک آدھ اطلاعی جملہ کہہ جاتے مثلاً "آج کی سِک رپورٹ (SICK REPORT)° میں ڈیڑھ سو آدمی تھے"۔ "آج حوالدار عمر کا گلا سُوج گیا ہے"۔ "آج نائک بکر گردے کی تکلیف سے کراہ رہا ہے"۔

طبی اطلاعات کا دوسرا ذریعہ ہمارے کیمپ کے اپنے ڈاکٹر تھے جو کبھی کبھار ساتھ والے کیمپوں میں طبی معائنے کے لیے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ بھارتی میجر ملک مجھے کیمپ میں بھیجنے سے پہلے دس اسپرو کی ٹکیاں اور تین قبض کشا گولیاں دے دیتا ہے کہ جاؤ ان کی مدد سے ہزار ڈیڑھ ہزار آدمیوں کی مسیحائی کرو۔ کیمپ میں پہنچتا ہوں تو کوئی سو، سوا سو مریض صف بستہ زمین پر بیٹھے مداوائے درد کے منتظر ہوتے ہیں۔ طبی معائنے کے دوران جب پتہ چلتا ہے کہ فلاں مریض کو تین دن سے بخار ہے تو اسے اسپرو کی گولی دے دیتا ہوں۔ اگر وہ پیٹ میں درد کی شکایت کرتا ہے تو اسے قبض کشا گولی عنایت کرتا ہوں۔ لیکن ان میں خاصی تعداد ایسے مریضوں کی بھی ہوتی ہے جن کے درد کی دوا اسپرو کی ٹکیاں ہیں نہ قبض کشا گولیاں۔ ان کی بیماری کا تقاضا ہے کہ ہسپتال میں مفصّل معائنے کے بعد ان کا مکمّل علاج کیا جائے، لیکن یہ منشائے میجر ملک نہیں؛ چنانچہ کیمپ میں سے جب ایسے کیس ڈسپنسری میں بھیجتا ہوں تو وہ ڈسپنسری کے برآمدے میں درد کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں اور اندر میجر ملک اپنے تھرماس سے کافی یا سکوٹلیش جرعہ بہ جرعہ نوش کرتا رہتا ہے۔ اس پر طُرّہ یہ کہ ہمارے سپاہیوں میں یہ پروپیگنڈا

° بیمار پڑنے والے

کیا جاتا ہے کہ تمہارے علاج کی تمام سہولتیں تمہارے اپنے ڈاکٹروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر تمہیں دوا نہیں ملتی تو تمہارے ڈاکٹروں کا قصور ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ —— ہم وطنوں میں پھوٹ ڈالنے کا ایک اور طریقہ!

ہمارے کیمپ کے میجر شاہ کے پیٹ میں ناسور تھا، جو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ ناسور نے میجر صاحب کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا۔ طویل انتظار کے بعد میجر شاہ نے میجر ملک کے حضور شرفِ باریابی پایا اور اپنی تکلیف بیان کی تو بھارتی میجر نے اپنی مخمور آنکھوں کی بھاری پلکیں اوپر اُٹھائیں اور حاتم طائی کے انداز میں کہا یس (YES) یہ دو گولی اسپرو لے جاؤ، ٹھیک ہو جاؤ گے۔" میجر شاہ نے کہا "مجھے السر (ULCER) ہے' اسپرو اُلٹا نقصان دے گی۔" گستاخی کا یہ کلمہ میجر ملک کو بہت ناگوار گزرا۔ اس نے کہا "میجر! ڈاکٹر تم ہو یا ہیں؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر سنتری کو حکم دیا کہ اسے سیل میں ڈال دو۔ لہٰذا میجر شاہ کیمپ کی آزاد فضا سے نکل کر سیل کی قیدِ تنہائی میں جا پہنچے۔ اگر چند روز قیدِ تنہائی سے بیماریاں ٹھیک ہونے لگتیں، تو کلکتہ اور آگرہ سیل میں قیام کے بعد میری تمام بیماریوں کے جراثیم ختم ہو چکے ہوتے۔

لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ طویل قیدِ تنہائی کے باوجود میری کلکتے والی بیماری اب بھی کبھی کبھی آمہمان بنتی۔ مَیں نے پاکستانی سرجن میجر بشیر کی وساطت سے میجر ملک تک رسائی پائی، لیکن اس نے جواب دیا "اگر یہ قیدی پہلے کلکتے میں بیمار رہ چکا ہے، تو یقیناً اس کا طبی معائنہ اور علاج ہو چکا ہوگا۔ اب اسے آگرہ ہسپتال بھیجنے کی ضرورت نہیں۔" مَیں واپس چلا آیا۔ سفارش کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے مجھے علاج معالجے کے لیے سیل میں نہ بھیجا۔

جنوری ۱۹۷۳ء کا پہلا اتوار تھا۔ مَیں صبح صبح تازہ روٹی اور باسی سالن کھا کر اُجلی دھوپ میں بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا تو اچانک دائیں آنکھ میں درد کی ٹیس اُٹھی۔ فوراً ہاتھ کتاب سے اُٹھ کر آنکھ تک پہنچا۔ آنکھ کو بہت سہلایا، سمجھایا، بہلایا، پھسلایا، لیکن نہ مانی۔ چھٹی کا دن تھا۔

میجر ملک کی جگہ لیفٹیننٹ تِنگے ڈیوٹی پر تھا۔ تِنگے نسبتاً انسانیت سے قریب تھا۔ اس نے مجھ پر ڈسپنسری کا امرت دھارا یعنی اسپرو استعمال کیا۔ لیکن درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس واقعے سے چند ہفتے پہلے ہمارے کیمپ کے میجر انیس کی ایک آنکھ نے ایک ایسی ہی ٹیس کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیا تھا۔ مجھے اور میرے ساتھی ڈاکٹر لبشیر کو فکر ہوئی کہ پتہ نہیں میری آنکھ میجر انیس کی آنکھ سے زیادہ باہمت ثابت ہوتی ہے یا یہ بھی دَم توڑ دیتی ہے۔ میجر لبشیر کی تگ ودو اور لیفٹیننٹ تِنگے کی سادگی کے طفیل مجھے فوری طور پر ہسپتال بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خوش قسمتی سے میجر ملک روڑہ اٹکانے کے لیے موجود نہ تھا۔

مَیں نے ایک تھیلے میں روزمرہ کی چند چیزیں ڈالیں اور بھارتی نرسنگ سپاہی کے ساتھ ہولیا۔ کیمپ والوں نے خوشی خوشی مجھے رخصت کیا اور کہا "چلو، اچھا ہوا، جیل کی گھٹن سے تو نکلے۔ باہر کی کھُلی فضا دیکھو گے تو ایک سال کی ترسی ہوئی آنکھیں تروتازہ ہوجائیں گی، درد خود بخود ٹھیک ہوجائے گا اور اگر ٹھیک نہ ہوا تو بیماروں کی اگلی کھیپ کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ گے۔ اچھا خدا حافظ، واہگہ بارڈر پر جو بھی ملے ہمارا سلام کہنا۔ اور ہاں خاکِ وطن کو چومنا ہرگز نہ بھولنا۔ ٹا۔ ٹا۔ گاڈ بلیس یو۰۔"

جیل سے نکلتے وقت تین مختلف دروازوں اور پھاٹکوں پر میری اور میرے تھیلے کی تلاشی لی گئی۔ چار آدمی نگہبانی کے لیے ساتھ ہوئے۔ اس کے بعد میں لکڑی اور کوئلہ ڈھونے والے ٹرک میں سوار ہوا۔ ایک سنتری نے بڑھ کر دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی، دوسرے نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ٹرک چاروں طرف سے بند تھا۔ باہر کچھ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس قدر احتیاط اے صیاد
کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے

اس تجربے میں سنتری، ٹرک اور آنکھوں کی پٹی کے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ زہر

---

۰ "GOD BLESS YOU" اللہ آپ پر مہربانی کرے۔

تو یاروں نے کئی بار پیا ہے، لیکن لوہے کے کنگن پہننے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اگرچہ فورٹ ولیم سے کلکتہ سیل تک سفر کے دوران رسّی سے میرے ہاتھ باندھ کر ہتھکڑی پہننے کی ریہرسل کرائی جا چکی تھی، لیکن رسّی سے ہاتھ باندھنے اور ہتھکڑی پہنانے میں بہت فرق ہے، اور یہ فرق محض پٹ سن اور لوہے کا نہیں، بلکہ ان دونوں سے پیدا ہونے والے نفسیاتی ردِّ عمل کا ہے۔ ہتھکڑیاں پہن کر میرے ذہن میں عادی مجرموں کے چہرے گردش کرنے لگے — ڈراؤنے، بدشکل، جرائم پیشہ چہرے! انہی چہروں میں مَیں نے اپنا چہرہ بھی دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا مَیں بھی ان میں سے ایک ہوں؟ کیا مجھے احساسِ جُرم دلانے کے لیے یہ کنگن پہنائے گئے ہیں؟ یا یہ سارا تردّد میری انا اور عزّتِ نفس کو کچلنے کے لیے کیا گیا ہے؟ اگر مقصد احساسِ جرُم دلانا ہے، تو مَیں نے جرُمِ ضعیفی کے سوا کیا قصور کیا ہے؟ کیا کسی غریب الدیار کا بیمار پڑنا بھی قابلِ تعزیر ہے۔ مَیں آنکھوں پر پٹّی کی وجہ سے صرف اپنے اندر ہی دیکھ سکتا تھا اور جتنا اندر جھانکتا، تاریکیاں اتنی ہی گہری ہوتی جاتیں۔

آگرہ ملٹری ہسپتال پہنچا تو ایک بھارتی معالج نے بے دلی سے ہتھکڑی سمیت میری آنکھ کا معائنہ کیا اور ایک منٹ کے اندر اندر فیصلہ سُنا دیا "مجھے درد کہیں نظر نہیں آتا۔" درد بھی گویا نظر آنے والی چیز ہے! اور پاس کھڑے بھارتی نرسنگ سپاہی کو کہا "لے جاؤ اسے پی ڈبلیو ہسپتال° میں — دیکھا جائے گا۔"

پٹّی اور ہتھکڑی سمیت ٹرک میں آدھ گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے چھاؤنی کے ایک ویران گوشے میں ایک پھاٹک کے سامنے اتار دیا گیا۔ خاردار باڑ، پہرے دار اور بُرج نشین سنتری دیکھ کر اندازہ کیا کہ یہی پی ڈبلیو ہسپتال ہے۔ دُور سے باڑ کے اندر دھاری دار پاجامہ بش شرٹ پہنے چند مریض دکھائی دیے۔ قیاس یقین میں بدل گیا۔

پھاٹک کے باہر جانے والوں کی شناخت اور تلاشی کے لیے ایک بُڈھا فوجی موجود تھا۔

° یعنی جنگی قیدیوں کا خصوصی ہسپتال

وہ گندی وردی پہنے سٹول پر گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں گندی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ فوجی ٹوپی اس کے سر سے سرک کر ایک کان پر اٹکی ہوئی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں سے زرد شدہ انگلیوں میں اس نے ادھ جلا سگریٹ پکڑ رکھا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے نرسنگ سپاہی نے اس بوڑھے کو کہا "یہ قیدی داخل ہونے آیا ہے، بیگ کی تلاشی لے لو۔" بڈھا پتہ نہیں کب کا ستایا ہوا تھا، گہرا کش لگا کر کہنے لگا "ارے لے جاؤ اسے اندر، بیگ ویگ کیا دیکھنا ہے۔ بس یہی کپڑا لتا تو ہوگا۔" میں نے کہا "نہیں، بڑے میاں! تم تسلی کر لو، کیا پتہ اس بیگ میں بم رکھا ہو۔" اس پر وہ پھٹ پڑا "ارے تم لاؤ بم ادھر، کہیں جان تو چھوٹے ہماری۔ خود اندر گرم گرم کمبلوں میں سوئے رہتے ہو اور ادھر سردی میں ہم ٹنگے رہتے ہیں۔ تمہاری جان نہیں چھوٹتی تو بم پھٹنے سے ہماری تو خلاصی ہو۔ ارے لاؤ تم بم۔" یوں بڑبڑاتے ہوئے اس نے بے دلی سے بیگ کا منہ کھولا اور چشمِ نیم وا سے اسے مشرف کرتے ہوئے بند کر دیا۔ اور ہم چل پڑے، لیکن پیچھے سے اس کے بڑبڑانے کی آواز ابھی سنائی دے رہی تھی "جاؤ، لے جاؤ اسے، چھٹی کے دن بھی آرام نہیں کرنے دیتے۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس نے ایک آنکھ بھینچ کر زور کا کش لگایا — اور چٹکی سے راکھ جھاڑ دی۔

پی ڈبلیو ہسپتال انگریزوں کے وقت کالا ہسپتال کہلاتا تھا۔ گورے گئے تو کالوں نے گورا ہسپتال سنبھال لیا اور کالا ہسپتال کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پاکستانی زخمی اور بیمار آئے تو اس ہسپتال کی قسمت جاگی۔ یہ نئے سرے سے آباد ہو گیا اور دور و نزدیک پی ڈبلیو ہسپتال کے نام سے مشہور ہوا۔

پی ڈبلیو ہسپتال میں ہسپتالوں والی کوئی ادا نہ تھی۔ نہ سفید دھلی ہوئی چادریں، نہ سفید پوش نرسیں، نہ لال کمبل، نہ دو دو تکیے، نہ لیبارٹری کی بو نہ دواؤں کی مہک، نہ ایکسرے وغیرہ کی چمکتی ہوئی مشینیں، نہ سفید گاؤن پہنے ماہر ڈاکٹر۔ بھلا بیماروں اور زخمیوں کو چند بیرکوں میں جمع کر دینے سے بھی کبھی ہسپتال قائم ہوا ہے!

ہسپتال کی ٹوٹی پھوٹی متروک بیرکوں میں... لوہے کی چارپائیوں پر گھاس پھوس کے پچکے ہوئے گدے پڑے تھے۔ جن پر لیٹنے سے پسلیاں پہلے سے زیادہ درد کرنے لگتیں۔ ادویات کا کُل سرمایہ چند چھوٹی چھوٹی بوتلیں تھیں جو ایک چھوٹے سے کمرے کے ایک کونے میں چھوٹی سی الماری کے اوپر والے شیلفوں میں رکھی تھیں۔ دواؤں کے اس خزانے کی چابی بھارتی حکام کے پاس ہوتی اور ان کا دیدار کسی افسرِ بالا کے دورے کے وقت حاصل ہوتا۔ روزانہ کی نگہداشت کے لیے ساتھ والے کیمپ (۴۳) سے اپنے ڈاکٹر اور نرسنگ سپاہی آتے تھے اور چند گھنٹے گزار کر واپس چلے جاتے تھے۔ ان کی وردی پر بھی پی ڈبلیو کی چھاپ ہوتی اور وہ سنگین بردار پہرے داروں کی زیرِ حفاظت اپنے کیمپ سے ہسپتال میں داخل ہوتے۔ وہ بیچارے ہمیں شفایاب کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے۔ یعنی حال پوچھتے، وطن واپسی کی امید دلاتے اور تسلّی دیتے۔ چند روز بعد بھارتی حکام نے محسوس کیا کہ کہیں ان زبانی انجکشنوں ہی سے ہم سچ مچ صحت یاب نہ ہو جائیں۔ انہوں نے باہمی گفتگو کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اب پاکستانی معالج بھارتی این سی او کی زیرِ نگرانی اپنے ہم وطن کی نبض پر دستِ شفا رکھ کر یا پیٹ کو ہاتھ سے دبا کر دیکھتا۔ یعنی وہ ہاتھوں کے لمس اور نگاہوں کے التفات سے ہی مداوائے درد کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض اوقات معالج اور مریض کا اتنا ملاپ بھی بھارتی این سی او کو گراں گزرتا تو وہ فوراً مداخلت کرتا "زیادہ ٹیم (TIME) مت لگاؤ۔ آرڈر نہیں ہے۔"

ایسی طبّی مراعات ہم نے کہیں دیکھی تھیں نہ سُنی تھیں، لیکن اس کے باوجود ساری دُنیا میں ان طبّی سہولتوں کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ یہ طرفہ تماشا دیکھ کر تسلیم کرنا پڑا کہ بھارت عظیم ہے، کیونکہ ہینگ یا پھٹکڑی لگائے بغیر چوکھا رنگ لانے کے گُر جانتا ہے۔

ڈاکٹر اور دوا کے علاوہ ہسپتال کے تصوّر کے ساتھ دو اور چیزیں منسوب سمجھی جاتی ہیں۔ صاف ستھرا صحت مند ماحول اور ہر مریض کے معدے کے مطابق خوراک۔ یہاں یہ دونوں

چیزیں معکوس شکل میں موجود تھیں۔ یعنی مچھر اور مکھیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہمارے بستر، جسم اور کھانے کے برتنوں پر چھا جانے کے بعد بھی خاصی تعداد میں بچ جاتی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس زائد فصل کا کیا کریں۔ مکھیوں اور مچھروں سے جو خوراک بچ جاتی تھی، وہ ٹھنڈی غلیظ اور ناقابلِ استعمال ہوتی تھی۔ جو لوگ بھوک کے زور سے یا بھارت میں "غریبی بڑھاؤ" کی مہم کو فروغ دینے کے لیے کچھ کھا سکتے تھے، ضرور کھاتے تھے۔ باقی لوگ امید پر گزر اوقات کرتے تھے۔ گویا ماحول نہایت غلیظ و کثیف اور خوراک سستی اور غیر صحت بخش۔

البتہ ہسپتال میں ایک فائدہ ضرور تھا کہ ہم اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر باڑ کے باہر آزاد شہریوں کی حرکات و سکنات سے محظوظ ہو سکتے تھے۔ باہر کے مناظر کی دو چیزیں دیدنی تھیں۔ ہسپتال کے عقب سے بھارتی جے سی او شام کو اپنی اپنی فیملی سمیت بن ٹھن کے نکلتے۔ صوبیدار صاحب خود موٹی توند اور بھری ہوئی مونچھیں لیے آگے آگے ہوتے اور ان کی شریمتی گلقند بلنے کے باوجود گلاب کا پھول جُوڑے میں سجائے، ماتھے پر تلک لگائے اس کے پیچھے پیچھے ہوتی۔ کبھی کبھی ان کے ننھے مُنے بچے بھی باپ کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے۔ دوسری جانب منظر گلائیڈنگ کلب (GLIDING CLUB) کا تھا، جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لکڑی کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھ کر محوِ پرواز ہوتے۔ ہم دالان میں بیٹھے ہوتے اور وہ ہمارے سروں کے اوپر ایک آدھ چکر لگاتے۔ وہ ہماری پستی اور ہم ان کی بلندی کا نظارہ کرتے اور پھر وہ سر سبز درختوں کی اوٹ میں اُتر جاتے۔ بھلا یہ عیاشی جیل میں کہاں؟

لیکن یہ نظارے ہر وقت میسر نہ آتے تھے۔ عموماً ہمیں باڑ کے اندر کی دنیا میں محو رہنا پڑتا۔ اور یہ دنیا رنج، دُکھ، اندوہ اور یاس کی دُنیا تھی۔ ہسپتال میں تین چار سو افراد تھے جو نومبر ۷۲ء میں اپنے اپنے کیمپوں سے اس واضح یقین دہانی پر روانہ ہوئے تھے کہ سب لوگ پاکستان جا رہے ہیں، لیکن انہیں پاکستان بھیجنے کی بجائے آگرہ ریلوے سٹیشن پر اُتار لیا گیا تھا اور آج تک کسی نے ان کی ٹرین کی تاخیر یا تنسیخ کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ یہ اب بھی امید لگائے بیٹھے تھے

کہ کوئی روپہلی صبح طلوع ہوگی، کاگا بولے گا، ہمیں بُلاوا آئے گا کہ چلو خوگرانِ غربت، سوئے وطن چلو! لیکن گزشتہ دو مہینے سے ایسی کوئی صُبح طلوع نہیں ہوئی تھی۔

انہوں نے پہلے روز ہی مجھ سے پوچھا "کیمپ میں کیا خبر ہے، زخمی اور مریض کب جا رہے ہیں؟" میں نے دیانتداری سے کہا "ایسی تو کوئی خبر نہیں"۔ کہنے لگے "خبر نہ سہی، قیاس آرائیاں کیا ہیں؟" میں سمجھ گیا کہ ان کی امیدوں کے ٹمٹماتے دیئے کو تیل کی ضرورت ہے۔ میں نے اس میں تیل کی چند بوندیں نچوڑنے کی خاطر کہہ دیا "بس دو چار ہفتے میں آپ جانے والے ہیں"۔ "دو چار ہفتے؟ — ہم نے تو سُنا ہے کہ بس دو چار روز کی بات ہے، بلکہ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ بس دو گھنٹے ہی کا نوٹس دے کر ہمیں روانہ کر دیا جائے گا"۔ انہوں نے میری خبروں کو اپنی توقعات سے کمتر پاتے ہوئے کہا۔ شاید جیل میں باہر کی خبریں مشکل سے پہنچتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں انہیں کوئی خوش کُن خبر سُناتا تو وہ ضرور کہتے "ہاں بھئی! جیل تو خبروں کا مرکز ہے۔ بھارتی عملہ، بھارتی اخبار اور ریڈیو وغیرہ موجود ہے"۔

کشتِ امید کی آبیاری کرنے کے مختلف بہانے تلاش کرنا ان مریضوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ کبھی سوچتے کہ ہمارا علاج معالجہ اس لیے بند ہے کہ ہم پاکستان جانے والے ہیں۔ کبھی اندازہ لگاتے کہ اگر ساتھ والی بیرک میں رات کو کراہنے والے مریض کو بے وجہ آرام آ گیا ہے تو ضرور وطن واپسی کے لیے ایک شگون ہے۔ اگر آج تیسری بیرک سے نکلنے والا کُبڑا مریض کم کُبڑا دکھائی دیتا ہے تو ضرور وطن واپسی کی نوید نے اس کی کمر سیدھی کر دی ہوگی۔ دائیں بیرک میں لڑنے والے پاگلوں میں سے آج کسی نے دوسرے کا سر نہیں پھوڑا، کیونکہ ان کے تحت الشعور میں وطن روانہ ہونے کا مژدہ پہنچ گیا ہے۔ بس یونہی امید کے بُلبلے بنتے اور ٹوٹتے رہتے۔

مَیں نے وقت گزارنے کے لیے مریضوں کا حال پوچھنا شروع کر دیا۔ ایک جے سی او نے کہا "جنگ میں میرا دایاں بازو اور ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔ آپریشن کی بجائے بس وقتاً فوقتاً"

مرہم پٹی ہوتی رہی۔ اب حال یہ ہے کہ ٹانگ سُکڑ کر چھوٹی ہو چکی ہے اور بازو کی ہڈیوں میں پیپ پڑ گئی ہے۔ انشاءاللہ پاکستان جاکر آپریشن کراؤں گا۔"

ایک این سی او نے بتایا "میرے پیٹ میں پھوڑا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنے ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اگر بروقت آپریشن نہ ہوا تو اس کے پھٹنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، لیکن ہندوستانی توجہ نہیں دیتے۔ امید ہے کہ یہ نوبت آنے سے پہلے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ ایک دفعہ اپنی آنکھوں سے اپنے وطنِ پاک کی سرزمین کو چُوم لوں، پھر چاہے واہگہ ہی پر دم توڑ دوں، کوئی فکر نہیں۔"

ایک ساٹھ سالہ باریش بزرگ نے بتایا "میں نے پانچ جنگیں لڑی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم مشرقِ وسطےٰ میں۔ دوسری برما میں۔ پاکستان بننے کے بعد پہلے کشمیر کے جہاد میں حصّہ لیا۔ اور ۱۹۶۵ء میں سیالکوٹ کے محاذ پر لڑا۔ ۱۹۷۱ء میں ہمارے گاؤں (نزد چکوال ضلع جہلم) میں ڈھول پیٹ کر اعلان کیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں مدد پہنچانی ہے۔ ولنٹیر (VOLUNTEER) چاہئیں، تو مَیں نے ولنٹیر کر دیا اور ای پی سی اے ایف° میں بھرتی ہو کر سلہٹ چلا آیا۔

مَیں نے اس کی صحت اور حوصلے کی تعریف کی تو کہنے لگا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انشاءاللہ بھارت کے خلاف اگلی لڑائی میں بھی حصّہ لوں گا۔ صرف آنکھیں، دانت اور کان جواب دے گئے ہیں، لیکن میری ٹانگیں اور بازو آج کے نوجوانوں سے بھی مضبوط ہیں۔"

جیل میں میری ملاپ کی مہم زوروں پر تھی کہ ایک ساتھی افسر نے کہا "سپاہیوں سے ملنا منع ہے۔ ہمارا تو نام پاکستان جانے والوں کی فہرست میں ہے۔ حُکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے کہ کہیں فہرست سے نام ہی نہ کاٹ دیا جائے۔ تم بھی احتیاط کرو، ورنہ واپس جیل بھیج دیئے جاؤ گے۔" وہ ابھی اپنے پند و نصائح میں محو تھے کہ دو تین بپھرے ہوئے پاگل لڑتے جھگڑتے ہماری بیرک کے پاس آنکلے۔ باقی مریض ان کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

° ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (EPCAF)

ایک پاگل چلّا رہا تھا" یہ پاکستان ہے۔ کون کہتا ہے پاکستان جاؤ؟ میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔ یہی پاکستان ہے۔ میں گولی مار دوں گا۔ یہ ہمارا پاکستان ہے۔" دوسرا پاگل ہندوستان پر برس رہا تھا" لاؤ ادھر اندرا گاندھی کو، مَیں اُس کو ٹھیک کرتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ مَیں اندرا کے بغیر کسی سے بات نہیں کروں گا۔ مَیں دِلّی جاؤں گا۔ جھنڈا لے کر جاؤں گا۔ لاؤ اندرا گاندھی کو میرے سامنے۔"

ایسے پاگلوں کی تعداد زیادہ تھی اور جوں جوں قید اپنا اثر دکھاتی تھی، کمزور اعصاب والے اپنے حواس کھوتے جاتے تھے۔

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

سپاہیوں سے میل ملاپ پر پابندی سے مجھے آگاہ کیا گیا تو مَیں نے ساتھی افسروں کے ساتھ وقت کاٹنا شروع کر دیا۔ افسروں میں میجر اقبال سے میرے دیرینہ تعلّقات تھے۔ وہ سپلائی کے محکمے سے متعلق ہونے کی وجہ سے میری جملہ ضروریات پوری کرتے رہتے تھے۔ مثلاً جب انہیں پتہ چلتا کہ دال روٹی سے میرا پیٹ نہیں بھرتا اور مجھے اچھی نثر کی بھوک رہتی ہے تو وہ شگفتہ نثر لکھ کر پیش کرتے اور انکسار سے کہتے ــــ "آپ جس ضیافت کے عادی ہیں، یہ ناچیز اس کا نعم البدل نہیں، بس سلاد سمجھ کر قبول فرمائیے۔" مَیں ان کی نثر سے لُطف اندوز ہوتا تو یہ فروٹ کے طور پر دوسروں کے شعر سُنا کر تواضع کرتے۔ مَیں نے کئی بار ان سے حفیظ جالندھری کی لَے میں علّامہ اقبالؒ کا کلام سُنا۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے!

میجر اقبال کے ساتھ والی چارپائی پر ایک اور صاحب تھے جنہیں شاعری کے علاوہ بھی کوئی ذہنی مرض تھا۔ جب وہ لہر میں ہوتے تو مجھے اور میجر اقبال کو سامعین بنا کر شعر نچھاور کرنے لگتے اور ہم بلا چون و چرا سنتے رہتے، لیکن جب ان کا مُوڈ نہ ہوتا اور ہم استدعا کرتے کہ" حضور! شعر عطا ہو" تو غصّے سے کہتے کیا تم نے مجھے پبلک اینٹرٹینر (PUBLIC ENTERTAINER)

—— یعنی بازاری تماشا گر —— سمجھ رکھا ہے؟" تھوڑی دیر بعد خود ہی اپنی تلخ کلامی پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے "برخوردار! معاف کرنا میرا ذہنی توازن درست نہیں۔ کبھی کبھی عجیب بکواس کر جاتا ہوں، جس کا بعد میں مجھے افسوس ہوتا ہے۔"

یہ صاحب سرکاری طور پر بے دھیانی اور پریشاں خیالی کے مریض تھے۔ ایک دن بھارتی نرسنگ سپاہی نے انہیں برج کھیلتے دیکھ لیا اور شکایت کر دی کہ جو شخص تاش کے باون پتے یاد رکھ سکتا ہے، وہ بے دھیانی اور پریشاں خیالی کا شکار کیسے ہو سکتا ہے! گواہی معتبر ٹھہری اور انہیں کچھ عرصہ بعد سنٹرل جیل آگرہ منتقل کر دیا گیا، لیکن ہسپتال سے کیمپ لوٹنے والوں میں صرف برج کے قصور وار کھلاڑی ہی نہ تھے، بلکہ بعض اوقات بھارتی ارشادات کی مکمل تعمیل کرنے والے بھی وطن لوٹنے کی بجائے کیمپ میں واپس بھیج دیے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک باذوق کپتان صاحب بطور مریض آگرہ سے دُور کسی کیمپ سے پی ڈبلیو ہسپتال میں منتقل ہوئے تھے۔ ایک روز ایک بھارتی این، سی، او ان کے پاس آیا اور کاغذ پھیلا کر کہنے لگا "میں آپ کے پُرانے کیمپ سے آیا ہوں۔ پرسوں مریضوں کی گاڑی پاکستان روانہ ہو رہی ہے۔ آپ اپنے سامان کی رسید پر دستخط کر دیں۔" کپتان صاحب نے پوچھا "سامان کدھر ہے؟" اس نے پُرانا ٹرانزسٹر (TRANSISTOR) سامنے کر دیا۔ کپتان صاحب نے کہا "ٹرانزسٹر کے اس پنجر کا تعلق میرے جاپانی ریکارڈ پلیئر اور تین درجن ریکارڈز سے نہیں ہو سکتا۔ اور وہ میرا کیمرہ اور طلائی انگشتری کہاں گئی؟" جواب مِلا "اگر ایسی چھان بین میں پڑے تو گاڑی سے رہ جاؤ گے۔۔۔ بس سوچ لو!" کیپٹن صاحب نے سوچ لیا کہ پاکستان پہنچنا مقدم ہے، چیزیں تو پھر بھی مل سکتی ہیں، چنانچہ انہوں نے دستخط کر دیے اور بھارتی این، سی، او "کاغذات کی تکمیل" کر کے واپس چلا گیا۔ دو تین روز بعد مریضوں کی گاڑی پاکستان روانہ ہوئی، لیکن اس میں کپتان صاحب سوار نہیں تھے۔ انہیں جیل جانے والے ٹرک میں سوار کیا جا چکا تھا۔

ہسپتال سے کیمپ میں منتقلی کوئی بہت بڑا عذاب نہیں تھا، لیکن جس کی نگاہیں واہگہ پر

لگی ہوں، اسے جیل بھیج دیا جائے تو صدمہ ضرور پہنچتا ہے۔

لوگ ہسپتال سے کسی نہ کسی بہانے جیل یا کیمپ میں ایک ایک کر کے بھیجے جاتے رہے، لیکن مجھے کسمپرسی کے عالم میں ہسپتال ہی میں رکھا گیا۔

ہسپتال میں قیام کے دوران ہی اسیری کی دوسری بقرعید آئی۔ عید کے باوجود روزانہ کے مینو (MENU) یا روزمرہ کے لباس میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہی سبزی، دال، گوشت، چاول وغیرہ اور وہی مریضانہ دھاری دار پاجامہ اور بش شرٹ ۔ اور یہ کپڑے بھی ایسے کہ پہننے والے کا مذاق اُڑاتے۔ پہننے والے کے قد و قامت کے لحاظ سے کبھی پاجامہ سُکڑ کر نیکر بن جاتا اور کبھی بش شرٹ پھیل کر غرارہ لگتی۔ مجھ جیسا شخص تو ایسے لباس میں اور بھی کارٹون لگتا۔ میرا پاکستانی تُنبان بھارتی بش شرٹ سے طویل تر اور عظیم تر دکھائی دیتا۔

انھی کپڑوں سمیت ہمیں اپنے سپاہی مریضوں کے ساتھ عید پڑھنے کی مشروط اجازت ملی۔ شرط یہ تھی کہ وہاں آپس میں بات چیت نہیں ہو گی۔ خطبہ اور وعظ سُننے کے لیے اُردُو داں محتسب موجود ہوں گے۔ خبردار، اگر کسی نے ایسی ویسی بات کی۔

ہم سب گھاس پر صف بستہ بیٹھ گئے۔ ایک صاحبِ علم مریض نے اینٹوں کے منبر پر بیٹھ کر ہمیں عید قربان کی فضیلت سمجھائی، پھر عید پڑھائی اور ہم اُٹھ کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ بھارتی انٹیلی جنس اور گارڈ ڈیوٹی کا عملہ پاس کھڑا عید ملن کا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک بھارتی سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا "یہ مُسلے بھی عجیب ہیں، افسر اور سپاہی میں تمیز ہی نہیں۔ پہلے اکٹھے زمین پر بیٹھے رہے، پھر اُٹھ کر گلے ملنے لگے۔ ہماری فوج میں تو افسر سپاہی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔" دوسرے نے جواب دیا" وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو.... لیکن تم نے یہ دیکھا کہ مُسلے گلے ملنے کے بڑے شوقین ہیں۔ ابھی دو ماہ ہوئے (عید الفطر پر) اسی طرح پوجا پاٹ کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سب اُدھر اکٹھے ہی رہے، کوئی کسی سے جُدا نہیں ہوا، لیکن آج پھر گلے مِل رہے ہیں۔ ہوا کوئی پردیس سے عرصے بعد آیا تو مِل لیا!"

وہ ہماری حرکات پر تبصرہ کرتے رہے اور ہم واپس اپنی اپنی بیرکوں میں چلے گئے۔

عید سے چند روز بعد مجھے ملٹری ہسپتال میں چند بیمار سپاہیوں سمیت "برائے معائنہ" بھیجا گیا۔ وہی ٹرک، وہی ہتھکڑی، وہی آنکھوں پر پٹی، وہی گارد وغیرہ کے لوازمات جن پر ہمیشہ ہماری نقل مکانی کے موقعے پر اسی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا جیسے شادی یا موت کی رسوم پوری کی جاتی ہیں۔ اس بار صرف اتنا اضافہ ہوا کہ میری ہتھکڑی کا ایک کنگن میری کلائی میں تھا اور دوسرا ایک ہم وطن سپاہی کی کلائی میں۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار۔ یوں اسیری میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ عید، بقرعید کے موقعے پر صرف بغل گیر ہونے کا ہی موقع نہ ملا، بلکہ ایک ہی ہتھکڑی میں سفر کرنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔

ملٹری ہسپتال میں ہمیں ٹرک سے اُتار کر ہتھکڑی اور آنکھوں پر پٹی سمیت زمین پر بٹھا دیا گیا۔ پاؤں کی چاپ، بچّوں کی آواز اور افسروں کی ڈانٹ کانوں میں پڑتی تو پتہ چلتا کہ ہم کسی آباد جگہ بیٹھے ہیں۔ جب دواؤں کی بُو اور مکسچر کی مہک ناک سے ٹکرائی تو یقین آیا کہ ہم واقعی ہسپتال میں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ گرد و پیش کے مناظر کو سُننے اور سونگھنے کی بجائے دیکھنا بھی چاہیے۔ میں نے کان یا آنکھ کھجانے کے بہانے ایک آنکھ سے پٹی اس طرح سرکائی کہ رائفل بردار سنتری کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ شاید کسی شریمتی کو تاک رہا تھا۔ میں نے کانی آنکھ سے سارا منظر خوب سیر ہو کر دیکھا۔ باوردی افسروں کی شریمتیاں اور بچّے سوٹ پہنے شہری، رنگ برنگی ساڑھیاں، نوع نوع کی گاڑیاں، طرح طرح کے آدمی، تماشائیوں کا ایک ہجوم ہسپتال کے برآمدے میں کھڑا مجھے اور میرے پانچ ساتھیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ ہم میں افسر یا سپاہی کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ ہمیں بس قیدی سمجھ کر دیکھتے رہے۔ ایک عورت نے ہماری طرف انگلی بھی اٹھائی۔ قیدیوں پر لوگ انگلیاں تو اٹھاتے ہی ہیں ہم کیا کہہ سکتے تھے، تماشا اور تماشائی بنے گھاس پر بیٹھے رہے۔

اتنے میں سٹریچر (STRETCHER) پر ایک پاکستانی قیدی کو برآمدے میں سے

آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا گیا۔ سٹریچر کے آگے پیچھے دو دو سنتری سنگینیں تانے قدم سے قدم ملا کر یوں مستعدی سے چل رہے تھے گویا قیدی میں ابھی قوتِ پرواز آ جائے گی تو وہ اسے ہوا ہی میں نشانہ بنا کر زمین پر گرا لیں گے، لیکن یہ قیدی آپریشن تھیٹر میں گیا، تو زندہ واپس نہ آ سکا۔ سنتریوں کو مایوس ہو کر سنگینیں نیچے کیے واپس جانا پڑا۔ میت مُردہ خانے بھجوا دی گئی۔ پتہ نہیں کون تھا بیچارا؟ کتنے ہاتھ وطن میں اس کی سلامتی کے لیے اُٹھتے ہوں گے؟ کتنی آنکھیں اس کی راہ تکتی ہوں گی؟ کاش میں نے آنکھوں سے پٹّی نہ سرکائی ہوتی!—— میں نے یہ منظر نہ دیکھا ہوتا!

ہسپتال میں ہمیں باری باری اندر بُلایا گیا۔ مَیں اندر گیا تو میرے معالج نے ایک نظر میری آنکھ کو دیکھا، لیکن اسے کہیں درد نظر نہ آیا۔ "جھوٹا، مکّار، دغا باز" قسم کے چند زبانی ٹیکے لگا کر اس نے مجھے دوسرے ساتھیوں سمیت واپس پی ڈبلیو کیمپ بھجوا دیا۔ خدایا! تُو نے درد کو نظر آنے والی چیز کیوں نہ بنایا؟ کم از کم مکّار اور دغا باز کے القاب تو نہ سُننے پڑتے!

پی ڈبلیو ہسپتال میں مَیں مزید دو ہفتے لاعلاج پڑا رہا اور اس عرصے میں اپنے ساتھیوں کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے اور وہ جلد سے جلد وطن جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرنے کو تیار نہیں جس کی پاداش میں ان کا نام پاکستان جانے والوں کی فہرست سے کاٹ دیا جائے۔ (میرے سوا سب کے نام فہرست اوّل، دوئم، سوئم یا چہارم میں تھے)

وطن واپسی کے لیے بھارتی عملے کی خوشنودی ہر ایک کو عزیز تھی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ وہ اپنی یا کسی اور کی خطا کی وجہ سے پاکستان جانے سے رہ نہ جائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا ان میں سے ہر کوئی گہرے پانی میں غوطے کھا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں امید کی رسّی ہے، جس کا سرا بھارتی عملے کے ہاتھ میں ہے۔ گویا جب کوئی بھارتی کارندہ رسّی کا سرا چھوڑ دے گا، یہ مریض غوطے کھاتا ڈوب جائے گا۔

اس انتہائی احتیاط اور خوشنودی کے متعلق کئی لطیفے بھی مشہور ہوئے، یعنی ایک مریض کو بھارتی نرسنگ سپاہی نے ڈانٹا کہ "تم نے سانس کیوں لیا؟" تو مریض نے نہایت نرمی سے جواب دیا "حضور! میری خطا معاف، مَیں نے تو سانس نہیں لیا، ضرور کسی اور کے سانس کا آپ نے مجھ پر شُبہ کیا ہے۔" یا بھارتی عملے کا کوئی فرد کسی مریض کو کہتا کہ "لیٹے لیٹے یہ بازو تم نے کیوں ہلایا؟" تو انکسار میں ڈوبا ہوا جواب ملتا "نہیں، جناب! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب سے میں اس ہسپتال میں آیا ہوں میں نے یہ بازو نہیں ہلایا۔ یہ بازو تو دراصل ہلنا جانتا ہی نہیں۔"

مجھے ان مریضوں پر ترس آنے لگا جن کے اعصاب سے بھارتی حکام کھیل رہے تھے۔ نت نئی فہرست اٹھا لاتے اور کہتے کہ "دلی سے حکم آیا ہے کہ نئی فہرست بناؤ۔" امید اور تیز ہو جاتی۔ فہرست مرتب ہو کر چلی جاتی اور پھر بات بات پر دھمکیوں کا دور شروع ہو جاتا کہ اگر ریڈکراس کے سامنے خوراک یا دوائی کی شکایت کی تو تمہارا نام فہرست سے نکال دیا جائے گا۔ پاکستان جانے والا بیمار جس کی گاڑی اچانک آگرہ آ کر رُک گئی ہو کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس کا نام فہرست سے نکال دیا جائے!

مجھے اس ماحول سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہر طرف بیمار، زخمی، پاگل اور نیم پاگل اس کے ساتھ ساتھ مریضوں کے اعصاب سے بھارتی عملے کی چھیڑ چھاڑ۔ مَیں تنگ آ گیا۔ مجھے نہ دوا ملتی تھی اور نہ کسی فہرست ہی میں میرا نام تھا۔ بھلا میں کیوں یہاں کے مریضانہ ماحول میں کڑھتا رہوں۔ چنانچہ ایک روز حسبِ معمول جب پاکستانی ڈاکٹر معائنہ کرنے آئے تو مَیں نے میجر افتخار سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے جیل بھجوا دیں۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے مدد کرنے کی حامی بھر لی اور دو تین روز بعد میرے ڈسچارج کی اطلاع آ گئی۔

ہسپتال کے ساتھیوں نے مجھے الوداعی پارٹی دینے کے لیے کوپن جمع کیے۔ مَیں نے اپنی ضیافت کے لیے چندہ دینا چاہا تو پتہ چلا کہ کیمپ نمبر ۴۴ کا سکہ یہاں نہیں چلتا۔ بہرحال ایک ایک روپیہ فی کس کے حساب سے اتنی رقم جمع ہو گئی کہ مجھے باعزت طور پر رخصت کیا جا

سکے۔

بھارتی جے، سی، او کو رشوت دی گئی کہ وہ راشن کے ساتھ ہمیں گاجر، چینی اور دودھ لا دے۔ اس نے منہ مانگی رشوت اور منہ مانگے دام لے کر یہ چیزیں مہیا کر دیں۔ اب گاجر کا حلوہ پکانے کے لیے کئی افسروں نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں۔ میجر قریشی نے کہا کہ "میں اپنے قیامِ امریکہ کے دوران میں کئی ڈشز (DISHES) پکانے میں دسترس حاصل کر چکا ہوں، لہٰذا حلوہ میں پکاؤں گا۔" باقی حریف امریکہ کا نام سنتے ہی مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ لیکن افسوس کہ یہاں امریکی طرز کا کچن تھا، نہ گیس کا چولہا، لے دے کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی جو ہر وقت دھوئیں سے اَٹی رہتی تھی اور اس میں صرف چولہے سے نکلتا ہوا شعلہ ہی نظر آ سکتا تھا۔ مگر میجر قریشی ناسازگار حالات سے ذرا بھی نہ گھبرائے اور اپنی بُش شرٹ کی آستین چڑھا کر لنگر میں گھُس گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ان کی خبر لینے گئے تو دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ سے آنکھوں سے بہنے والا پانی پونچھ رہے ہیں اور دوسرے سے چمچ چلا چلا کر حلوے کا پانی خشک کر رہے ہیں۔ ہمیں نہایت اعتماد سے کہنے لگے "تم جاؤ، بس دس پندرہ منٹ کی بات ہے۔" ہم باہر آ گئے۔

پندرہ بیس منٹ بعد میجر قریشی آنکھیں پونچھتے ہوئے ایک لانگری کو دیگچہ اُٹھوائے باہر آئے۔ ہم استقبال کے لیے لپکے تو دیکھا کہ حلوے کا قلب و جگر جل گیا ہے اور وہ دیگچے کے سینے سے جُدا ہونے کا نام نہیں لیتا۔ میجر قریشی نے ماہرانہ رائے دی کہ "دراصل دیگچے کا پیندا پتلا تھا۔ بس حلوہ لگ گیا... کوئی بات نہیں پاکستان میں اس سے کہیں بہتر حلوہ پیش کروں گا۔"

واقعی میجر قریشی کا تجزیہ درست تھا کہ ہلکے پھلکے پیندے والے تو ذرا سی آنچ نہیں سہہ سکتے، متواتر آدھ گھنٹہ آگ کیسے برداشت کرتے!

DINE OUT ° کی رسوم صبح سویرے ہی ختم ہو گئیں۔ ہمیں نے اپنا سنگ سنبھالا اور ٹرک، سنگینیں، گارد، ہتھکڑی اور آنکھوں کی پٹی کے آزمودہ لوازمات

° الوداعی ضیافت

سمیت سنٹرل جیل آگرہ روانہ ہوگیا۔

پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

○○

اسیری کا دوسرا سال

ہسپتال میں چند ہفتے گزار کر دوبارہ جیل میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ کسی دیارِ غیر میں بے وجہ خاک چھان کر اپنے گھر واپس آگیا ہوں۔ وہی مانوس سا ماحول، وہی دار و رسن، وہی خارِ مغیلاں جو میرے دمساز بھی تھے اور ہمراز بھی، وہی سنگینیں اور پہرہ دار جو مرے قاتل بھی تھے اور دلدار بھی۔ اور وہی کرنل اپادھیا جو گاہے مہربان تھا گاہے نامہربان۔ اس کے علاوہ بھلا میں ان اونچی اونچی فصیلوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا جو مجھے دنیا کے لہو و لعب سے الگ رہ کر ہمیشہ بلند سے بلند تر دیکھنے پر مجبور کرتی تھیں — ! اور بلند بینی تو بلند کرداری کا پہلا زینہ ہے!

جیل کے دو تین پھاٹک گزر کر جب میں دارالعوام جاتے ہوئے ڈسپنسری کے پاس سے گزرا تو بھارتی میجر ملک اور پاکستانی سرجن میجر بشیر باہر کھڑے تھے۔ بشیر صاحب نے میری آنکھ کی مزاج پرسی کی اور میجر ملک نے میری۔ میجر ملک کو چڑ تھی کہ میں اس کو چکمہ دے کر ہسپتال چلا گیا۔ کہنے لگا "آخر تم ہو آئے نا ہسپتال۔" میں نے کہا "جی ہاں، سالانہ تفریحی چھٹی کا حق بنتا تھا، سوچا، ذرا سیر و تماشا ہو جائے۔" خلافِ توقع وہ طنز کا نشتر سہہ گیا اور اس نے ناراض ہو کر مجھے سیل میں نہ بھجوایا۔ شاید ایک انسان دوست شخص کی موجودگی میں وہ بھی ذرا انسانیت کے قریب آگیا تھا یا اس نے آج کم پی تھی اور نشے میں دُھت آمرانہ احکام صادر نہیں کر رہا تھا۔

میں اپنی بیرک میں پہنچا تو سب خوشی خوشی میرے گرد یوں جمع ہو گئے جیسے میں ولائت کی سیاحت سے واپس آیا ہوں اور ابھی وہاں کے حقائق و تحائف انہیں پیش کروں گا۔ میرا دامن تہی ہونے کے باوجود وہ میرے پاس بیٹھے سوال پہ سوال پوچھتے رہے۔ "یہاں سے کیسے گئے؟

کہاں کہاں گئے؟ کدھر رہے؟ کیسے رہے؟ کون کون ملا؟ ہسپتال کی کیا خبریں ہیں؟ کیا اُدھر فرار ہونے کے مواقع بہتر ہیں؟"

مَیں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لیے ان سوالوں کے جواب تو دیتا رہا، لیکن میرے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش کلبلا رہی تھی کہ میں جلد سے جلد بھارتی چیتھڑے اُتار کر وہ نئے کپڑے پہنوں جو میرے ہسپتال جانے سے پہلے (۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء کو) پاکستان سے آئے تھے اور میں نے دوسرے ساتھیوں کی طرح انہیں بقر عید (۱۶ جنوری ۱۹۷۳ء) کے موقع کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ ایک سال سرکاری وردی میں دن رات بسر کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا اور اب جسم کی نس نس التجا کر رہی تھی کہ اے قفسِ عنصری کے مالک! کبھی ہمیں بھی اس شکنجے سے نجات دلا۔ میں نے فوراً خاکی پتلون اور ملیشیا کی قمیص اتار کر پرے پھینکی اور سفید شلوار، سفید بنیان اور سفید کرتے پر فاختائی جرسی اور اس کے ہم رنگ مفلر اور جراب پہنے۔ ان نئے کپڑوں پر پہلے میں نے نگاہِ الفت پھیری، پھر دستِ شفقت۔ پھر بھی تسلّی نہ ہوئی تو انہیں آنکھوں سے لگایا۔ یوں محسوس ہوا کہ پاکستانی کپڑے نہیں پہنے، پاکستان سے بغل گیر ہو گیا ہوں۔ ذرا شیشہ تو دیکھوں کہ نئے روپ میں کیسا جچتا ہوں!

ہائیں! مَیں تو اچھا بھلا معزّز شہری دکھائی دیتا ہوں۔ انسان کے حُلیے سے کپڑوں کا کتنا گہرا تعلّق ہے — میرے معزّز ہونے پر حرف پی۔ ڈبلیو (PXW) کے داغ ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ یہاں اس چھاپ کے بغیر کوئی کپڑا قابلِ استعمال نہیں سمجھا جاتا جیسے سرکاری مہر کے بغیر کوئی سکّہ رائج نہیں ہو سکتا۔

احباب نے کپڑوں کی داد اور مجھے مبارکباد دی۔ پہننے والے کو چاہا، بھیجنے والے کے انتخاب کو سراہا۔ بعض نے اس جشنِ جامہ پوشی کو روزِ عید سمجھ کر گلے لگا لیا — کپڑوں میں کتنی کشش ہوتی ہے!

آرائشِ جمال سے فارغ ہوا تو مَیں نے دارالعوام کا جائزہ لیا کہ میری غیر حاضری میں اس خانۂ ویراں کی ویرانی میں کیا تغیّرات آئے ہیں۔ بظاہر کوئی فرق نہ تھا۔ وہی تاش اور

شطرنج بازی، وہی کُتب بینی و بخیہ گری، بلکہ چند اور مشاغل بھی ایجاد ہو چکے تھے۔

میجر راٹھور نے پرندے پکڑنے کے لیے دام بچھا رکھا تھا۔ وہ اس کے دھاگے کا سرا پکڑے اپنے ساتھیوں سمیت گھات میں بیٹھے تھے۔ جب فاختہ، کوّا یا طوطا دانے چُگتا ہوا دام کی طرف قدم بڑھاتا تو شکاری اُٹھ کر پنجوں کے بل ہو جاتے۔ ایک کہتا "کھینچ دھاگہ، شکار پھنسا کہ پھنسا!" دوسرا ضبط کا درس دیتے ہوئے کہتا "نہیں، ابھی نہیں۔ ۔ ۔ ابھی کوّے کی گردن باہر ہے۔" چند لمحے یہ مشق جاری رہتی۔ آخر اس گھات پارٹی کا سرپنچ اچانک فیصلہ دیتا۔ "کھینچ دھاگہ"! ۔ اور دھاگہ کھینچتے ہی ہوشیار کوّا اُڑ جاتا اور بے ضرر فاختہ گرفتار بلا ہو جاتی۔ گھات میں بیٹھی ساری ٹولی دوڑ کر دام کے پاس پہنچتی اور اپنی کامیابی پر خوشی مناتی۔

میں حیران تھا کہ اسیرانِ دام دوسروں کو تہِ دام لانے کے لیے کیوں کوشاں ہیں۔ پتہ چلا کہ وہ ان پرندوں سے پیغام رسانی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ کوئی رقعہ یا خط لکھ کر فاختہ، کوّے، کبوتر یا طوطے کے پنجے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اور پھر اسے شہر کی طرف پرواز کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ پیغام میں اسیروں کی طرف سے آگرہ کے مسلمانوں کے لیے نیک تمناؤں اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔

کیپٹن جمشید نے میجر راٹھور کی نسبت پیغام رسانی کا انوکھا اور سہل طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ لنگر سے چھیچھڑے لے کر ان کے ساتھ کوئی پیغام نتھی کر کے صحن میں پھینک دیتے۔ جونہی کوئی کوّا یا چیل جھپٹ کر اسے اُٹھاتی وہ اسے ڈرا دھمکا کر جیل کی حدود سے باہر پرواز کر جانے پر مجبور کر دیتے اور یوں یہ پرندہ چھیچھڑے کے لالچ میں پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتا۔

لیفٹیننٹ فرخ اور سیکنڈ لیفٹیننٹ نعیم نے اخباری کاغذ لئی سے جوڑ کر پتنگ بنائی تھی۔ وہ اس پر "میڈ اِن آگرہ جیل" (MADE IN AGRA JAIL) لکھتے۔ اس کے ساتھ کوئی سندیسہ منسلک کرتے اور ہوا میں اُڑا دیتے۔ پتنگ ہوا کے سمندر میں تیرتی کہیں کی کہیں جا پہنچتی خیال تھا کہ یہ پیغامات اہلِ آگرہ کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوں گے۔

یہ مشاغل بظاہر لایعنی نظر آتے، لیکن درحقیقت ایک گہری ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے تھے۔ یہ بیرونی دنیا سے رابطے کی دبی دبی (ادبی) خواہش کا لاشعوری اظہار تھا۔ جب پرواز خواب ہو گئی ہو اور بال و پر خیال تو لاشعور ذہنی فرار کی نئی راہیں تلاش کر لیتا ہے۔

فرار کی یہ لاشعوری خواہش درحقیقت ان پابندیوں کا ردِ عمل تھا جو گزشتہ ایک سال میں سخت سے سخت تر ہو گئی تھیں۔ کیمپ کے حفاظتی اقدامات کی اپنی گھٹن تو قابلِ فہم تھی، لیکن ادائے ستم کے جو نئے تیور روز دیکھنے میں آئے، ان کا مقصد ہماری قوتِ برداشت کے امتحان کے سوا کچھ نہ تھا۔ مثلاً ہر ہفتے بیرک کی تلاشی ہوتی، ایک ایک چیز کھنگالی جاتی۔ پانی کے مٹکے اور پوڈر کے ڈبے تک خالی کر دیے جاتے۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر نظر آ جاتی تو بحق سرکار ضبط کر لی جاتی۔ پی ڈبلیو کی چھاپ کے بغیر کوئی چیتھڑا مل جاتا تو فوراً قرق کر لیا جاتا۔

"پی، ڈبلیو" کی چھاپ کے متعلق سختیاں اس حد تک بڑھیں کہ تمام چھوٹی موٹی اشیاء پر یہ چھاپ لگا دی گئی۔ کیا کمبل، کیا دری، کیا جرسی، کیا بنیان، کیا ٹوپی، کیا رومال — ہر شئے "پی، ڈبلیو" کی زد میں آ گئی۔ اس سے تنگ آ کر بعض اہلِ جنوں نے سرکاری وردی پر آگے پیچھے جلی حروف میں "یرغمال" اور باقی سارے حصّوں پر "پی ڈبلیو" لکھ دیا۔ یہاں تک کہ ایک روز ایک سفید بلّی اپنے تین کم سن بچّوں سمیت تلاشِ معاش میں جیل آ پہنچی تو یاروں نے اس سفید پوش کنبے پر بھی "پی، ڈبلیو" کا ٹھپّہ لگا دیا — لیکن احتجاج کے یہ نرم و نازک انداز بھارت کے مردِ ناداں (زنِ ناداں بھی شامل سمجھئے) پر بے اثر ثابت ہوئے۔

آپ اسے مبالغہ سمجھیں گے، لیکن ہے یہ حقیقت کہ کھل کر ہنسنے، رونے یا گانے پر بھی پابندی تھی۔ نالہ ہائے سحر گاہی کی تاثیر کے متعلق تو کہا جا سکتا تھا کہ "انہیں ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ۔" لیکن کھل کر ہنسنے یا گانے پر پابندی سمجھ میں نہ آئی۔ شاید اس پابندی کی وجہ یہ ہو کہ تنگ دل شخص جس چیز سے خود محروم ہو، اس سے دوسروں کو لطف اندوز ہوتے نہیں دیکھ سکتا — یا وہ ہماری زندگی سے مسکراہٹوں اور قہقہوں کے چراغ ہمیشہ کے لیے گل کرنے

کے درپے تھا۔

ایسی ہی نت نئی پابندیوں نے اکثر احباب کی زندہ دلی کو متاثر کر دیا تھا۔ ان کے زقندیں بھرتے قہقہے اب سکوت و حسرت کے پنجروں میں بند ہو گئے تھے۔ ان کی خوش دلی، خوش مذاقی اور خوش کلامی پر اوس پڑ چکی تھی۔

اب پاکستان کے تازہ کپڑوں اور خشک میووں کے پیکٹ آتے تو ہر کوئی انہیں ایک بچھڑے ہوئے غم کی طرح سینے سے لگا لیتا۔ کوئی شور و غل مچاتا نہ کوئی ہنگامہ برپا کرتا۔ اسی طرح جب ہفتوں خط نہ آتے تو کوئی نالہ و شیون، کوئی فریاد یا احتجاج سکوتِ قید خانہ کی دھجیاں نہ اُڑاتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ ہر کوئی اب بے نیازِ بہار و خزاں دن کاٹنے کو تیار ہے۔

پچھلے سال جو لوگ نعرہ بازی اور قہقہہ زنی کے طفیل کیمپ میں نام پیدا کر چکے تھے۔ انہیں میں نے گدگدی کی تو وہ کہنے لگے "پچھلے سال کی بات پچھلے سال کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب لوگوں کی قوتِ برداشت پہلے کی سی نہیں۔ اب طبیعت میں اضطرار، گھٹن اور چڑچڑا پن پیدا ہو چلا ہے۔ اب کسی سے مذاق کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے پتہ نہیں وہ خلعت دے گا یا دشنام۔"

ان کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ اسیری نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مَیں نے جس کسی سے پوچھا "یار تم سے کیوں گئے ہو؟ کیا اسیری کا بوجھ بھاری لگ رہا ہے؟" تو وہ سینہ تان کر جواب دیتا "نہیں، ایسی بات تو نہیں، مَیں تو بالکل پچھلے سال کی طرح ہوں..... مَیں قومی مفاد کی قربانی دے کر رہا نہیں ہونا چاہتا... بالکل... بالکل وہ جتنا عرصہ چاہیں رکھ لیں، کیا فرق پڑتا ہے...!"

سوزِ دروں سے جل بجھوں لیکن دھواں نہ ہو
ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پہ فغاں نہ ہو

یہ جذبۂ حبِ وطن کا کرشمہ تھا کہ یاس و اضطرار کی سنگلاخ زمین سے بھی صبر و استقلال کے چشمے اُبلتے تھے، ورنہ یہ اٹل حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ اسیری نے اب کئی چہروں کی لَو مدھم

کردی تھی اور بزمِ چراغاں کے کئی طاق ویراں ہو گئے تھے۔ بزم آرائی کے شوقین اب گوشۂ تنہائی تلاش کرنے لگے۔ ہر کوئی "میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولائت ہوں" کی تصویر بنا کبھی درخت کے نیچے، کبھی غسلخانے کے پیچھے، کبھی لنگر کی اوٹ میں، کبھی مسجد کی محراب میں پناہ ڈھونڈتا پھرتا اور جب کوئی کُنجِ تنہائی نہ ملتا تو گلہ کرتا۔

نہیں اس "کُھلی" فضا میں کوئی گوشۂ فراغت

اس جمود اور سناٹے کو توڑنے کے لیے پچھلے سال کی طرح ہم نے اس بار بھی محفلِ موسیقی ترتیب دی جس میں سبھی شریک ہوئے۔ مٹکے کا ڈھول اور بالٹی کا طبلہ بھی بنا۔ پلیٹ سے پلیٹ بھی ٹکرائی اور چمچ نے مضراب کا کام بھی کیا۔ لیکن ہر ساز سے جو راگ اٹھا وہ راگ کم اور دُکھتے ہوئے دل کی دہائی زیادہ معلوم ہوا۔ مغنّی نے سُر اُٹھائی تو ئے نالے میں بدل گئی۔ آخر محفلِ موسیقی محفلِ نوحہ خوانی میں ڈوب کر دم توڑ گئی اور لوگ پھر تنہائیوں کے غار میں کھو گئے۔

زندگی کیا ہے، جشنِ تنہائی

خود ہی رونا ہے، خود ہی گانا ہے!

بظاہر اب بھی گزشتہ سال والے مشاغل — تاش، شطرنج، مطالعہ، سلائی وغیرہ — جاری تھے، لیکن ان پیکروں کی روح بدل چکی تھی۔ مثلاً اب مطالعے کے بعد تبادلۂ خیالات سے استفادے کی بجائے بحث و تمحیص کی صورت پیدا ہو جاتی۔ مذہبی کتابوں کا ایک کیڑا کہتا... "یہاں ہمارا قیام اختیاری نہیں، اس لیے ہم پر قصر واجب ہے، چنانچہ ہمیں نہ پوری نماز پڑھنی چاہیے، نہ جمعہ نہ تراویح۔" دوسرا کہتا "مذہبی احکام کی یہ سراسر غلط توضیح ہے۔ جب ہمیں پتہ ہے کہ یہاں ہمارا قیام دو ہفتے سے زیادہ ہے تو ہم سفر کی حالت میں کیسے ہوئے؟ یقیناً ہمیں پوری نماز پڑھنی چاہیے۔" پہلا قیدی اپنے موقف کی سرِعام تردید سے چڑ کر کہتا "آپ کو مذہب کا کیا پتہ! یہاں آ کر ایک تفسیر اور ایک سیرت پڑھ لی اور چلے فتویٰ دینے۔" دوسرا جوابی حملہ کرتا "میں نے آپ سے زیادہ مذہبی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور وہ بھی جیل میں آ کر نہیں، سکول میں، کالج میں، گھر پر..." یہ بحث

یونہی جاری رہتی۔

اسی طرح ملٹری ہسٹری کے طالب علم آپس میں اُلجھ جاتے۔ ایک کہتا "ہٹلر کو انگلینڈ پر حملہ کرنے سے پہلے اپنا رائٹ فلینک (RIGHT FLANK) ○ محفوظ کر لینا چاہیے تھا"۔ دوسرا کہتا "ہٹلر کی سٹریٹیجی (STRATEGY) درست تھی۔ وہ اگر انگلستان فتح کرنے پر اپنے وسائل خرچ کر ڈالتا تو روس اسے تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کر ڈالتا"۔ پہلا پھر پینترا بدل کر وار کرتا "آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ ایف سی فلر (MAJ. GEN. F. C. FULLER) کی ایک کتاب پڑھ کر اپنے آپ کو جنگِ عظیم پر اتھارٹی سمجھنے لگے ہیں ۔۔۔" دوسرا بات کاٹ کر جوابی وار کرتا "فلر کی کتاب پر اکتفا کرنے والے آپ ہیں۔ میں نے لڈل ہارٹ (LIDDEL HART) کی تمام کتابوں کے علاوہ ونسٹن چرچل کا پورا سیٹ پڑھا ہے۔۔۔" "ٹھیک ہے، لیکن آپ نے چیسٹر ولماٹ (CHESTER WILMOT) کی کتاب سٹرگل فار یورپ (STRUGGLE FOR EUROPE) نہیں پڑھی اور اس کتاب کے بغیر یورپ میں جنگِ عظیم کے سیاسی پہلو سمجھ میں نہیں آسکتے"۔ یہ بحث بھی اپنی جگہ لمحہ بہ لمحہ جوان ہوتی جاتی۔

ادھر برج کے پارٹنر ہارنے کے بعد ایک دوسرے پر غلط کھیل کا الزام دھرتے۔ ایک کہتا آپ نے تھری نو ٹرمپ (THREE NO TRUMP) کی کال کیوں دی۔ دوسرا کہتا میرا ہینڈ (HAND) اتنا سٹرانگ (STRONG) تھا کہ یہ تو بنتی ہی تھیں، لیکن آپ نے پہلی کال دے کر غلط انڈی کیشن (INDICATION) ● دی تھی۔ جب یہ بحث طول کھینچتی تو ایک پارٹنر دری پر پتے پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور یہ فیصلہ دے کر چل دیتا "ایسی برج کھیلنے کا کوئی لطف نہیں!"

اسیری کے یہ تیور کتب بینی یا تاش بازی کے شائقین تک محدود نہ تھے، بلکہ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر تھا۔ سخن طرازی میں دسترس رکھنے والوں کی باتوں میں بھی وہ لگن،

○ دایاں پہلو ● اشارہ

وہ ربط، وہ رچاؤ اور وہ لبھاؤ نہ رہا تھا جو پہلے سامعین کو پہروں مسحور رکھتا تھا۔ اب دورانِ گفتگو ایک بات کی کڑی دوسری سے جا اُلجھتی، دوسری کی تیسری اور تیسری کی چوتھی سے، حتیٰ کہ کسی بات کا سر پیر تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ ایک نمونہ آپ بھی چکھیے۔

"اچھا پارٹنر! آج کل تم خوب پی ٹی کر رہے ہو، یہ صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ وہ دیکھو واچ ٹاور (WATCH TOWER) پر کھڑا اسنتری رفیع کے گانے کا کیا حشر کر رہا ہے! ہاں یہ بتاؤ کہ گھر سے کوئی خط وط آیا ہے؟ خیریت ہے نا؟ اوئے مجید! دیکھو، نلکہ میں پانی آ رہا ہے یا نہیں۔ تو پارٹنر تم نے قید کا خوب فائدہ اٹھایا، خوب کتابیں پڑھیں۔ دیکھو اسحاق، مٹکے میں اگر پانی ہے تو ایک گلاس پانی پلاؤ۔ پارٹنر بھارت بھی عجیب و غریب ملک ہے اور ہاں وہ ریڈ کراس والا کہہ رہا تھا۔۔۔"

ایک ہم قفس کی بے ربط باتیں سُن لینا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں، ابھی کچھ لوگ باقی تھے جو ایسی باتیں توجہ سے سنتے اور اگر موقع ملتا تو بات کا جواب بھی توجہ سے دیتے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی طبیعت کے تار بھی اتنے حسّاس ہو گئے کہ ذرا سی بادِ مخالف مضراب کی طرح ان سے چھوتی تو فتنے جاگ اُٹھتے۔ مثلاً ایک صاحب نہانے کے لیے ظہر سے مغرب تک کیو (Q) میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ اسی دوران میں ایک شخص تین دفعہ وضو کر کے چلا گیا تو زحمتِ انتظار اور نایابیٔ آب کا ستایا ہوا یہ قیدی نمازی پر برس پڑا "کیا یار! تم ہر وقت وضو ہی کرتے رہتے ہو؟ تمہیں کوئی اور کام نہیں؟" اسی طرح ایک صاحب صبح سے بیت الخلا تک رسائی پانے کے منتظر تھے۔ ہر آنے والا صبح دم انہیں سلام کہہ کر گزر جاتا۔ دس پندرہ سلام تو موصوف نے بخیر و خوبی سہے، لیکن جب بیسواں پچیسواں سلام آیا اور ادھر کیو (Q) کے طول میں کوئی فرق نہ آیا تو وہ چڑ کر کہنے لگے "تمہیں صبح صبح سلام دینے کو اور کوئی نہیں ملا۔ بس جو آتا ہے السلام علیکم۔ السلام علیکم، گویا میں یہاں سلام لینے ہی کھڑا ہوں۔ اونہہ۔"

ہر کسی سے الجھاؤ کی اس وبا سے وہ صاحب بھی محفوظ نہ رہ سکے جو کلکتے میں انسانوں

کی قلت کے پیشِ نظر گدھے کے بچّے کی ہم نشینی قبول کرنے کو تیار تھے۔ اب وہ انسانوں کے ہجوم ہی میں نہیں، اپنے ہم وطنوں کے قرب میں تھے۔ لیکن بات بات پر چڑ جاتے، بیزاری کا اظہار کرتے یا تلخ کلامی پر اُتر آتے۔ ایک دن میں نے انہیں ناصحانہ انداز میں کہا کہ "ان ہم وطنوں اور ہم قفسوں کو غنیمت جانو۔ اگر ان سب کو جیل بدر کر کے مجھے یا آپ کو یہاں تنہا چھوڑ دیا جائے تو جیل کی دیواریں ہمیں نگل جانے کو دوڑیں گی۔" کہنے لگے "میں سمجھتا ہوں، لیکن کیا کروں؟ بعض اوقات طبیعت پر قابو نہیں رہتا۔ اب انشاء اللہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

اس نفسیاتی کیفیت کا ایک ضمنی پہلو یہ بھی تھا کہ لوگوں میں احساسِ ملکیت خطرناک حد تک تیز ہو گیا۔ کسی نے کسی کی چارپائی دو چار انچ اِدھر اُدھر سرکا دی، کسی کی پلیٹ یا مگ استعمال کر لیا یا شیونگ کریم یا ٹوتھ پیسٹ کو چھو لیا تو متاثرہ پارٹی یوں جز بز ہوتی گویا اس کی کسی چیز پر نہیں، بلکہ عزّتِ نفس پر ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ ایسی باتوں سے کئی بار مراسم میں خلا بھی پیدا ہو جاتا، لیکن ایک آدھ دن کھچے کھچے رہنے کے بعد پھر باہم شیر و شکر ہو جاتے۔

ایک سال پہلے یہی ساتھی اپنی چارپائی ایک طرف کھینچ کر دوسرے کے لیے جگہ بنا دیتے، اپنے پاس دو کمبل ہوتے تو ایک کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ گنی چُنی چپاتیاں ملتیں تو آدھی آدھی بانٹ لیتے۔ ایک سال بعد یہی اشرف المخلوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُتر آیا تھا۔ شاید خوش و زشت، خوب و بد اور اعلیٰ و ادنیٰ صفات کے امتزاج کا نام ہی انسان ہے اور حالات کے مطابق کبھی اس کے اعلیٰ پہلو اُبھر آتے ہیں اور کبھی ادنیٰ۔

اسیری کے دو سالوں میں انسانی کردار کے سارے پہلو کھل کر سامنے آ گئے، کیونکہ قید سب حجاب مٹا دیتی ہے اور ہر شخص ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے آ جاتا ہے۔ گرد پوش سے معرّا اس کتاب کا ایک ایک باب بول اُٹھتا ہے، ایک ایک لفظ حدیثِ دل بیان کرنے لگتا ہے، صرف سکوتِ لالہ و گل پہ کان دھرنے کی ضرورت ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے اختلافات، ننھی ننھی رنجشوں اور بے ضرر کدورتوں کے شعلوں میں میں

شمعِ محفل کی طرح "سب سے جُدا، سب کا رفیق" بنا بصیرت لیتا رہا، لیکن ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا مشکل تھا۔ بحث و تمحیص کا کوئی نہ کوئی ریلا مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور متعلقہ پارٹیاں زیرِ بحث قرارداد پر مجھے بھی اظہارِ خیال کے لیے مجبور کرتیں، مثلاً وہ مجھے گھیر کر کہتے "آپ کو بتانا پڑے گا کہ غالب بڑا شاعر تھا یا اقبال؟ کیمپ میں پانی کی کمی حقیقی ہے یا مصنوعی؟ روس زیادہ طاقت ور ہے یا امریکہ؟ آٹا خالص اشو (ISSUE) ہوتا ہے یا چوہنے والا؟ مشرقی پاکستان میں دفاعی لائن بارڈر پر ہونی چاہیے تھی یا دریاؤں کے کنارے پر" مجھے معلوم تھا کہ جس سے اختلاف کیا، وہ بحث کے بھنور میں مجھے بھی غوطے دینے لگے گا، اس لیے میں نے ہر استفسار کا دو لفظی جواب ایجاد کیا "I AGREE" یعنی مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ متحارب گروہوں میں سے جو بھی پوچھتا، مَیں عرض کرتا "I AGREE" دو تین بار کی تکرار کے بعد وہ سمجھ جاتے کہ میں اپنا دامن خشک رکھنا چاہتا ہوں۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ متنازعہ مسئلے کے دونوں پہلو پیش ہونے سے پہلے ہی کوئی صاحب میری طرف سے کہہ دیتے "I AGREE" اور بلا ٹل جاتی۔ یہ نسخہ خاصا کامیاب رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے لوگوں نے بھی اسے اپنا لیا۔ وہ بھی ہر استفسار کے جواب میں "I AGREE" کہنے لگے۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضِ گلشن میں وہی طرزِ فغاں ٹھہری ہے

اس جذباتی گھٹن اور نفسیاتی کھچاؤ کا عکس نجی خطوں میں بھی نظر آنے لگا۔ اب خط عموماً بلند بانگ نعروں یا عالمانہ پند و نصائح سے عاری ہوتے اور ان میں اک جمود، ایک جکڑاؤ کا پَر تو نظر آتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ طائر نے کُنجِ قفس سے سمجھوتہ کر لیا ہے؛ اب اسے اپنی بے پروبالی کا یقین آ گیا ہے۔ اب وہ پَر اُگنے یا نہ اُگنے سے بے نیاز ہو چلا ہے۔ میرے خطوں کا مضمون بھی کچھ اس نوعیت کا تھا۔

بس جی رہے ہیں، اتنا غنیمت ہے اے عدمؔ
کس طرح ہو رہی ہے بسر، کچھ نہ پوچھئے

جب بھی خطوں کا یہ مزاج ہو اور احباب بارِ سفر بانٹنے کو تیار نہ ہوں، تو دن کٹیں تو کیونکر؟ گھٹن کی گرفت ڈھیلی ہو تو کس طور؟ ایسے میں تنہائی ہی مونس و ہمدرد بن کر ساتھ دیتی ہے۔ میری بھی اب یہ کیفیت ہو گئی کہ محفلِ احباب سے کٹ کر کر مکِ شب کور کی طرح کسی تاریک گوشے میں چھپ کر یہ نظم گنگنانے لگتا

رنگینیٔ دنیا سے
مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہوا دل لے کر
تنہائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے چھپا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا

راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبُور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا

اشعار کے زیر و بم کو اشکوں کی بارش سے ہم آہنگ کرنے سے بے شک غبارِ دل ہلکا ہو جاتا، لیکن بعض اوقات کوئی پارۂ دل کانچ کے ٹکڑوں کی طرح پلکوں میں اٹک جاتا اور درد آشوب کی طرح ساری رات سونے نہ دیتا۔

اس اضطراری کیفیت میں ایک بار پھر مَیں نے مذہب میں پناہ ڈھونڈ لی۔ مَیں رات کی خاموش تاریکی میں لمبا لمبا قیام کرتا، گہرے گہرے سجدے دیتا، اونچی اونچی دعائیں مانگتا۔ کبھی سجدے میں گر کر مانگتا، کبھی ہاتھوں کا کاسۂ گدائی بنا کر مانگتا، کبھی دستِ سوال ہوا میں پھیلا کر مانگتا۔ مانگتے مانگتے کبھی سر گریباں کی طرف جھک جاتا اور کبھی منہ آسمان کی طرف اُٹھ جاتا۔

بعض اوقات اپنی دعاؤں کی نارسائی کا الزام اپنے بارِ عصیاں کو دیتا اور کبھی بابِ قبول بند ہونے کی شکایت کرتا، کبھی اپنی خامکاری کو موردِ الزام ٹھہراتا اور کبھی "بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم"، کا گستاخانہ گلہ کرتا۔ اس عبادت کا روحانی پہلو کچھ بھی ہو، نفسیاتی طور پر یہ کاروبار بہت مفید ثابت ہوتا، وسوسوں کے بادل چھٹ جاتے اور زندگی کے پہیّے کو دھکّا دینے کا ایک نیا عزم پیدا ہو جاتا۔

مذہب کے علاوہ صبر و سکون کا ایک سرچشمہ یہ حسین تصوّر تھا کہ ایک نہ ایک دن ہم ضرور ارضِ پاکستان پر قدم رکھیں گے، جہاں وطن کا ہر فرد، ہر شجر، ہر قریہ اور قریے کا ہر ذرّہ ہمیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ مجھے اس منجدھار میں اکثر سوہنی کی مثال یاد آتی جو دریائے چناب کی بپھری ہوئی لہروں سے صرف اس لیے نبرد آزما رہتی کہ دریا کے اس پار اس کا مہینوال اس کا منتظر ہو گا۔ گویا جو چیز اسے ڈوبنے سے بچائے رکھتی تھی وہ گھڑا نہیں، بلکہ مہینوال کا تصوّر اور جذبۂ وصل تھا۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ سرحد کے اس پار ایک مہینوال نہیں، بلکہ ہزاروں، لاکھوں عُشّاق منتظرِ راہ ہوں گے۔ ان سے وصل کی گھڑی آئے گی اور ضرور آئے گی۔

مَیں نے انہی خوابوں کی اوٹ میں چراغِ امید کو اسیری کی تند و تیز ہواؤں سے بچائے رکھا اور آخری وقت تک اس کی لو مدّھم نہ ہونے دی۔

○○

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

جب چراغِ امید کا واحد روغن یہ خوش فہمی ہو کہ جلد یا بدیر پاکستان پہنچیں گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا، تو ایسے میں وطن کی سالمیت پر ہلکا سا سایہ بھی سوہانِ روح ہوتا ہے یعنی منجدھار میں جس ساحل کا تصوّر ہی باعثِ تقویت ہو اس کے ڈوبنے کی جھوٹی یا سچی خبر باعثِ تشویش ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں ایک غیر ملکی سفارتخانے سے جب بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد ہونے کی خبر ملی تو قدرتی طور پر ایک دھچکا سا لگا اور تشویش ہوئی کہ اگر بروقت اس کا سراغ نہ ملتا تو نجانے یہ آتشیں مادہ کتنے خرمن بھسم کر دیتا۔ اس اندیشے کے ساتھ ساتھ حکومت کی بیداری اور ہوشیاری کی بھی داد دینے کو جی چاہا کہ اس نے عین وقت پر ہاتھ ڈالا اور شعلے بھڑکنے سے پہلے ہی صورتِ حال پر قابو پا لیا۔

اسی طرح اگر کسی پاکستانی لیڈر کے کسی بیان سے پاکستان دشمنی کی بُو آتی تو خون کھولنے لگتا۔ جی چاہتا کہ اس ناشکرے انسان کا گریبان پکڑ کر بھرے بازار میں اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا جائے کہ ارضِ پاکستان کے فرزند! کیا تجھے آزادی کی قدر نہیں ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ ٹکڑا بھی ہم سے چھن گیا تو ہمیں نہ زمین جگہ دے گی نہ آسمان، کیونکہ ناشکری اور نااہل قومیں تائیدِ ایزدی کی مستحق نہیں ہوتیں۔ اے میکدے کے میگسارو!

مے کی تعظیم کرو، شیشے کا اکرام کرو

یہ ردِعمل سراسر جذباتی اور لااُبالی سہی، لیکن یہ حقیقت تھی کہ ہماری کیفیت وہی تھی کہ

دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوئے چمن

جب بھی قفس سے صبا بیقرار گزرتی، ہم سوچ میں پڑ جاتے کہ بجانے چمن پر غارتِ گلچیں سے کیا گزری۔ اسیری میں تو مُٹھی بھر چاندنی اور چُلّو بھر دھوپ کی بھی قدر ہوتی ہے۔ وطن کی آزادی تو بڑی چیز ہے۔

ہماری یہ تشویش سیاسی مدوجزر تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر وہ واقعہ، ہر وہ سانحہ جو پاکستان کی بقا یا وقار پر اثر انداز ہوسکتا تھا، ہماری توجّہ کا مرکز بن جاتا۔ ادھر پاکستان کے کسی بھی شعبۂ زندگی کو زک پہنچنے کا خدشہ ہوتا تو ہمارے دلوں سے درد کی صدائیں اُٹھنے لگتیں۔

توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بُلبُل

مثلاً غیر ملکی تحائف میں جب ہمیں امریکی ہفت روزہ نیوز ویک (NEWSWEEK) ملا تو ہم نے زرِ مبادلہ کے نرخ دیکھ کر پاکستان کی مالی صحت کا اندازہ لگایا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستانی روپے کی بین الاقوامی وقعت ۱۰،۵۰ روپے فی ڈالر تھی۔ فروری ۱۹۷۲ء میں ۱۲،۶۰ روپے فی ڈالر ہو گئی، تو فکر ہوئی کہ بیماری زوروں پر ہے، لیکن اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ۹،۸۰ روپے ایک ڈالر کی ہمسری کرنے لگے تو خوشی ہوئی کہ واہ واہ نحیف و نزار جسم میں اتنی توانائی آگئی۔ سوچا کہ اگر صحت یابی کی رفتار یہی رہی تو یہ مریض کچھ عرصے میں پہلوان بن جائے گا۔

دراصل صحت بھی ہم تقابلی لحاظ سے دیکھتے۔ یعنی اگر اکتوبر میں بھارت کے ۸،۰۸ روپے ایک ڈالر کے برابر ہوتے اور دسمبر میں ۹،۲۰ روپے فی ڈالر تو دل گدگدانے لگتا کہ لو حریف کی بھی صحت خراب ہونے لگی۔ اس کے برعکس اگر بھارتی روپے کی صحت بہتر ہونے لگتی تو خود بخود ہماری صحت خراب ہونے لگتی۔

اسی طرح جب پاکستان میں سیلاب آیا تو ہمارے دل یوں دھڑکنے لگے گویا ہم جیل کی محفوظ چاردیواری میں نہیں بلکہ سیلاب کی زد میں بیٹھے ہیں۔ پاکستان میں ایک گھر بہ جاتا تو ساتھ ہی امیدیں بیٹھ جاتیں۔ کسی ایک گھرانے کا چشم و چراغ بُجھ جاتا تو ہمارا چراغِ دل گُل

ہو جاتا — ایک ایک پُل، ایک ایک سڑک، ایک ایک کھیت اور ایک ایک فیکٹری تباہ ہونے سے یوں صدمہ پہنچتا جیسے ساری عمر کی کمائی پانی میں بہ گئی ہو۔ لیکن ہم سوائے افسوس اور دعا کے کر بھی کیا سکتے تھے! یہی تشویش اور ہمدردی خطوں کے ذریعے پاکستان بھیج دی۔ بعض لوگوں نے ریلیف فنڈ میں چیک بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اپنے بنک کو اس ضمن میں ضروری ہدایات روانہ کر دیں — قیدی سے یہی کیا کم ہے!

بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ کو بھی ہم نے پاکستان کی تندرستی کا امتحان سمجھا۔ اس ٹورنامنٹ کے ایک پُول (POOL) میں بھارتی ٹیم تھی اور دوسرے میں پاکستانی۔ ہم دونوں پُولوں کے تمام میچوں پر رواں تبصرہ سُنتے اور جس میچ میں پاکستانی ٹیم حصّہ لے رہی ہوتی اس پر خاص توجہ دیتے۔ اس کی وجہ یہ خواہش نہ تھی کہ کوئی یورپی، ایشیائی یا افریقی ٹیم نہ جیت جائے، بلکہ فکر اس بات کی تھی کہ پاکستان کسی سے ہار کر بھارت کے خلاف کھیلنے سے نہ رہ جائے؛ چنانچہ ٹورنامنٹ کے دوران پنجگانہ نمازوں میں کبھی اپنی رہائی کی دعا مانگنے میں چُوک ہو گئی ہو تو کہہ نہیں سکتا، لیکن پاکستانی ٹیم کی فتح کے لیے خدا تعالےٰ سے دعا کرنے میں کبھی ناغہ نہ ہوا۔

پتہ نہیں وطن میں ہاکی ٹیم کے لیے کتنے دلوں سے دعائیں نکلتی ہوں گی اور خود ہاکی ٹیم میدان میں کتنا زور لگا رہی ہو گی، لیکن ہم یہ سمجھتے تھے کہ پاکستانی ٹیم جیت رہی ہے تو بس ہماری دعاؤں کے زور پر۔ ہماری دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ پاکستانی ہاکی ٹیم کئی حریفوں کو پچھاڑتی ہوئی بھارتی ٹیم کے مقابل آ گئی۔ ہم سمجھے پاکستان بھارت کے مقابل آ گیا۔ ہم نے وضو کیا۔ فرض نماز ادا کی، پھر نوافل پڑھے۔ پاکستانی ٹیم کے لیے پیشگی دعا کی اور نماز کے بعد دوپلی ٹوپی پہنے تسبیح ہاتھ میں لیے کمنٹری (COMMENTARY) سننے بیٹھ گئے۔

سامعین میں ہمارے بلاک کی ساری مخلوق یعنی بیالیس افسر، لوازدلی، دو باورچی، دو خاکروب، ایک بلّی اور اس کے تین بچے شامل تھے۔ میچ شروع ہوا تو یوں لگا کہ ہاکی کی گیند ہمارے دلوں کے تار سے جُڑی ہوئی ہے۔ جب بھارتی کھلاڑی اسے ضرب (HIT) لگاتا

تو یہ سیدھی ہمارے دل پہ پڑتی اور ہم ریڈیو پہ کان لگا کر سُننے لگتے کہ گیند کہیں ہماری ڈی (D)° میں تو نہیں جا پہنچی۔ اور جب پتہ چلتا کہ ہمارے کھلاڑی نے اسے روک کر بھارتی گول کی طرف دھکیل دیا ہے تو ہم ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر دشمن کی ڈی (D) میں جھانکنے لگتے کہ گول ہوا ہے یا نہیں۔

جب اِدھر گول ہوتا نہ اُدھر، تو ہم آرام سے آلتی پالتی مارے تسبیح پھیرتے میچ کا حال سُننے لگتے۔ پاکستانی کھلاڑی چڑھائی کرتے تو ہم اُٹھ کر گھٹنوں کے بل ہو جاتے اور جب گیند بھارتی گول کے قریب پہنچتی تو ہم پنجوں کے بل تُل جاتے اور جونہی ریڈیو "گو... ل" کا اعلان کرتا ہم تسبیح والا ہاتھ ہوا میں لہرا کر ایک ٹانگ پر ناچنے لگتے۔ یہ رقص ابھی وجدان کی حدوں سے ذرا اِدھر ہوتا کہ گیند کی مزید نقل و حرکت ہمیں تشویش میں ڈال دیتی، گیند بھی ایسی سیمابی کیفیت میں تھی کہ ذرا دم نہ لیتی، تاکہ ہم آرام سے خوش ہو لیں۔ بس خوشی کی ایک کرن جھلملاتی تو دوسری طرف سے بادل اُمڈ آتے۔ خوشی کے لمحات میں ہمارا تسبیح والا ہاتھ ہوا میں لہرا جاتا اور تشویش کے وقت تسبیح کے دانے تیز تیز گرنے لگتے۔

پاکستان اور بھارت کے اس معرکے میں نہ باورچی کو ترکاری پکانے کا ہوش رہا نہ اردلیوں کو پلیٹ دھونے کا، خاکروب نے صفائی میں دلچسپی لی نہ بتّی نے لنگر کا حقّہ لگایا۔ ہم سب جان و دل میچ کی نذر کیے میچ کی کارروائی سنتے رہے ــــ حتیٰ کہ میچ ختم ہوا اور پاکستان نے بھارت پر فتح پا لی۔

"بھارت پر پاکستان کی فتح"۔ پتہ نہیں ان پانچ لفظوں میں کیسی کیسی خوابیدہ خواہشات کی تسکین کا سامان پوشیدہ تھا۔ اس خبر نے ایک عجب نشے اور سرور سے ہمیں ہمکنار کیا۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم سب ریڈیو چھوڑ کر ناچنے لگے۔ باورچی لنگر سے دیگچے لا کر بجانے لگے، اردلیوں نے پلیٹیں کھنکھنانی شروع کر دیں اور افسر بالٹیاں پیٹنے میں مصروف ہو گئے۔

° گول کے قریب نصف دائرہ جس میں گیند کی تھوڑی سی نقل و حرکت سے گول ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

رقاصوں میں کسی کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور کسی کے ہاتھ میں پرچمِ مسرت دعوا نیدھن کے ایک ڈنڈے پر تولیہ لہرا کر بنایا گیا تھا، میں نے بلّی کی طرف دیکھا کہ وہ ہماری خوشی میں شریک ہے یا نہیں۔ وہ سر جھکائے اپنے بچوں کو چاٹ چاٹ کر خاموش رہنے کی تلقین کر رہی تھی — آخر بھارتی بلّی تھی نا، ہماری خوشی میں کیسے شریک ہوتی!

خوشی منانے کا جنون شباب پر تھا کہ صوبیدار میلارام ادھر آنکلا اور یوں سرِ عام اجتماعی جشن منانے کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی ہوتے دیکھ کر بہت سٹپٹایا اور ہمیں یہ شور و غل ختم کرنے کا حکم دینے لگا۔ جونہی اس کے منہ سے بے وقت حکم کے الفاظ نکلے ہم سب یک زبان ہو کر چلّائے "چلے جاؤ یہاں سے! ورنہ آج خون خرابہ ہو جائے گا۔ یہاں سے چلے جاؤ، ہمیں فتح کی خوشی منانے دو، ورنہ۔۔۔" وہ موقعے کی نزاکت بھانپ گیا اور کان لپیٹ کر دیوارِ برلن کے پار چلا گیا۔

خوشی منانے کے بعد نمازِ شکرانہ ادا کی گئی۔ جذبات کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اپنے مشاغل کی طرف لوٹ آئے۔ بقیہ میچوں میں کسی نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ ہاکی کے ایک شوقین نے بعد میں بتایا کہ پاکستان ہار گیا ہے۔ لیکن اس ناکامی کا غم ہماری سابقہ کامیابی کی خوشی کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ بھارت پر فتح پالی، باقی دنیا سے ہمیں کیا سروکار!

یہ تھا پاکستان سے ہمارے جذباتی لگاؤ کا حال جو کبھی سیاسی مدوجزر پر تشویش کی صورت اختیار کرتا، کبھی سیلاب کے دوران دل میں گرہ ڈال دیتا، کبھی پاکستان کی مالی صحت کے بارے میں ہمیں متفکر کر دیتا اور کبھی بھارت پر فتح پانے کی خوشی میں ہمیں نچانے لگتا۔ کیوں نہ ہو مرغِ قفس کی نگاہ آشیانے پر نہ رہے تو کہاں رہے!

اپنے آشیانے کو دوبارہ کب آباد کریں گے، اپنی نگری کے گلی کوچے کب جگمگائیں گے، بچوں کے چہروں کے چراغ کب فروزاں ہوں گے، ہم عروسِ وطن کی مانگ میں کب سیندور بھریں گے۔ یہ ایسے سوال تھے جو ہر کسی کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں چھپے بیٹھے تھے۔ یہ

اور بات تھی کہ کوئی اس کا برملا اظہار کر دیتا اور کوئی اپنی بے نیازی اور استغنا کا بھرم رکھنے کے لیے اس کا ذکر زبان پر نہ آنے دیتا۔

ایک درویش منش قیدی جو شانِ استغنا کے آبگینے کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری گپ باز پارٹی کے پاس سے گزرے۔ ہم میں سے کسی نے انہیں چھیڑنے کے لیے بآوازِ بلند یہ ہوائی چھوڑی کہ "یار سُنا ہے ہماری قسمت کا فیصلہ تو اگلے عام انتخابات کے وقت ہوگا۔" فقیر صورت شخص یہ جملہ سُنتے ہی ہم سے ذرا پرے درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا، دو انگلیوں میں سگرٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا سنبھالا اور باقی انگلیوں پر گنتی کرنے لگا کہ پاکستان میں آئندہ انتخابات کو کتنے سال باقی ہیں۔ پھر وہ کش پر کش لگاتا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "یہ ..... یہ ..... خبر تم نے کہاں سے سُنی؟ کب سُنی؟ کیوں سُنی؟ میرا مطلب ہے ریڈیو کی خبر ہے؟ اخبارات کی؟ یا آکاش وانی کی؟"

ہم نے انہیں ٹالنے کے لیے "یہ خبر" آکاش وانی سے منسوب کر دی تو وہ مطمئن ہو کر چل دیے۔

اسی فرقے کے ایک اور شخص کا طریقِ کار ذرا مختلف تھا۔ وہ بظاہر وطن واپسی کے بارے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے لیکن اندر ہی اندر اس ٹوہ میں لگے رہتے کہ کہیں سے کسی خوشخبری کی بھنک پڑے۔ وہ میرے پاس آتے اور بادی النظر میں ایک غیر متعلق موضوع چھیڑ دیتے مثلاً یہ کہ ویت نام کی جنگ بند ہونے سے بین الاقوامی صورتِ حال پر کیا اثر پڑے گا؟ میں جواباً بین الاقوامی سیاست کی ساری گتھیاں سلجھا بیٹھتا تو وہ بڑی معصومیت سے سوال کرتے "ویسے آپ کا کیا خیال ہے اس سے ہماری جلد واپسی میں مدد ملے گی یا نہیں؟" اس وقت تو وہ تسلی بخش یا غیر تسلی جواب سن کر چلے جاتے، لیکن ذرا گھوم پھر کر دوبارہ تشریف لاتے اور کہتے "ذرا یہ تو بتاؤ کہ ڈالر کو کھلا چھوڑنے سے مالیاتی مارکیٹ پر کیا اثر پڑے گا؟" میں پھر اپنے علمِ معاشیات کا سارا زور بیچارے ڈالر پر ڈال دیتا اور وہ میری گفتگو کے آخر میں روائتی

بے اعتنائی سے کہہ دیتے "اگر مالی بحران بڑھ گیا اور بھارتی روپیہ ڈانواں ڈول ہو گیا تو کیا بھارت مالی طور پر ہمیں رہا کرنے پر مجبور ہو جائے گا؟"

موصوف کی سادہ لوحی دیکھ کر مجھے وہ دیہاتی یاد آتا جو ریلوے انکوائری سے ساری اہم گاڑیوں کی آمدورفت کے اوقات پوچھتا رہا اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ محض ریل کی پٹڑی کے پار جانا چاہتا تھا۔

وطن واپسی کے حسین خوابوں میں کبھی کبھی بھارتی ڈھنڈورچی زہر گھولنے لگتے۔ ایک دن ہم سہانے خوابوں کی بزم سجائے بیٹھے تھے کہ اہلِ وطن پہلے آنکھوں پر بٹھائیں گے، پھر کرسی پر کہ لو اپنے فرائض سنبھالو، اپنے یونٹ کا ٹریننگ پروگرام مرتب کرو، انہیں فیلڈ میں لے جاؤ اور آئندہ آزمائش کے لیے تیار کرو۔" اتنے میں آکاش وانی نے یہ بے پر کی اڑائی کہ جنگی قیدی ناکارہ ہو چکے ہیں، للٰذا انہیں واپس فوج میں بحال کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس بی بی کی دیرینہ روایات کے پیشِ نظر اس تازہ ارشاد کو ہم نے شک کی نظروں سے دیکھا، لیکن دوسرے تیسرے دن بھارتی اخبارات بھی یہی شوشہ چھوڑنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد غیر ملکی نشری اداروں نے بھی اسی امکان کا اظہار کیا، تو ہم واقعی سوچنے لگے کہ شاید ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا ہے، شاید ہمارے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں، شاید ہماری سوچ اندھی گلیوں میں بھٹک گئی ہے۔ ہم تو قیدی ہیں، اپنے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، شاید خلقِ خدا جو نقارہ پیٹ رہی ہے، اس میں حقیقت کا بھی کوئی عنصر ہو!

چنانچہ بعض محتاط اور دُور اندیش افسروں نے متبادل ذریعۂ معاش کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ گزارہ الاؤنس میں سے کسی نے بھیڑیں، کسی نے مرغیاں اور کسی نے شہد کی مکھیاں پالنے کے متعلق لٹریچر منگوا لیا۔ اسے ناشتے کے بعد، کھانے سے پہلے، کھیل کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھنا شروع کیا، اور جب اس نسخے کی ترکیبِ استعمال پر عبور حاصل کر لیا تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ سو بھیڑوں کا گلّہ پالنے کے لیے اتنی زمین، اتنا سرمایہ

اور اتنا عرصہ درکار ہوگا یا مرغیوں کی اعلیٰ نسل فلاں جگہ سے حاصل کی جائے گی اور ان کے دانے دُنکے کا بندوبست فلاں جگہ سے ہوگا، یا شہد کی مکھیوں کی مانگ کا عالم آج کل یہ ہے اور اگر اتنی مکھیاں پالی جائیں تو اتنے عرصے میں پاکستان کے لیے اتنا زرِمبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔

منصوبہ بندی کا مرحلہ یہیں ختم نہ ہوا، بلکہ پوری فرم کا خاکہ تیار کیا گیا، پارٹنر چُنے گئے، بورڈ آف ڈائرکٹرز کا انتخاب ہوا۔ منافعے کی تقسیم کا طریقِ کار طے ہوا اور انکم ٹیکس مشیر تک بھرتی کرنے کی تفصیلات کو آخری شکل دے دی گئی۔

"کیوں بھئی، پارٹنر بننا ہے تو بات کرو۔" ایک دوست نے یہ کہہ کر مجھے میری خیالی جنّت سے نکال کر واپس بیرک میں لا بٹھایا۔ پوچھا "کیا بات ہے؟" فرمانے لگے "بھئی تمہیں نہیں معلوم، سب لوگ منصوبہ بندی کر رہے ہیں، لوگوں نے پارٹنر بھی بانٹ لیے ہیں، سرمایہ بھی طے ہو چکا ہے۔ اگر آپ کو بھیڑیں پالنے سے دلچسپی ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔ تین کتابیں اس موضوع پر پڑھ چکا ہوں۔ آپ کو صرف دس پندرہ ہزار روپے خرچ کرنے پڑیں گے اور منافع ففٹی ففٹی؛ البتہ بھیڑوں کی بجائے مرغیوں کا آپ کو ذوق ہو تو میجر چودھری سے ملیں اور اگر شہد کی مکھیاں پالنے کا شوق ہے تو کیپٹن سیّد سے رابطہ قائم کریں۔ پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔"

منصوبہ بندی زوروں پر تھی کہ ریڈیو پاکستان نے آکاش وانی کے ڈھول کا پول کھول دیا اور حکومتِ پاکستان کی اٹل پالیسی کا واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ "تمام جنگی قیدیوں کو نہ صرف فوج میں رکھا جائے گا، بلکہ ان کی سنیارٹی کے مطابق انہیں ترقی بھی دی جائے گی۔" اس اعلان کے ساتھ ہی بھیڑیں، مرغیاں اور شہد کی مکھیاں اور ان کے متعلق سارا لٹریچر تو گیا لنگر کے چولہے میں، اور لوگ پھر ملٹری ہسٹری کی کتابیں کھول کر فیلڈ مارشل رومیل، فیلڈ مارشل آکن لیک اور جنرل آئزن ہاور کی فوجی چالوں پر بحث کرنے لگے۔ ایک نے کہا "میں تو پاکستان پہنچتے ہی ٹیک کورس (TAC COURSE) کروں گا۔" دوسرے نے کہا "میرا تو ارادہ سٹاف کالج کرنے کا ہے۔" تیسرا بولا "میں تو انجینئرنگ کالج رسالپور میں اپنی پیشہ ورانہ تعلیم مکمل کروں گا۔"

کچھ عرصہ بعد یہ جوش ذرا ٹھنڈا پڑا تو لوگ زبان دانی کے پیچھے پڑ گئے۔ زبانیں تو بیچاری ویسے ہی بے زبان ہوتی ہیں، جو کوئی چاہے ان کے تلفّظ، گرامر، حسن اور عزّت سے کھیلنے لگتا ہے۔ (یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے) قیدیوں کے سامنے بھی مظلوم زبانوں نے اُف نہ کی اور تختۂ مشق بن گئیں۔ زبان سیکھنے والے اناڑی اور سکھانے والے ذرا کم اناڑی تھے۔ کتابیں تلفّظ کچھ بتاتیں، نطق کچھ اور ادا کرتا۔

اس طرح سیکھی ہوئی فرانسیسی زبان میں نے ایک دفعہ ریڈ کراس کے نمائندے پر آزمائی۔ میں ہر بار رواں فرانسیسی کسی دقت کے بغیر بولتا رہا، لیکن میرے مخالف کے چہرے پر کلفت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ غالباً اسے میری فرانسیسی سمجھنے میں کچھ دقّت پیش آ رہی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ یورپ نژاد ہے، ہونہار ہوگا۔ بس ذرا مشق کی ضرورت ہے۔ دو چار دفعہ مجھ سے ہمکلامی کے بعد اپنی مشکلات پر قابو پالے گا۔

فرانسیسی کے علاوہ جن زبانوں پر ہم نے ہاتھ ڈالا، ان میں یورپی زبانوں میں جرمن، عالمِ اسلام کی زبانوں میں عربی اور برِّ صغیر کی زبانوں میں ہندی سرِ فہرست تھی۔ ان زبانوں پر نظرِ عنایت کی عموماً ایک سے زیادہ وجوہ تھیں۔ مثلاً ہندی سیکھنے والوں کا خیال تھا کہ اگر کبھی فرار کی صورت بنی تو بھارت میں سٹیشنوں، ریل گاڑیوں، سڑکوں اور بسوں کا اتہ پتہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی اور اگر جیل ہی میں رہ گئے تو ہندی کی مدد سے اہلِ ہند کے اصل خد و خال پہچانتے رہیں گے۔ عربی کو منتخب کرنے والوں کا موقف یہ تھا کہ اوّل تو صرف و نحو پڑھنے سے قرآنِ پاک سمجھنے میں سہولت ہوگی اور بعد میں کسی عرب ملک میں جانے کا اتّفاق ہوا تو یہ علم کام آئے گا۔ اسی طرح جرمن کے شائقین کا خیال تھا کہ ہٹلر کی سیاسی بائبل "مین کیمف" (MEIN KAMPH) اصل جرمن میں پڑھنے سے زیادہ لُطف آئے گا اور اگر خوبیٔ قسمت سے کبھی بون میں ملٹری اتاشی لگ گئے تو یہ زبان قوم کے کام آئے گی۔

اردو کی خوش قسمتی سمجھئے کہ کسی کی نگاہِ نیم کش اس پر نہ پڑی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم

سب اسے گھر کی باندی سمجھتے تھے۔ ہم جس طرح چاہتے، اسے استعمال کرتے، مثلاً میں ایک دن اپنے دوست کے ساتھ اردو میں سیر کر رہا تھا تو میرے دوست نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عوامل پر روشنی ڈالنے کو کہا۔ میں کوئی گھنٹہ بھر اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتا رہا اور جب اپنے دوست سے اس تاریخی واقعے کا تجزیہ کرنے کو کہا تو اس نے فرمایا "آپ کے سامنے میرا اظہارِ خیال کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے!" میرے دوست اردو پر اپنی دسترس کا اظہار عموماً محاوروں کے استعمال سے کیا کرتے تھے۔

زبان دانی کا خمار اُترا تو مُرغ بانی کا دَور شروع ہو گیا۔ میجر راٹھور اور دوسرے حضرات نے پرندوں سے پیغام رسانی کا کام لینے کی بجائے انہیں اسیر کرنا شروع کر دیا۔ چڑیا، فاختہ کبوتر، طوطا، مینا، غرض کہ جو کوئی دامِ ہوس کے نزدیک پھٹکا، گرفتار ہوا؛ البتہ ہوشیار کوّا کبھی قابو نہ آیا۔

ہم ان اسیروں سے بھارت جیسا سلوک نہ کرتے، بلکہ دانے پانی کے علاوہ تازہ ہوا، ذاتی توجہ اور محبت و شفقت سے تواضع کرتے اور جب کسی کو قفس میں ذرا ملول پاتے تو کسی "سمجھوتے" کے بغیر اسے رہا کر دیتے۔

اس مشغلے کے لیے دام و قفس بنانے کا مسئلہ میجر راٹھور کے جدّت پسند ذہن نے حل کر دیا۔ ہم صبح صبح سو کر اُٹھتے تو صحن میں ایک نیا دام بچھا ہوا پاتے۔ سہ پہر کو آنکھ کھلتی تو ایک نئے کھڑکی دار قفس کو شکار کا منتظر پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے "انجینئر" کے ہاتھ میں کوئی ایسا جوہر رکھا تھا کہ وہ بے سروسامانی کے باوجود یوں پنجرے پہ پنجرے بنائے جاتے جیسے انہوں نے کوئی فیکٹری لگا رکھی ہو۔

میجر راٹھور پنجرے بنانے کے لیے ٹین کے خالی ڈبے، تختوں کے پیکٹ اور لکڑی کی پھانسیں استعمال کرتے اور دام ترتیب دینے کے لیے درخت کی شاخیں، ادوائن کی رسیاں ازار بند کے دھاگے اور جوتوں سے اکھڑے ہوئے کیل کام میں لاتے۔ کئی دفعہ سوتے سوتے چارپائی کے نیچے کھسر پھسر ہوئی اور ہم نے بلّی کا شبہ کر کے "شو، شو" بھی کی، لیکن دھیان دینے پر پتہ چلا کہ

انجینئر صاحب جوتوں کے تلووں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ کوئی کیل گر کر ضائع ہونے والی تو نہیں۔ کئی دفعہ گرمیوں کی دوپہر کو آنکھ کھلی تو میجر راٹھور کو کپڑے لٹکانے والے دھاگے سے محوِ گفتگو پایا۔ وہ بار بار اس کی نبض دیکھ کر اپنے آپ سے کہتے "نہیں، نہیں اس سے کام نہیں چلے گا۔" یہ کہہ کر وہ آگے نکل جاتے، لیکن چند قدم چل کر پھر لوٹ آتے، دوبارہ اس کے کَس بَل دیکھتے اور اپنے آپ کو قائل کرنے کے لیے پھر کہتے "نہیں، نہیں، بہت موٹا ہے کوّے کو دُور سے نظر آجائے گا۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔" پھر اسے رد کر کے نئی دُنیائیں دریافت کرنے روانہ ہو جاتے۔

میجر راٹھور کے پاس پنجرے بنانے کے کئی "آرڈر" آتے۔ ایک صاحب آ کر کہتے "ہمیں ایک پنجرہ چاہیے، چھوٹا سا، خوبصورت، ہلکا پھُلکا، ہمیں مینا پالنی ہے۔" جواب ملتا "مل جائے گا۔" "لیکن ہمیں ذرا جلدی ہے۔ مینا کو کپڑے میں لپیٹ رکھا ہے، جلدی کر دیجئے۔" "آرڈر تو بہت ہیں لیکن آپ ظہر کی نماز کے بعد آ جائیے، آپ کا کام ہو جائے گا۔" اور واقعی سہ پہر کو پنجرہ تیار ہوتا۔ پھر دوسرے صاحب آتے "ہم نے چیلیں اور کوّے پکڑنے کا پروگرام بنایا ہے۔ ہماری ضرورت ایک مضبوط اور وسیع پنجرے کی ہے۔" "کب تک چاہیے؟" "پرسوں مل جائے تو نوازش ہوگی۔" "آپ فکر نہ کریں، پرسوں آپ کو پنجرہ مل جائے گا۔" اور سچ مچ وعدے کے مطابق پنجرہ مل جاتا۔

جیل کے باسیوں کی طرح جیل کے پرندوں کی تعداد بھی گِنی چُنی تھی۔ شاید وہی پرندے روز روز آ کر دام و قفس کے خطرات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ عالم ہو گیا کہ صحن میں جابجا دام بچھے رہتے، میجر راٹھور کا دام، میجر قمر کا دام، کیپٹن نعیم کا دام .... اور پرندے ان کے اردگرد دانہ دُنکا چُگ کر چلے جاتے اور اُڑنے سے پہلے شکاریوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر کہتے "ہم نے اپنے ساتھیوں سے عبرت حاصل کی ہے... بار بار قید کوئی نہیں ہوتا۔"

صحن میں جب پرندوں نے پھنسنے سے انکار کر دیا تو ہم نے دام چھت کی منڈیر پر رکھ دیا اور اس کا ریموٹ کنٹرول (REMOTE CONTROL) یعنی کھینچنے کا دھاگہ اپنی چارپائی کی پٹی سے باندھ لیا، تاکہ جونہی شکار پھنسے، چارپائی پر لیٹے لیٹے دھاگہ کھینچ لیا جائے۔

ایک دفعہ ایک ملازمت پرست بھارتی جے، سی، او نے یہ "ڈبہ" دیکھ لیا تو کہنے لگا "چھت پر وائرلیس کیوں لگا رکھا ہے؟ یہ سیکورٹی کے خلاف ہے، اسے اُتار دو۔" ہم نے حسبِ معمول محاذ آرائی کی ٹھانی اور تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا۔ بات ایڈجوٹنٹ سے ہوتی ہوئی کیمپ کمانڈنٹ تک پہنچی اور تفتیش شروع ہوئی۔ ہمارے سراغرسانوں کا کہنا تھا کہ کمانڈنٹ کو پرندے پالنے کا شوق ہے، چنانچہ ہم نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ذوقِ مرغ بانی کی داد دی اور رشوت کے طور پر پنجرے سمیت ایک طوطا دے کر ساری تفتیش غرق کرادی ـــــ اور وائرلیس والا مشغلہ جاری رہا۔

اب وہ جے، سی، او آتا تو منڈیر پر ٹنگے ہوئے پنجرے کو دیکھ کر کڑھتا اور ہم اس کے پیچ و تاب میں اضافہ کرنے کے لیے اس کے آنے سے پہلے ہی یہ "وائرلیس سیٹ" استعمال کرنے لگتے۔ ریسیور بنا کر زور زور سے کہنے لگتے "ہیلو، فور، ٹو، سکس ○ ... ہیلو، اسلام آباد، ہاؤ ڈُو یو ہیئر می ؟" ●
وائرلیس گفتگو کا یہ مانوس انداز دیکھ کر جے، سی، او پہلے ہم سے اُلجھتا، پھر جا کر ایڈجوٹنٹ سے شکایت کرتا، لیکن کسی کے آنے سے پہلے ہم "ریسیور" چھپا دیتے اور معصوم سا پنجرہ منڈیر کی زینت بنا رہنے دیتے۔

یہ شغل ایک عرصے تک جاری رہا۔ اس کاروبار کے روحِ رواں میجر راٹھور سے ایک دن میں نے کہا کہ کیا ایک غیر تعمیری شغل مقبول کرا دیا ہے؟ یہی وقت آپ پڑھ لکھ کر بھی گزار سکتے تھے۔" کہنے لگے "آپ کو پتہ ہی ہے، میری بینائی جیل میں آ کر کمزور ہو گئی ہے، چشمہ لگوا کر نہیں دیتے۔ کتاب پڑھنے بیٹھتا ہوں تو آنکھوں میں پانی آجاتا ہے اور سر درد کرنے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے تفسیر کا ایک صفحہ پڑھتا ہوں، وہ بھی اس لیے کہ حروف موٹے ہیں۔ اخبار یا انگریزی کتاب کا باریک پرنٹ مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔ میں نے سوچا اگر پڑھ نہیں سکتا تو کیوں چارپائی پر بے کار لیٹا

○ HELLO FOUR TWO SIX

● (HOW DO YOU HEAR ME) یعنی آپ کو میری آواز کیسی سُنائی دیتی ہے؟

یاس و اندوہ کو اپنے اوپر سوار ہونے دوں؟ یہ مشغلہ میرے ذوق کے مطابق لگا، اسے اپنا لیا، دوسرے لوگ خود بخود چند روز بعد یہ ڈگر چھوڑ دیں گے۔"

اور واقعی چند روز بعد لوگوں نے "تشکار" میں دلچسپی چھوڑ دی۔ اب ایک نئی ہوائے شوق چلی جس نے اکثر احباب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ وبا سر منڈوانے کی تھی جس کی ابتدا یوں ہوئی کہ بھارتی حجام نے آنا بند کر دیا اور کیمپ والوں نے ہمارے احتجاج کے باوجود کوئی متبادل انتظام نہ کیا۔ (بعد میں پتہ چلا کہ کیمپ کے کسی افسر نے سرکاری حجام کو گھریلو ملازم کی خدمات انجام دینے کے لیے اپنے بیوی بچوں کے پاس چھوڑ دیا تھا)، اس ذوق و شوق کی زد میں پہلے اوسط درجے کی کھیتیاں آئیں، پھر رفتہ رفتہ وہ فصلیں بھی متاثر ہوئیں جن کی آبیاری گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے کی جا رہی تھی۔ اب جدھر نگاہیں اُٹھتیں، کسی نہ کسی ٹنڈ دصفاچٹ سر) سے جا ٹکراتیں۔ نظر ایک تیل آلود "ٹنڈ" سے پھسلتی تو دوسری پر جا پڑتی۔ وہاں قدم جمنے نہ پاتے کہ میزبان "ٹنڈ" اسے آگے دھکیل دیتی اور یوں گھر سے ایک بار نکلی ہوئی نظر مشکل ہی سے واپس آ سکتی۔

پھر پلٹ کر نگہہ نہیں آئی
اُن پہ قربان ہو گئی ہو گی

ان "ٹنڈوں" کی دیکھ بھال کے لیے کبھی ایگ شیمپو (EGG SHAMPOO) منگوایا گیا اور کبھی کلینک شیمپو۔ کبھی ولائتی روغن کا اہتمام کیا گیا اور کبھی سرسوں کے خالص تیل کا پیٹینٹ (PATENT) شیمپو اور روغنوں کی خصلتوں کا تو لوگوں کو علم تھا لیکن سرسوں کے تیل کے مزاج شناس خال خال تھے۔ سارے کیمپ میں صرف دو آدمیوں کو اس میدان میں مہارت حاصل تھی، جن میں سے ایک کی چارپائی میرے پڑوس میں تھی۔ وہ عموماً تیل کا رنگ دیکھ کر یا بُو سونگھ کر اس کی خاندانی خصوصیات کا پتہ بتا دیتے۔ ایک روز صبح سویرے دوسری بیرک سے لیفٹیننٹ امجد آئے اور میرے پڑوسی "ماہر روغنیات" کو جگا کر کہنے لگے "یہ تیل ذرا ٹیسٹ کر دیجئے، میں نے کل شام ہی منگوایا ہے۔" ماہر نے کروٹ بدلی، سرہانے سے عینک اٹھا کر ناک پر لگائی، شیشی کو اوپر نیچے کر کے

دیکھا اور فیصلہ سُنا دیا "بالکل ٹھیک ہے۔ جاؤ بلا جھجک استعمال کرو"۔ اور خود پھر سو گئے۔

"ٹنڈوں" کو صاف شفاف رکھنے کے لیے بالوں کو پیدا ہوتے ہی مونڈ دیا جاتا۔ ٹِنڈ کا ایک شوقین دوسرے کی ٹِنڈ پر برُش سے صابن کی جھاگ بھڑکا کر سیفٹی چلانی شروع کر دیتا۔ بال اُترتے جاتے، خون پھوٹنے لگتا۔ مشّاق "حجام" کٹی ہوئی جلد پر پوڈر یا آفٹر شیو لوشن (AFTER SHAVE LOTION) لگا دیتا۔ جب ایک ٹِنڈ سَر ہو جاتی تو دوسری پر اسی کارروائی کا آغاز کر دیا جاتا۔ کئی دفعہ مجھ جیسے "غیر فیشن ایبل" حضرات پاس سے گزرتے تو دعوتی انداز میں صدا اُٹھتی "آجاؤ۔ ایک روپیہ فی ٹِنڈ، ایک روپیہ۔۔۔ اگر نقد نہیں تو اُدھار چلے گا، پاکستان پہنچ کر دے دینا۔۔۔ ایک روپیہ، فقط ایک روپیہ۔۔۔"

ٹِنڈیں ختم ہوئیں تو تقریر بازی کا شوق عام ہوا۔ ہر کوئی سامعین کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا۔ جونہی کوئی سامع ہاتھ آتا، تقریر کا آغاز ہو جاتا۔ ہر مقرر کو کسی نہ کسی موضوع پر دسترس حاصل ہوتی اور وہ ہر مضمون کو توڑ پھوڑ کر اپنے دل پسند موضوع کے مطابق ڈھال لیتا اور بے دریغ اظہارِ خیال کرنے لگتا۔

ایک صاحب سے جنہوں نے مذہبی فلسفے پر چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں، مَیں نے عرض کیا "آج چاندنی خوب چھٹک رہی ہے۔۔۔۔" فوراً بات کاٹ کر کہنے لگے "یہ نُور ہے۔ تخلیقِ کائنات سے پہلے جو نُور تھا، وہی نُور چاند میں، وہی نُور تاروں میں اور وہی نُور سُورج میں جلوہ گر ہے۔" مَیں نے عرض کیا "کئی حضرات بھی تو نُورٌ علیٰ نُور ہوتے ہیں۔" انہوں نے اس علمی گفتگو میں اسے دخل در معقولات سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور اپنا لیکچر جاری رکھا۔ "وہی نُور انسان کی آنکھ، دل اور چہرے پر منعکس ہوتا ہے۔ یہ نُورِ خدا انسان و حیوان اور چرند و پرند ہی میں نہیں، نباتات اور جمادات میں بھی جلوہ گر ہے۔ اس نُور کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ یہ نُور کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ بھی ہے۔" مَیں نے انہیں پٹڑی سے اُتارنے کے لیے کہا کہ "میرے پہلو میں درد ہو رہا ہے، شاید دردِ گُردہ جاگ اٹھا ہے۔" ارشاد ہوا "درد گُردے کا ہو یا گھٹنے کا، سب روحانی بیماری کے مظہر ہیں اور روحانی بیماری

تب پیدا ہوتی ہے جب نور کی کمی ہو جاتی ہے۔ نور کی کمی بیماری ہے اور نور کا فقدان موت۔"

ایک اور صاحب کو اپنے ادبی ذوق پر بہت ناز تھا۔ وہ بات بات پر شعر و ادب کو بحث میں گھسیٹ لاتے۔ بات انقلابِ کیوبا کی ہو رہی ہوتی اور وہ شعرا کا کلام اور ادبی حوالے دے کر ثابت کرنے لگتے کہ ہر انقلاب کے لیے سازگار فضا ادیب اور شاعر ہی پیدا کرتے ہیں، کیونکہ شعر و ادب کا منبع انسانی جذبات و خیالات ہوتے ہیں جو شعر یا ادب پارہ ان جذبات و احساسات کی نمائندگی نہیں کرتا، اس میں نہ لوچ ہو سکتا ہے نہ رس۔ شعر میں موسیقیت ہو سکتی ہے نہ نثر میں اثر۔۔۔" اگر کوئی شخص ادب نکھارنے کی اس کوشش کو ختم کرنے کے لیے کیمپ میں صفائی یا عدمِ صفائی کا مسئلہ چھیڑ دیتا تو یہ اُچک کر کہتے "صفائی کیمپ کی ہو یا معاشرے کی، اپنے مکینوں کی ذہنی صفائی کی عکاسی کرتی ہے۔ اور ذہنی صفائی کے لیے شعر و ادب کا ذوق ضروری ہے۔۔۔۔ شاعر اور ادیب معاشرے کی عکاسی ہی نہیں کرتے، اسے نکھارتے اور سنوارتے بھی ہیں۔۔۔۔"

ایک اور صاحب جنہیں علمِ معاشیات پر عبور حاصل تھا، ہر بحث کو معاشیاتی بحث میں تبدیل کر دیتے۔ ذکر چلتا تعلیمی پسماندگی کا اور وہ استدلال کرتے "تعلیمی پسماندگی کی وجہ مالی پسماندگی ہے۔ بہت سے ہونہار بچے صرف اس لیے زیورِ تعلیم سے زینت نہیں پا سکتے کہ ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ مَیں اس موقف کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ صاحبِ حیثیت لوگ بھی تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے کیسز (CASES) اگر ہیں بھی تو ان کی حیثیت EXCEPTIONS ° کی ہے؛ چنانچہ میں اپنے موقف کو پھر دہراؤں گا کہ تعلیمی پسماندگی کے ساتھ معاشرے کی دوسری خرابیاں دُور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی مسائل سب سے پہلے حل کیے جائیں۔"

ہم یوں کبھی پرندے پکڑ کر اور کبھی باتیں بنا کر شبِ اسیری کی گھڑیاں گنتے رہے اور ادھر میجر ورما اور اس کے ساتھی اپنے وطیرے پر عمل پیرا رہے۔ وہ دوسری پابندیوں پر پابند رہنے کے

° استثنا

ساتھ ساتھ تلاشی پر غیر معمولی توجہ دینے لگے۔ جب کسی کا مُوڈ ہوتا اچانک تلاشی شروع کر دیتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ کیمپ والوں کے جملہ فرائض سُکڑ کر تلاشِ پیہم میں سمٹ آئے ہیں۔ لیکن ہم اب تلاشی کے عادی ہو چکے تھے۔ کسی کو کرنسی چھپانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے پڑتے نہ چھاپ کے بغیر کپڑوں کو ٹھکانے لگانے کی فکر ہوتی۔ جونہی متلاشیوں کا پہلا ریلا دیوارِ برلن عبور کرتا ہم کرنسی نوٹ مخصوص دفینے میں دفن کر دیتے۔ چھاپ کے بغیر کپڑے مونڈھے○ کے نیچے ٹھونس لیتے اور خود ان پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگتے۔ اگر تلاشی والا ہمیں اُٹھاتا بھی تو ہم مونڈھے کو دا اُلٹائے بغیر، جھاڑ کر گھسیٹتے گھسیٹتے دوسری جگہ لے جاتے اور پھر اس پر بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگتے۔

مَیں نے تلاشی لینے والوں کو ٹرخانے کے لیے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ اصلی کاغذ تو کہیں دفنا دیے اور ایک جعلی ڈائری میں چند مشکوک باتیں لکھ کر اسے دری کے نیچے چھپا دیا۔ جب تلاشی لینے والے ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے اور دری کے نیچے سے مشکوک ڈائری انہیں ہاتھ لگ جاتی تو وہ مزید چھان پھٹک ترک کر کے اسی ڈائری پر ساری توجہ مرکوز کر دیتے۔ مَیں بھی ان کا شک پختہ کرنے کے لیے زور دیتا کہ "تمہیں بھگوان کی قسم! یہ ڈائری مت لے جاؤ، چاہو تو میں تمہیں پاکستانی بسکٹوں کا ڈبہ عنایت کر سکتا ہوں، بلکہ سارا گفٹ پارسل حاضر کر سکتا ہوں، لیکن یہ ڈائری چھوڑتے جایئے"۔ تیر نشانے پر بیٹھتا اور وہ ڈائری لے کر چلے جاتے۔ ہم اس کی بازیابی کے لیے مہینوں مقدمہ کھڑا کیے رکھتے اور وہ سمجھتے کہ میدان مار لیا ہے۔

ہم سُرنگ کھودنے کے اوزار، طلائی انگوٹھیاں اور دوسری کرنسی کہاں رکھتے تھے، بھلا بھارت کو کیوں بتائیں، انہوں نے ہمیں اپنے کون سے راز بتائے تھے؟

کیمپ کا نیا کمانڈنٹ جس کی سرکردگی میں یہ "چھاپے" مارے جاتے، کرنل اپادھیا سے بالکل مختلف تھا۔ یہ دھاڑنے چنگھاڑنے کی صلاحیتوں سے عاری تھا۔ عموماً زنانہ سٹائل میں اپنی افسری نبھائے جاتا اور جب کیمپ میں کوئی انتظامی بحران پیدا ہوتا تو بیچارہ اپنی نوکری کا واسطہ دے کر یا

○ فرنیچر کی کمی کے پیشِ نظر ہم نے بارہ روپے فی مونڈھا کے حساب سے خریدے تھے اور آتے وقت بھارت کو بخشش کر آئے تھے۔

گروپ کمانڈر سے شکایت کر دینے کی دھمکی دے کر گزارہ کرتا۔

ہم نے اسے نرم پاکر "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب نے شرارتاً کہا "آپ نے والی بال اور بیڈ منٹن کا سامان تو ایک بار مہیا کر دیا، لیکن مجھ جیسے چوگان کے کھلاڑیوں کی ضروریات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔" دوسرا بولا "مجھے گاف کھیلنے کا شوق ہے لیکن آپ نے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا۔" وہ بیچارا کبھی کولہے مٹکا کر اور کبھی مسکرا کر معذرت کرتا اور ہم اس کی اداؤں کے نثار ہو کر اسے معاف کر دیتے۔

ایک دفعہ وہ سرکاری انداز میں کیمپ کے سیکنڈ ان کمانڈ (SECOND IN COMMAND) کی معیت میں بیرکوں کا معائنہ کر رہا تھا تو کیپٹن گردیزی نے کہا "میں ٹائم میگزین کا خریدار بننا چاہتا ہوں، انتظام کرا دیجئے۔" اس نے اپنے نائب کیپٹن سالگر سے پوچھا "یہ رسالہ ہفت روزہ ہے یا پندرہ روزہ؟" اس نے جواب دیا "شاید ماہوار ہے ... بٹ آئی وِل چیک اپ سر۔"°

چند روز بعد اسی میجر ورما نے ہمارے کیمپ کے تین ڈاکٹروں کو بلایا اور بھارتی ڈاکٹر ملک سے مل کر یہ خوشخبری سنائی کہ بیماروں کی تین ریل گاڑیوں کے ساتھ تین ڈاکٹر پاکستان جائیں گے۔ پہلی گاڑی جس کے ساتھ کیپٹن ایاز جائیں گے، آٹھ تاریخ کو روانہ ہوگی۔ دوسری گاڑی کیپٹن جان عالم کو لے کر گیارہ تاریخ کو چلے گی اور تیسری گاڑی میجر بشیر سمیت چودہ تاریخ کو آگرہ ریلوے سٹیشن چھوڑے گی۔" پتہ نہیں وہ ہمارے مذاق کا جواب عملی مذاق سے دینا چاہتا تھا یا ویسے ہی ڈاکٹروں کے اعصاب سے کھیلنا چاہتا تھا، لیکن کیمپ میں مشہور ہو گیا کہ ڈاکٹر جا رہے ہیں۔ مبارکیں ہوئیں اور پکوڑوں کی الوداعی پارٹیاں ہوئیں — اور خوشیاں منائی گئیں، لیکن ڈاکٹروں کو نہ جانا تھا نہ گئے۔

آتے جاتے کسی ڈاکٹر سے سامنا ہو جاتا تو میں مذاقاً کہتا "سنا ہے ڈاکٹر جا رہے ہیں۔" وہ بیچارا کھسیانی ہنسی ہنس کر اور ورما کو دو چار گالیاں سنا کر چل دیتا۔

اگرچہ میجر ورما سے میری ایسے مذاق کی راہ و رسم نہ تھی، لیکن ایک دن اس نے دفتر میں

° (BUT I WILL CHECK UP SIR) یعنی میں پتہ کر کے بتاؤں گا۔

مجھے بُلایا اور اپنے ایڈجوٹنٹ کے ذریعے خوشخبری سُنائی کہ صحافیوں کا قافلہ اس ماہ کی چوبیس تاریخ کو جا رہا ہے۔ آپ بھی اپنے کوائف لکھوا دیں۔" میرے بتائے بغیر یہ خبر بھی سارے کیمپ میں پھیل گئی اور لوگ مجھے مبارکیں اور پیغام دینے لگے، لیکن چند روز بعد بُلبُلۂ امید بھی چُور ہوا اور ڈاکٹر آتے جاتے آوازے کسنے لگے "سُنا ہے، صحافیوں کا قافلہ جا رہا ہے ۔۔۔ !"

ہماری یہ چھیڑ خانی جاری تھی کہ پاکستان میں مستقل آئین سے متعلق خبریں آنے لگیں۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ پاکستان عارضی بنیادوں سے پکّی بنیادوں پر منتقل ہو رہا ہے۔ اس سفر میں ہر منزل پر دل کی دھڑکنیں تیز ہوتیں؛ چنانچہ ہم نے کئی بار اپنی اجتماعی اور انفرادی نمازوں میں دستوری بُحران کے حل کے لیے دعائیں کیں۔ حکومتِ وقت کی کوششیں اور سیاستدانوں کا تدبّر تسلیم، لیکن اسیرانِ آگرہ کی یہ خود فریبی قائم رہنے دیجئے کہ انہی کی دعاؤں سے پاکستان کا مستقل آئین متفقہ طور پر منظور ہو گیا۔

ہم حسبِ خواہش جشنِ آئین تو نہ منا سکے، لیکن مقدور بھر خوشی اور تشکّر کا اظہار کیا۔ نمازِ شکرانہ ادا کی اور ریڈیو پاکستان سے اس موقعے پر نشر ہونے والے سارے تبصرے اور مذاکرے سُنے۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

یہ دستور ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو نافذ ہو گیا۔ بلاشبہ یہ خوشی کا دن تھا، کیونکہ اسے نہ صرف پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی، بلکہ رُبع صدی میں پہلی بار ایک جمہوری آئین نافذ ہوا تھا۔ لیکن خوشی کا یہ موقع ہی متحدہ پاکستان کی دوسری برسی کا دن تھا؛ چنانچہ پھر احساس جاگا، پھر سوئیاں چبھنے لگیں، پھر زخموں کے ٹانکے ٹوٹنے لگے۔ لیکن اس بار میں نہ پھُوٹ پھُوٹ کر رویا، نہ سر دیوارِ زنداں سے ٹکرایا۔ پتہ نہیں دستور کی خوشی نے آنسو جذب کر لیے تھے یا ویسے ہی ڈیڑھ سال کی گریہ وزاری کے بعد ان کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ بس، کوئی سوچ آئی اور سونگھ کر چلی گئی۔ پھر ہونٹوں پر نہ تبسّم کی چٹک آئی اور نہ نالے کی لَے۔ سارا دِن تصویرِ درد بنا، گم سُم بیٹھا رہا۔

انہی دنوں خبر آئی کہ ۱۸ اگست ۱۹۷۳ء کو بھارت اور پاکستان کے نمائندوں کی ملاقات ہوگی۔

اس خبر سے مہرِ زنگ میں جلنے والی شمع کو یوں محسوس ہوا کہ سحر ہونے کو ہے۔ اس کی لَو اونچی ہو گئی۔ پرانی امیدیں نئے پیرہن پہن کر دل کو لبھانے لگیں۔ ذہن کے تاریک گوشوں میں جگنو جگمگانے لگے۔

لیکن سپیدۂ سحر کی مدح سرائی سے پہلے آئیے، دو موضوعات کا اجمالی سا ذکر کر لیں جنہیں میں ابھی تک اس روداد کے دھارے سے الگ رکھتا رہا ہوں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں موضوع الگ الگ باب کے مستحق ہیں۔ ایک کا تعلق ہم پر بھارت کے اعصابی حملوں اور ہماری مدافعت سے ہے اور دوسرے کا ان جوانمردوں کی کوششوں سے جنہوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر فرار کی کامیاب یا ناکام کوششیں کیں۔ صیاد و صید کی یہ کشمکش جو درحقیقت موت سے آنکھ مچولی کھیلنے کی حیثیت رکھتی ہے، ہماری اسیری کا سب سے روشن، سب سے تابناک باب ہے۔

○○

نفسیاتی جنگ

مجھے افسوس ہے کہ پچھلے صفحات میں مَیں نے بھارتی تواضع کو دال روٹی تک محدود رکھا۔ دراصل ہمارے میزبان نے اس کے علاوہ بھی ہم پر زرِ کثیر صرف کیا۔ اس نے ہمارے لیے خصوصی اخبار جاری کیا۔ دُور و نزدیک سے سرکاری خرچ پر مسلمان اکابر پند و نصائح کے لیے بلوائے، بھارت کی منتخب فلمیں دکھائیں، کلچرل شو کا اہتمام کیا۔ کاش ان سب عنایات کا ان صفحات میں احاطہ کیا جا سکتا!

یہ ساری تواضع ہماری ذہنی تربیت کے لیے تھی، تاکہ اسیری کے فارغ دنوں میں ہم بھارت کی عظمت، وہاں کے مسلمانوں کی خوشحالی، سیکولرزم کی ترقی اور بھارت کی امن پسندی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ ثقافتی ورثے سے بھی روشناس ہو جائیں۔ ہمارے میزبان کا خیال تھا کہ یہ تربیت رسمی قید و بند ٹوٹنے کے بعد بھی ہمارے بہت کام آئے گی اور جنوبی ایشیا میں "فروغِ امن" کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اس نفسیاتی جنگ کی ابتدا ڈھاکہ ہی سے ہو گئی تھی۔ بھارت پہنچنے کے بعد اس میں شدّت پیدا ہو گئی۔ کلکتہ میں میرے محتسب (INTERROGATOR) کی گفتگو کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ "بنگلہ دیش بننے سے نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بھارت سے محاذ آرائی تو درکنار پاکستان کے لیے اپنا وجود قائم رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ تم تو قیدِ تنہائی میں ہو، ذرا باہر کی خبریں سُنو تو حیران رہ جاؤ کہ دو قومی نظریہ دم توڑ چکا ہے اور پاکستان کے باقی صوبوں میں بھی علٰحدگی کی تحریکیں زور پکڑ گئی ہیں۔"

کلکتہ سے آگرہ سیل پہنچا تو ایک دن چابی بردار حوالدار میجر کہنے لگا "پاکستان تو ہر چیز باہر سے منگواتا ہے۔ پین، پنسل سے لیکر ٹریکٹر ٹینک۔ ادھر بھارت ہر چیز خود بناتا ہے۔ ٹریکٹر، کاریں، ٹینک، توپیں، طیارے۔ بھارت اور پاکستان کا کیا مقابلہ؟ کبھی مانگے تانگے کی چیزیں بھی کسی کا ساتھ دیتی ہیں! مانگے ہوئے بیل سے ایک بار کھیت میں ہل تو چلایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے زمین تیار کر کے اچھی فصل حاصل نہیں کی جا سکتی۔"

کیمپ ۴۴ کا ایڈجوٹنٹ ملا، تو اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد کہنے لگا "پاکستان ہمیشہ غیر ملکی اشیاء پر انحصار کرتا آیا ہے۔ اب درآمدات کے لیے اس کے پاس زرِ مبادلہ کہاں سے آئے گا، بنگلہ دیش کی چائے اور پٹ سن تو گئی۔۔۔"

دارالامراء میں کیمپ کا سیکنڈ اِن کمانڈ (SECOND IN COMMAND) آیا، تو سیالکوٹ سے اپنا آبائی اور جذباتی رشتہ جتا کر کہنے لگا "واہ، سیالکوٹ کی گلیاں جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا، اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ بڑ کا درخت، رہٹ کا پانی، بارونق بازار۔۔۔ آپ تو سیالکوٹ جاتے رہتے ہوں گے۔ کیا اب بھی سیالکوٹ اتنا ہی سہانا، اتنا ہی البیلا ہے؟ کاش سیاسی حدیں مٹ جائیں اور میں پھر سیالکوٹ کے کوچہ و بازار میں آزادانہ گھوم پھر سکوں۔۔۔"

دارالعوام میں ایک روز کیمپ کمانڈنٹ آیا تو اس نے بھی یہی راگنی چھیڑی "میں علی گڑھ میں پڑھا ہوں، جہاں میرے حلقۂ احباب میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ تھے۔ تقسیم تک ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات رہے۔ ان کے بچے میری گود میں اور میرے ان کی گود میں پلے بڑھے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اب ہم آپس میں مل سکتے ہیں نہ ہمارے بچے۔ بس فارٹیز ○ (FORTIES) میں کچھ ایسی وبا چلی کہ عقل کی بجائے جذبات فیصلے کرنے لگے۔ صدیوں کا میل جول چند سیاستدانوں کے ذاتی تعصبات کی نذر ہو گیا۔ مانا کہ ہندوؤں سے زیادتیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن گھر کے کسی فرد کی زیادتی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی

○ اس صدی کا چوتھا عشرہ۔

بھارت اور پاکستان کی سرحدیں کھول دی جائیں تو محبت کا رَو کا ہوا ریلا ساری رنجشوں کو بہانے جائے گا۔۔۔۔"

ہم یہ باتیں سُن کر سیخ پا ہوتے۔ جونہی کیمپ کا کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ کارندہ اپنی گفتگو کے دوران اس موضوع کی طرف پلٹا کھاتا، ہم اسے کھانے کو دوڑتے اور طرح طرح کے سوال کر کے معرکہ گفتگو کو معرکہ جنگ و جدل میں بدل دیتے اور آخر کار ہماری سوچ کا دھارا بدلنے والا خود منہ موڑ کر کھسکنے پر مجبور ہو جاتا۔

بھارت نے اس نفسیاتی شطرنج میں اپنے مہرے یوں پٹتے دیکھے تو اسے احساس ہوا کہ یہ میدان مارنے کے لیے کیمپ کے چابی بردار حوالدار میجر، نیم خواندہ ایڈجوٹنٹ اور کوتاہ اندیش کمانڈنٹ کی خدمات کافی نہیں۔ کیوں نہ اس خدمت کے لیے ان سو ملین مسلمانوں کو استعمال میں لایا جائے، جنہیں بھاری تنخواہیں دے کر سرکاری ملازمتوں میں پال رکھا ہے۔ بیشک ان کا بنیادی مقصد بھارت میں مسلمانوں کی خوشحالی کا پرچار ہی سہی، لیکن ان سے یہ کارِ خیر لینے میں کیا حرج ہے! چڑیا گھر کے ہاتھی کو بوقتِ ضرورت سواری کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس جنسِ مخصوص کا جو پہلا نمونہ آیا اس کا نام شہباز تھا مگر وہ شکل و صورت سے ممولہ لگتا تھا۔ اس کا تعارف "آج کل" کے مدیر کی حیثیت سے کرایا گیا۔ ہم نے اسے غور سے دیکھا تو واقعی اس کا منحنی جسم مدیرانہ ساخت کا تھا اور چہرے پر بے بسی بھارتی مسلمانوں کی سی تھی؛ چنانچہ کسی حد تک اس کے مسلمان ہونے کا یقین آ گیا، لیکن جب اس نے باتیں شروع کیں تو ہمیں اس کے مسلمان کے لباس میں ہندو ہونے کا شک گزرا۔ ایک ساتھی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "تمہارا تعلق کُتب و رسائل سے رہا ہے۔ ذرا پرکھ کر بتاؤ کہ کیا "آج کل" کا یہ ایڈیٹر سچ مچ کا مسلمان ہے؟" عرض کیا "شکل سے لگتا ہے، عقل سے نہیں۔"

شہباز صاحب کوئی نصف گھنٹہ اپنے محبوب — بھارت — کی شعلہ رخی کی حدیثیں بیان کرتے رہے اور دبے دبے الفاظ میں رقیبِ رُوسیاہ — پاکستان — پر بھی فقرے کستے رہے۔

وہ اپنی تقریر کے دوران ہر تیسرے چوتھے فقرے کے بعد کرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہوئے سینئر بھارتی افسر کی طرف گردن موڑ کر یوں دیکھتے گویا کہہ رہے ہوں "کیوں، سرکار، ابھی تک جو الفاظ اس نمک خوار کے منہ سے ادا ہوئے وہ اس کی وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں؟" اور جب تقریر کرتے وقت ان کا رُخ ہماری طرف ہوتا تو چہرہ الفاظ کی زبان سے الگ بولی بولنے لگتا۔ وہ کہتا "بھائیو! میں مجبور و ناچار ہوں۔ کنبے کے کئی افراد کی کفالت کا بوجھ تنہا مجھ پر ہے۔ مجھے بے بس سمجھو، میں لاکھ الفت و رضا کی بات کروں، تم خوئے ستمگر نہ بھولنا۔۔۔"

ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ "اِک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے"۔ چنانچہ جونہی شہباز صاحب نے لوکدار جملے کہے، سُننے والے اُلٹا انہیں سُنانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمیں بھارت میں مسلمانوں کی حالت کا پورا پورا علم ہے، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کی معاشی بدحالی کی تصویر کرایہ کے مقرّروں کی آواز سے کہیں زیادہ اونچی اور مؤثّر ہے ہمیں جمہوریّت کا درس دینے والے کشمیر میں استصواب رائے کروا کر کشمیریوں کا حقِ جمہوریّت کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ مشرقی بنگال کی غربت کا طعنہ دینے والے مغربی بنگال کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟" لیکن اس تلخی کے پیچھے شہباز صاحب سے کوئی عداوت نہ تھی۔ بس کچھ اپنی اسیری کا زخم، کچھ ان کی نمک پاشی ہم ضبط نہ کر سکے۔ اور ان پر بے تحاشا برسے۔

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایّام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

جب تلخی بڑھی تو کیمپ کمانڈنٹ جو تھانیداری کے فرائض پر مامور تھا، امن بحال کرنے اٹھا لیکن اس کی مداخلت سے لوگ اور مشتعل ہو گئے۔ اس نے ہمارے بڑے نمائندے (SENIOR SPOKESMAN) سے کمک مانگی۔ کرنل سیّد نے ہاتھ کے اشارے سے ضبط و تحمّل کی تلقین کی۔ شور ذرا تھما تو لال پٹّی والا بھارتی افسر کرسیٔ صدارت سے اٹھا اور کہنے لگا "بس بس ہم جا رہے ہیں، ہمارا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ لوگ کن خطوط پر

سوچ رہے ہیں ...." اتنے میں پیچھے سے آواز آئی " اگر سمجھ نہیں آئی، تو ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی پوری طرح سمجھائے دیتے ہیں۔"

بھارتی عملہ، فاضل مقرّر اور صدرِ گرامی کو اپنی پناہ میں لے کر باہر چلا گیا۔

چند ماہ بعد جوہری توانائی کمیشن کے ڈاکٹر رحمٰن بھارت کی توانائی کا پرچار کرنے کیلئے اپنے جوہر دکھانے آئے۔ ہم صبح دس بجے جیل کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ لکڑی کی چار کرسیاں اور ایک میز مہمانوں کے لیے رکھ دی گئی۔ ڈاکٹر رحمٰن نے شہبازی کی شہبازی سے عبرت حاصل کرتے ہوئے پہلے ہی معذرت کر لی کہ "میں کسی پروپیگنڈے کی خاطر نہیں آیا، میں سیاسیات میں اُلجھوں گا نہ جذبات میں۔ سیدھی سیدھی خالص سائنسی اور فنّی باتیں کروں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے تکنیکی سائنس کی آڑ میں زہریلے تیر چلانے شروع کیے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت اب سائنس کے میدان میں برِصغیر کی قیادت سنبھالنے کو تیار ہے اور اگر پاکستان بھی بھارت سے مل جائے تو رفتار اور تیز ہو سکتی ہے اور برِصغیر کچھ عرصے بعد بڑی طاقتوں کی کاسہ لیسی ترک کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دبے الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ کیا کہ بھارت کے وسائل اتنے وسیع اور یہاں سائنسی تحقیق اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اب پاکستان کو دوسروں کے پیچھے دوڑنے کی بجائے بھارت کی برتری اور قیادت قبول کر لینی چاہیے۔

ڈاکٹر رحمٰن پر سوالوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ لوگوں نے بھارت کی بڑائی اور پاکستان کی پسماندگی سے متعلق گفتگو کو پروپیگنڈے سے تعبیر کیا اور حکومتِ پاکستان کے مؤقف کی روشنی میں ڈاکٹر رحمٰن کو کھری کھری سُنائیں۔

تقریر کے بعد چائے کے مگ اور پکوڑوں کی پلیٹ پر غیر رسمی گفتگو کے دوران ڈاکٹر رحمٰن میرے ہاتھ چڑھ گئے۔ میں نے ان سے صرف دو باتیں پوچھیں۔ ایک یہ کہ بھارت دفاعی اور غیر دفاعی نوعیت کی سائنسی تحقیق پر کس نسبت سے خرچ کرتا ہے؟ جب ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ "تحقیقی اخراجات کا دس فیصد دفاعی سائنس پر خرچ ہوتا ہے اور نوّے فیصد غیر دفاعی سائنس پر" تو میں نے

عرض کیا "پھر کیا بات ہے کہ جس شعبے پر آپ دس فیصد خرچ کرتے ہیں، اس نے تو بڑھ کر ایک پڑوسی ملک فتح کر لیا، لیکن جس مد پر آپ نوّے فیصد خرچ کرتے ہیں اس کے نتائج کا یہ عالم ہے کہ بھارت میں بھوک اور افلاس دن دُگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔" وہ اس سوال کے جواب سے پہلوتہی کرنے لگے تو مَیں نے دوسری بات یہ پوچھی کہ "آپ کا کیا خیال ہے کہ بھارت کی سائنسی اور فنی ترقی سے بھارتی قیادت کے وسعت پسندانہ رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوگی؟ یعنی آپ جرمنی کی مثال لے لیں، اگر جرمنی ۱۹۳۰۔۱۹۴۰ء کے عشرے میں سائنسی طور پر اس قدر ترقی یافتہ نہ ہوتا تو شاید ہٹلر کو ساری دنیا کو میدانِ جنگ بنانے کی ہمت نہ ہوتی۔" اس پر ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "آپ ملٹری سٹرٹیجسٹ° ہیں۔ میں اس موضوع پر آپ سے بحث نہیں کر سکتا۔" اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور لیفٹیننٹ کرنل افضل نے میرے کان میں کہا "لو بھئی، تم جیسے نیم خواندہ اور نیم فوجی کو بھی ملٹری سٹرٹیجسٹ ہونے کا رتبہ مل گیا۔ مبارک ہو، چائے پلاؤ، پارٹی دو، تم نے ایک بھارتی ڈاکٹر کو اپنی جہالت سے مرعوب کر لیا۔"

رحمٰن صاحب نے پکوڑے کا "ایک بچّہ" تانبے کی پلیٹ سے اُٹھایا، منہ میں ڈالا اور جگالی کرتے ہوئے اپنے محافظوں کے جلو میں وداع ہو گئے۔

مقررین کی صف میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات اے۔جے۔قدوائی اپنے عہدے اور موضوعِ گفتگو کے لحاظ سے بڑے اہم تھے۔ یہ پتلے چھریرے جسم کے دفتری آدمی تھے۔ چہرے پر ستم ہائے روزگار کے واضح تاثرات تھے۔ لہجے میں ٹھہراؤ اور رکینہ تھا اور اپنے افسرانہ وقار کو بحال رکھنے کے لیے تمباکو سے بھرا ہوا پائپ ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے ابتدائے گفتگو میں یہ تاثر دیا کہ

"انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے"

ہمیں اس خودستائی کا گلہ نہ تھا۔ ہم خاموش ان کی مدحِ خویش کی حکایتیں سنتے رہے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پُرخطر وادی میں قدم رکھا اور کہا "آپ کی حکومت کو آپ کی رہائی میں دلچسپی نہیں، ورنہ بنگلہ دیش کو فوراً تسلیم کر کے آپ کو واپس لے جا سکتی تھی۔ بھارت کو قیدِ طویل کرنے کا شوق نہیں۔

° فوجی تدبر اور منصوبہ بندی کا ماہر (MILITARY STRATEGIST)

بھارت تو امن پسند ملک ہے۔ ایک کروڑ مہاجرین سے انسانی ہمدردی کی خاطر مداخلت پر مجبور ہو گیا۔"

ابھی وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ کئی آدمی اچانک یوں اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے سوئے ہوئے دُکھ جاگ اٹھتے ہیں۔ سات آٹھ آدمیوں نے قدوائی صاحب کو لگام دینے کی کوشش کی۔ سینئر افسروں نے پہل کی اور جونئر یہ دیکھتے رہے کہ کب تیر اندازی تھمے تو ہم بھی اپنی نشانہ بازی کا مظاہرہ کریں، لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ سینئر افسروں ہی نے اس کا منہ بند کر دیا۔

کرنل لودھی نے کہا "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان جب تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتا، ہم رہا نہیں ہو سکتے؟ گویا پاکستان سو سال تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرے تو آپ ہمیں سو سال یہاں رکھیں گے۔ ہمیں اپنی قید کا گلہ نہیں، بھارت کی بے اصولی کی شکایت ہے ..... ۱۹۴۷ء اور اس سے پہلے کی نسل پہلے ہی ہندو گزیدہ ہے۔ آپ نے نئی نسل کو بھی بھارتی تنگ دلی اور تنگ نظری کا قائل کر دیا ہے۔ ادھر آپ امن کی بات کرتے ہیں، پتہ نہیں آپ امن کی باتوں سے پاکستان کی کس نسل کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں...؟"

کرنل زیدی برس پڑے۔ "آپ کب تک مہاجرین کا ڈھونگ جاری رکھیں گے۔ اگر مہاجرین کی مدد ہی بھارت کی پالیسی ہے تو ہمیں براہِ کرم ابھی بتا دیجئے کہ آپ کب سندھ (پاکستان) کے ہندوؤں کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف بُلانے کا ارادہ رکھتے ہیں، تاکہ آپ انسانی ہمدردی کی خاطر پاکستان پر پندرہ بیس ڈویژن فوج چڑھا سکیں۔"

کرنل وڑائچ بولے "آپ بھارت میں مسلمانوں کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہیں۔ ادھر حالت یہ ہے کہ سو سے زیادہ مرکزی سیکرٹریوں میں صرف چار مسلمان ہیں جبکہ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بارہ فیصد ہے اور مشرقی پاکستان سے آگرہ جیل تک ہمیں ایک بھی مسلمان فوجی افسر نظر نہیں آیا۔ کیا اسی کا نام مسلمانوں کی خوشحالی ہے؟"

اس یلغار سے بچنے کے لیے قدوائی صاحب اٹھے اور انگوٹھے سے پائپ کا ان جلا تمباکو دباتے ہوئے کیمپ سے باہر نکل گئے۔

اُٹھ چلے شیخ جی تم مجلسِ رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی

پھر ایک روز اطلاع ملی کہ ایک نہایت ہی قابلِ احترام دینی رہنما تشریف لا رہے ہیں جو سیاسی چھیڑ خانی کی بجائے ہمیں مذہبی بصیرت عطا فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہدایت ہوئی کہ ہم ان سے شہباز، رحمٰن یا قدوائی والا سلوک نہ کریں بلکہ نہایت احترام سے مہمان کی باتیں سُنیں۔ اگر وہ سوال کرنے کی اجازت دیں تو ایک یا دو افراد مؤدب الفاظ میں مدعائے دل بیان کریں۔ باقی سب خاموشی سے سنیں۔ سوال کرنے والوں میں بندۂ حقیر کا نام بھی تھا۔

بزرگِ دین تقریباً گیارہ بجے تشریف لائے۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب تھے۔ ہم ان سے استفادہ کرنے سب سے بڑی بیرک میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مجیب چھوٹے سے قد کے عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ ڈاڑھی سے بے نیاز، سفید گورا رنگ تھا۔ بادامی رنگ کی ٹھنڈی اچکن اور نہرو فیشن کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ وہ بظاہر قابلِ احترام لگتے تھے۔

پروفیسر مجیب نے پہلے جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدرِ ہند) سے اپنے ذاتی تعلقات کا تذکرہ کیا۔ پھر تقسیم ہند پر آئے اور کہنے لگے کہ میں نہرو یا ذاکر حسین سے کسی ذاتی منفعت کی خاطر بھارت میں نہیں رکا، بلکہ یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا کہ اسلام کے پرچار کی ضرورت پاکستان کی نسبت بھارت میں زیادہ ہے، اگر ہم سب پاکستان چلے گئے تو اس خطۂ ارضی میں اسلام کی تبلیغ کون کرے گا؟ اس کے بعد انہوں نے بھارت میں فروغِ اسلام کے لیے اپنی خدمات کا مفصل ذکر کیا۔

وہ نہایت حلیم و موثر الفاظ میں اپنے دل کی بات کہتے رہے۔ ہم حسبِ حکم خاموشی سے سُنتے رہے۔ بعد میں جب انہوں نے سوالوں کا دروازہ کھولا تو ڈاکٹر ہاشمی، میجر مرزا اور مَیں نے سوالات کیے۔ میرا سوال یہ تھا "جنابِ والا! کیا آپ مجھ جیسے دنیا دار کی رہنمائی کے لیے اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے کہ آیا اسلام کے مقاصد میں اسلامی معاشرے کی تشکیل بھی شامل ہے ـــ اور اگر آپ کا

جواب اثبات میں ہے، تو براہِ کرم ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ کیا غیر اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے....؟"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "میرے خیال میں اسلام میں اسلامی معاشرے یا اس قسم کی کسی چیز پر زور نہیں دیا گیا۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی فرد کی اصلاح کے لیے آیا۔ ہاں اگر سب افراد مومن ہو جائیں تو خود بخود مومنوں کا معاشرہ پیدا ہو جائے گا.... جہاں تک غیر اسلامی حکومت کی رکاوٹ کا تعلق ہے، میں یہی کہوں گا کہ جو لوگ پاکستان چلے گئے انہوں نے وہاں کونسا اسلامی معاشرہ قائم کر لیا ہے....!"

پروفیسر صاحب کے آخری جملے کی تلخی کے جواب میں مَیں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ایک بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ "سوال پر سوال کرنا علامتِ گستاخی ہے۔ آخر وہ بزرگِ دین ہیں، چُپ رہو"۔ چنانچہ مَیں چُپ ہو گیا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب کے بصیرت افروز وعظ کا شکریہ ادا کیا گیا اور وہ تشریف لے گئے ـــــ جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔

ہمارے ذہنی پَر نوچنے کے لیے یوں تو کئی اور ممتاز شخصیتیں آئیں، لیکن میں آخر میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔ میری مراد بیرونی تجارت کے مرکزی سیکرٹری مسٹر یونس سے ہے، جن کی ساری برادری پاکستان میں ہے۔ موصوف کے والد بزرگوار پنڈت جواہر لال نہرو کے ہم خیال اور دستِ راست تھے؛ چنانچہ قیامِ پاکستان سے ذرا پہلے نہرو ان کے گھر تشریف لائے، تو یونس صاحب کے والدِ بزرگوار نے یہ بچّہ انہیں بھینٹ کیا۔ نہرو نے اس کی سیاسی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ برِصغیر تقسیم ہوا تو اسے اعلیٰ عہدوں پر آزاد ہندوستان کی خدمت کے مواقع فراہم کیے؛ چنانچہ یونس صاحب کئی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں بھارت کے سفیر رہے۔

یونس صاحب کے آنے کی اطلاع ہمیں ان کی آمد سے ایک روز پہلے مل گئی؛ چنانچہ سارے کیمپ نے متفقہ طور پر ایک یادداشت تیار کر کے کیمپ کمانڈنٹ کے حوالے کی کہ خود بھی بصیرت حاصل کرے اور تحفۂ اسیراں کی نقلیں اپنے بڑوں کو بھی بھیج دے۔ یادداشت کی موٹی موٹی باتیں یہ تھیں کہ یونس صاحب

کی آمد سر آنکھوں پر، مگر انہیں ذرا ہدایت کر دی جائے کہ مندرجہ ذیل موضوعات کو نہ چھیڑیں، ورنہ ہم نقصِ امن کے ذمّہ دار نہ ہوں گے: بنگلہ دیش کی آزادی، بھارت کی امن پسندی، بھارتی مسلمانوں کی خوشحالی، بھارت میں سیکولرزم کا بول بالا، ہماری رہائی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ اور بھارت کی ترقی و عظمت وغیرہ۔ یعنی ان دُکھتی رگوں کو چھوڑ کر وہ اگر دلی سے آگرے تک اپنے سفر کا حال یا موسمی کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہیں، تو ہمارے کان حاضر ہیں۔

یونس صاحب تشریف لائے۔ وہ اپنے آبائی علاقے کی مناسبت سے مضبوط رگ و ریشہ کے پیکر تھے اور بھارت میں پروان چڑھنے کے طفیل بھارتی رنگ میں خوب رنگے ہوئے تھے۔ وہ انگریزی کے علاوہ اُردو، پنجابی اور پشتو بخوبی بول لیتے تھے۔ انہوں نے "السّلامُ علیکم" کے بعد کہا "میں یہاں تقریر کرنے نہیں، بلکہ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ کاش یہ ملاقات جیل کی دیواروں کے باہر ہوتی! بہرحال یہ دَور بھی ختم ہو جائے گا۔"

ان تمہیدی الفاظ کے بعد انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں اپنے کردار اور سیاسی اسیری کا ذکر کیا۔ پھر بھارت کی آزادی کے بعد اپنی سفارتی مہم پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ میں جس ملک میں بھی بطور سفیر اُترا سب سے پہلے میں نے وہاں پاکستان کے سفیر کا پتہ کیا، کیونکہ پاکستانی سفیروں سے گفتگو اور ملاقات میں مجھے بہت لُطف آتا ہے، کیوں نہ ہو، ہم ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں، بود و باش کے طور طریقے ایک سے ہیں۔ اقبال پر ہمارا (بھارت کا) بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا آپ کا غالب پر۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب کے ہم بھی اتنے ہی وارث ہیں، جتنے آپ ...."

جونہی اس نے موہنجوڈارو کے کھنڈروں میں قدم رکھا، گھات نشینوں نے اسے جا لیا۔ چار پانچ آدمی آدابِ محفل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بول پڑے۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ میں بھی پانچوں سواروں میں شامل ہو گیا۔ پتہ نہیں، دوسروں کے دلائل کیا تھے، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یہ چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی: "اگر ہمارے تہذیبی رشتے اتنے ہی گہرے ہیں تو پھر تقسیم

کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا یہ درست نہیں کہ ہندوانہ استحصال کے گھاؤ ان رشتوں سے کہیں گہرے ہیں؟ کیا یہ درست نہیں کہ بھارت نے خلوصِ دل سے آج تک پاکستان کو قبول نہیں کیا؟ بھارت پاکستان کی جارحیت کا بہانہ رکھ کر اپنے وسعت پسندانہ عزائم کی آبیاری کر رہا ہے۔ بھارت کی سرحدیں ایک طرف کوہ ہمالیہ کے دامن کو چھوتی ہیں اور دوسری طرف بحرِ ہند کی وسعتوں تک چلی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود بھارت کا دل چیونٹی کے دل سے بھی چھوٹا ہے۔ ننھے سے پاکستان پر بھارت کو ہڑپ کرنے کا الزام لگانا تنگ نظری اور تنگ دلی نہیں تو کیا ہے...؟"

پتہ نہیں میرے لیکچر کا کون سا حصہ یونس کے کانوں تک پہنچا اور کونسا شور و غل میں ڈوب گیا۔ بس جواباً اتنا سُنائی دیا کہ "میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا..." کسی نے بات کاٹی "بحث میں پڑنا نہیں چاہتے تو یہ ممنوعہ موضوع چھیڑا کیوں... ہم ایسے لیکچر سُن سُن کر تنگ آ چکے ہیں، ہم نہیں سُنیں گے، نہیں سنیں گے۔"

یونس نے ڈپلومیٹک قلابازی کھائی اور یک دم بے ضرر لطیفوں پر اُتر آیا اور جونہی فضا ذرا سازگار ہوئی، فوراً رفوچکر ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے پاس مشقِ سخن طرازی کے لیے کوئی نہ آیا۔

نفسیاتی جنگ کا یہ صرف ایک محاذ تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے دو اور محاذ قابلِ ذکر ہیں، یعنی بھارتی مطبوعات اور بھارتی فلمیں!

ہفت روزہ "آزادی اور جمہوریت" کا حال تو آپ نے پڑھ ہی لیا کہ یہ پرچہ بہ اہتمامِ خاص صرف ہمارے لیے سفید چکنے کاغذ پر چھپتا تھا۔ اس میں بھارت کے ممتاز مسلمانوں مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اس قسم کے اقوال ہوتے کہ "بھارت میں مذہب کی کوئی تمیز نہیں۔" "بھارتی آئین تمام باشندوں کو بلا امتیازِ نسل و مذہب آگے بڑھنے کا موقع دیتا ہے۔" اقوال کے علاوہ ہر شمارے میں کسی ہندو کی لکھی ہوئی نعتِ رسولؐ ہوتی جس کی اشاعت کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ رسولِ اکرمؐ کے عقیدت مند مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی ہیں، پھر کدورت کس بات کی! اس دو ورقی پرچے کے باقی صفحات پر کسی مشہور فلم ایکٹرس کی تصویر کے علاوہ بھارت کی ترقی و خوشحالی کی

قلمی تصویر بھی ہوتی۔ کہیں کہیں ایک آدھ مضمون پاکستان کی اقتصادی بدحالی اور معاشی ابتری کے بارے میں بھی ہوتا۔

"آزادی اور جمہوریت" کے خیالات و مقالات غیر سرکاری لب و لہجے میں عام بھارتی اخبارات میں بھی جلوہ گر نظر آتے۔ اردو کے اخبارات "پرتاپ" اور "ملاپ" ہوں یا انگریزی کے انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا۔ روزنامے ہوں یا ہفت روزے، ماہنامے ہوں یا سالنامے۔ سب ایک ہی نظریے کا پرچار کرتے۔ صرف لبادہ، وضع قطع اور رنگ مختلف ہوتا۔ ان سب کی جان بھارتی حکومت کے ہاتھ میں تھی اور یہ سب اپنے آقا کی آواز (HIS MASTER'S VOICE) بلند سے بلند تر سُر تال میں قارئین تک پہنچاتے۔

ان اخبارات کی خبروں اور تبصروں کا لب لباب کچھ اس طرح ہوتا کہ بھارت ایک عظیم ملک ہے، جس میں بھاری صنعتوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، ٹینکوں اور طیاروں کی تیاری اس رفتار سے چل رہی ہے اور ٹریکٹروں اور ریل کے ڈبوں کی ساخت کا کام اس نہج پر چل رہا ہے، پاکستان نے کھاد اور ٹریکٹر باہر سے منگوائے ہیں اور اتنا زرِمبادلہ خرچ کیا ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں° میں صورتِ حال قابو میں ہے اور پاکستان کے صوبوں میں گوریلا جنگ زوروں پر ہے، بین الاقوامی سطح پر ایران اور امریکہ نے پاکستان کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور چین نے بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مزاج کی دلیسی اور بدیسی خبریں ہم کہاں تک ہضم کرتے! آخر صبر اور قوتِ ہاضمہ کی بھی حد ہوتی ہے! چنانچہ ہم عموماً سرخیاں دیکھ کر اپنے مرغوب کالم یعنی مقامی اشتہاروں پر نظر جما لیتے۔ اس کالم کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو جملۂ معترضہ کے طور پر چند الفاظ اور بھی سُن لیجئے۔

ان کالموں میں "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہار خاصے لذیذ ہوتے۔ ہمارے اخبارات کی

° بھارت میں صوبے کو ریاست کہتے ہیں

طرح نہیں کہ رفیقِ حیات کی تلاش سے متعلق اشتہار کو بھی مشرف بہ اسلام کر کے پیش کیا جائے۔ جیسے صوم وصلوٰۃ کی پابند، امورِ خانہ داری میں ماہر خاتون کے لیے رشتہ درکار ہے۔ صرف سُنّی حضرات رجوع کریں۔ خط وکتابت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔ اس کے برعکس بھارتی اشتہار اتنے جاذب ہوتے کہ فوراً تعمیلِ ارشاد کو جی چاہتا۔

بھارت کے ان انگریزی اشتہارات کا اردو ترجمہ کیا جائے، تو کچھ یوں بنتا ہے "پنجاب کی ایک گوری — انیس سالہ کلونت کور — جو حال ہی میں برطانیہ سے سینئر کیمبرج کر کے آئی ہے لائف پارٹنر کی تلاش میں ہے۔ کلونت کور یورپی بودوباش، اعلیٰ سوسائٹی کے جملہ آداب اور اجنبیوں میں فوراً گھُل مل جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فلاں پتے پر فوراً رجوع کریں۔" یا "تلاش ہے ایک پتی کی لکھنؤ کی ایک ایسی کچی کلی کے لیے جو تبسم کی منتظر ہے۔ وہ ستار کے تاروں کو ہمراز بنا کر کسی صاحبِ ذوق کو دمساز بنانے کی خواہشمند ہے۔ فلاں پتے پر ضرور ملیے۔ امید ہے آپ کے ذوقِ سلیم کو تسکین کا سامان ملے گا۔"

ظالم اشتہار باز ستم یہ ڈھاتے کہ ضرورتِ رشتہ کے ساتھ والے کالم میں "کرایہ کے لیے خالی ہے" کا اعلان چھاپ دیتے اور بغیر کسی شرم وحیا کے لکھ دیتے کہ "بستر آرام دہ ہیں۔ ساتھ ہی صاف ستھرا غسلخانہ ہے جس میں صابن تولیے کا معقول انتظام ہے۔" کئی دفعہ ہماری خطا کار نگاہیں "کرایہ کے لیے خالی ہے" کا عنوان پڑھ کر یہ حروف چومنے لگتیں کہ "انیس سالہ کلونت کور جو برطانیہ ....."

ماہناموں میں صرف "بلیسویں صدی" خریدنے کو ملتا تھا۔ کبھی اس رسالے کی بہت شہرت تھی لیکن اب اس کی ادبی نگارشات بالکل پھسپھسی ہوتی ہیں اور سیکولرزم کا پرچار بہت موثر انداز میں ہوتا ہے۔ ایڈیٹر کے رشحاتِ قلم "اداریہ" اور "تیر ونشتر" اسی نظریے کے براہِ راست یا بالواسطہ پرچار کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ ہر شمارے میں خوبصورت چوکھٹوں میں مزیّن کر کے مُسلم اور غیر مسلم اکابر کے اقوال یوں پیش کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ تاثر ملے

کہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث ہو یا گرونانک کا فرمان، قرآنِ پاک کی آیت ہو یا توریت اور راماٗن کا فقرہ۔ سب آدمی کو انسان بنانے پر زور دیتے ہیں۔ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں، صرف وقت اور حالات کے مطابق لہجے، زبان اور انداز میں فرق آتا رہا ہے، یعنی لالہ وگل میں رنگ وبُو کا اختلاف سہی، لیکن دونوں کا پیام ایک ہے۔

چوکھٹوں کا نمونہ ملاحظہ ہو" دولت آئی، تو فحاشی ساتھ لائی، گئی تو رنج والم دے گئی"۔ (راماٗن) "شراب نہ پیو کہ یہ ناپاک کر دیتی ہے"۔ (توریت) "نیکی کیا ہے، شراب نوشی اور جھگڑے فساد سے بچنا"۔ (قرآن حکیم) ـــ (شمارہ اکتوبر ۱۹۷۳ء) **یا** "بدی سے بچو کہ یہ نیکیوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے"۔ (رسول اکرمؐ) "بدی کا پھل وقتی ہے بعد میں دُکھ کا باعث بن جاتا ہے"۔ (بابا گرونانک) "بدی سے بچنا اور دوسروں کے دلوں میں خوشی کے کنول کھلانا سب سے افضل ہے"۔ (مہاتما بُدھ) (شمارہ جولائی ۷۳ء)

اب چلتے چلتے بھارتی فلموں پر بھی ایک نظر ڈالتے جائیے۔

△ "تیری صورت میری آنکھیں"؛۔ ہندو والدین اپنے نوزائیدہ روسیاہ بچے (اشوک کمار) کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، تو ڈاکٹر یہ بچّہ ایک بے اولاد مسلمان طالب حسین کے حوالے کر دیتا ہے۔ بچّہ بڑا ہو کر گلوکار بن جاتا ہے۔ایک دن یہ اپنے "باپ" طالب حسین سے جُدا ہو کر مندر میں گھُس جاتا ہے اور مورتیوں کو عقیدت سے دیکھنے لگتا ہے۔ایک مورتی کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ گر جاتی ہے۔مندر کے پجاری "چور، چور" پکارتے اسے پکڑ لیتے ہیں اور زدوکوب شروع کر دیتے ہیں۔اتنے میں طالب حسین آپہنچتا ہے۔وہ کہتا ہے "اسے کچھ نہ کہو، یہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان، اس کا دھرم انسانیت ہے۔یہ دھرم کی گروہ بندیوں سے ناواقف ہے۔اسے چھوڑ دو"۔

△ "پالکی"؛۔ اس فلم میں ہیروئن پالکی میں بیٹھی جا رہی ہوتی ہے۔ایک چوک سے گزرتے وقت گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے کی صدا آتی ہے۔ اگلے چوک میں اذان کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ایک کردار تبصرہ کرتا ہے: "کیا گرجا کی منادی اور کیا مؤذن کی اذان، سب کا پیغام ایک ہے، سب

ایک طرف ہی دعوت دیتی ہیں — اصلاح کی دعوت!"

△ "میرا محبوب": دو دوست آپس میں اپنے اپنے معاشقے کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک کی محبوبہ مسلمان ہے، دوسرے کی ہندو۔ مسلمان محبوبہ کے عاشق سے اس کا دوست پوچھتا ہے "سناؤ یار! تمہاری اُوئی اللہ کا کیا حال ہے؟" دوسرا کہتا ہے "تم بتاؤ، تمہاری ہائے رام کیسی ہے؟" گویا "اُوئی اللہ" اور "ہائے رام" کے الفاظ مختلف ہیں، دل سب کا ایک جیسا ہے، عشق کی واردات سے سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ عشق ہندو یا مسلمان میں تمیز نہیں کرتا۔ پھر تفرقہ کس بات کا!

△ "آنند" کا ہنس مکھ ہیرو (راجیش کھنّہ) سرطان کا مریض ہونے کے باوجود اپنی زندہ دلی برقرار رکھتا ہے اور جدھر جاتا ہے مسکراہٹیں بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ جس سے ملتا ہے، اس کے دل میں خوشی کے پھول کھلا جاتا ہے۔ جس راہ سے گزرتا ہے، اسے کہکشاں بنا جاتا ہے۔ اس کے مدّاحوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سبھی شامل ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب وہ مرض کے ہاتھوں بستر مرگ پر لیٹ جاتا ہے تو اس کا مسلمان دوست مسجد میں جا کر اس کی صحت یابی کی بھیک مانگتا ہے۔ اس کے ہندو دوست کی بیوی پوجا پاٹ کے بعد بھگوان سے اسے صحت عطا کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ ہسپتال کی میٹرن (MATRON) گلے میں صلیب کا نشان ڈالے گرجا میں التجائے مسیحائی میں مصروف ہو جاتی ہے — گویا آدمی اچھا ہو تو مذہب کو کوئی نہیں پوچھتا!

یہ موضوع خاصا طویل ہے اور مختلف فلموں کا اس نقطۂ نظر سے یہاں تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ بس مشتے از خروارے والی بات ہے۔ آئیے اب آخر میں کلچرل شو کا اجمالی خاکہ دیکھ لیجئے، پھر چھٹی!

۲۶ مئی ۱۹۷۳ء کو صبح سویرے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ بھئی دن کو خوب سولیناً رات کلچرل شو ہے۔ اس خصوصی عنایت کی غرض و غایت فوری طور پر ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ایک رجائیت پسند ساتھی نے اندازہ لگایا کہ ہم جلد وطن واپس جانا چاہتے ہیں، اس لیے ہمارے

آقا نے ہماری روانگی سے قبل اپنے ستم کے سارے داغ دھونے کے لیے اس شو کا اہتمام کیا ہے اس پر ایک محبِ وطن بھڑک اٹھا "اگر یہ بات ہے تو ہمیں اس شو کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ داغ دھونے اور چاک رفو کرانے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہی داغ، یہی چاک ہماری اسیری کا سرمایہ ہیں۔ ہمیں یہ نشانات صحیح و سالم لے کر پاکستان جانا چاہیے"۔

لیکن اس محبِ وطن کے مشورے پر عمل کرنے میں دو باتیں حائل تھیں۔ ایک تو اس پروگرام میں نعتوں اور قوالیوں کا عنصر شامل تھا، جسے نظر انداز کرنا سراسر لذتِ سماع اور تطہیرِ روح سے محروم رہنے کے مترادف تھا۔ دوسرے یہ کہ پروگرام جوانوں کے کیمپ میں ہو رہا تھا۔ پروگرام کے طفیل ان کو ذرا دیکھ لیں گے۔ میرے لیے اس تواضع کا اضافی پہلو یہ بھی تھا کہ شاید اسی بہانے بھارت کی کوئی نئی ادا دیکھنے کا موقع مل جائے۔

چنانچہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہم شام کی نماز اور کھانے کے بعد جوانوں کے کیمپ میں گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا، تمام جوان بیرکوں سے نکل کر تنگ صحن میں سمٹ آئے تھے۔ ان کے اردگرد خاردار باڑ تھی۔ ہم نے تار میں سے ہاتھ ڈال کر ان سے ہاتھ ملایا اور خیریت دریافت کی۔ وہ سب زمین پر بیٹھ گئے اور ہم باڑ کے باہر بنچوں پہ۔ ہمارے بالمقابل بھارتی افسروں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں۔ وسط میں اونچی جگہ کلچرل شو کے لیے مخصوص تھی۔ فنکار سٹیج سے پیچھے گارڈ روم میں بیٹھے تھے۔

سٹیج پہ دری بچھی تھی اور دو لاؤڈ سپیکر موجود تھے۔ ایک اونچا اور دوسرا نیچا —— پہلا اعلانات کے لیے اور دوسرا فنکاروں کے استعمال کے لیے۔

اس ثقافتی طائفے کے ارکان ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، پنجابی بھی تھے اور اہلِ زباں بھی، عوامی گویّے بھی تھے اور مشّاق رقّاص بھی۔ ان سب کی باگ ڈور ایک گھاگ سکھ کے ہاتھ میں تھی، جس نے آغازِ تقریب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں پرانا آئی سی ایس (I.C.S.)° ہوں۔

° انڈین سول سروس، ہماری مرحوم "پاکستان سول سروس" کا متبادل۔

حال ہی میں کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں، میرا نام کنور مہندر سنگھ ہے۔ شوقیہ شاعری اور بیدی تخلص کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ قیدیوں کی شامیں بوجھل ہوتی ہیں، لہٰذا میں نے آپ کی تفریحِ طبع کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا ہے!"

ارادہ بہت نیک تھا۔ الفاظ اور لہجہ بھی میٹھا تھا۔ حیرت ہوئی کہ بھارت میں یہ نوازش، یہ کرم کیا معنی؟ بے اختیار داد دینے کو جی چاہا، لیکن خرد نے دامن تھام کر مشورہ دیا کہ ایسی بھی کیا جلدی، ذرا تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔

بیدی نے ہمارے دل موہنے کے لیے تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے کرایا اور تلاوت کے دوران خود پیٹ پر ہاتھ باندھے، سر گریبان میں ڈالے، مؤدب بیٹھا سنتا رہا اور وقفے وقفے سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتا رہا۔ ہم اسے ایکٹنگ سمجھے، لیکن اس کے بعد اس نے اپنی ہی لکھی ہوئی نعتِ رسول سنائی۔ الفاظ خوب تھے اور ادائیگی خوب تر۔ یا الٰہی یہ سکھ کب مسلمان ہو گیا؟ غالباً ہمارے تعجب کو دور کرنے کے لیے ہی اس نے کہا "رسول اللہ پر مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں، وہ کامل انسان تھے، اور کامل انسان خواہ کسی بھی مذہب سے ہو، قابلِ تعظیم ہے، اس کی تقلید ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ میں نے یہی نہیں، کئی نعتیں خلوصِ دل سے لکھی ہیں اور مسلمانوں کو سنا کر داد پائی ہے۔ ذرا سنیئے تو، عرض کیا ہے۔۔۔۔"

ہمارے مذہبی جذبات کو گرما کر اس نے فضا سازگار کر لی۔ پھر وہ اپنی ذات کے واسطے سے تقسیم سے پہلے کی یادیں دہرانے لگا "میں جب لائل پور میں تھا تو مسلمان دوستوں سمیت گنّے کے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ خوبصورت بھینسوں کا منوں دودھ پینے کو ہوتا تھا، پنجاب کی دھرتی کے سینے پر چلنے والے گبرو جب شاماں آلی ڈانگ○ کندھے پر رکھ کر نکلتے تو سلسلۂ کائنات ان کی زیارت کرنے کے لیے تھم جاتا۔ آئیے نا، ذرا جوگی صاحب● اپنی مشہور نظم "میرا سوہنا دیس پنجاب"

○ خوبصورت سجیلی لاٹھی جس کے بند بند پر چمکدار پیتل چڑھا ہوتا ہے۔

● یہ شاعر کا اصلی نام نہیں۔

سُنائیے:-"

اس کے بعد ایک غیر پنجابی شکل وصورت کے شخص نے مریضانہ لہجے میں پنجابی مٹیاروں کے الھڑ جوبن، رہٹ کی موسیقی اور شاداب کھیتوں کی بھرپور جوانی کا ذکر کیا ۔ اور شاعرانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر خیالی داد وصول کی اور سٹیج سے اُتر گیا۔

بیدی پھر سٹیج پر آیا اور کہنے لگا "ہمارا یہی خوبصورت دیس پنجاب اب سیاسی حدوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ طرح طرح کی پابندیوں نے ہمارے جذبات کے دھاروں کو جکڑ رکھا ہے، لیکن یہ پابندیاں دائمی نہیں، یہ جذبات اور رشتے دائمی ہیں۔ (گویا وہ پھر زہریلا ٹیکہ لگا گیا) لیکن چھوڑئیے ان باتوں کو۔ آئیے ایک نوعمر لڑکے کا رقص دیکھئے۔ یہ لڑکا اور اس کا فن پشاور سے لیکر آگرے تک مقبول ہے۔ کیوں نہ ہو؟ فن کی کوئی جغرافیائی حدیں نہیں ہوتیں۔ (دوسرا ٹیکہ) آ بھئی برخوردار ذرا ہو جائے خٹک ڈانس ..."

اس کے بعد ایک گورا چٹا لڑکا سٹیج پر آیا اور پھدک پھدک کر واپس چلا گیا۔ اس طرح باری باری بیدی نے سامعین کے صوبائی جذبات اُبھارے، پھر کبھی پنجابی گیت اور کبھی پشتو گانے سے انہیں تسکین بخشی اور جہاں کہیں موقع ملا کوئی نہ کوئی زہریلی گرہ لگا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب میں کوئی قدرِ مشترک نہیں، بلکہ بھارت اور پاکستان میں ثقافتی اشتراک زیادہ ہے۔ شاعری اور رقص کے علاوہ دو تین قوالیاں اور دو ایک نعتیں بھی ہوئیں اور یہ محفل کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی۔

پھر کسی اعلان کے بہانے بیدی سٹیج پر آیا تو کہنے لگا "بھارتی مسلمانوں میں سے ایک مرکزی وزیرِ تعلیم (مولانا ابوالکلام آزاد) اور دوسرا صدرِ مملکت (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے عہدے پر فائز رہا۔ اس کے علاوہ بیشمار مسلمان اعلیٰ ملازمتوں میں ہیں۔ (ایک اور ٹیکہ) لیکن میں یہاں سب کا ذکر کرنے کی بجائے صرف ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذکر کروں گا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ ان کے جنازے میں ہندو بھی شامل تھے اور عیسائی بھی۔ وہ بھارت کی ایک مقبول شخصیت

تھے۔ وہ تنگ مذہبی نظریوں سے بہت بلند تھے۔ وہ اس رُتبے پر پہنچ چکے تھے جہاں انسان کا سوائے انسانیت کے کوئی مذہب نہیں رہ جاتا اور ہم سب کو انسانیت کی اس معراج تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے (ایک اور ٹیکہ)"

جب بیدی سٹیج سے اترتا تو بھارتی افسروں کے پاس کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ہمارے پاس بنچ پر آبیٹھتا اور وہ بھی ایسی یگانگت سے کہ گویا برسوں کی دوستی ہے۔ کبھی بے تکلفی سے وہ کسی کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیتا اور کبھی کسی کے شانے پر دستِ شفقت رکھ کر اسے زیر کرتا۔ وہ پورا گھاگ تھا اور گرگ بھی۔ وہ فوراً اپنے مخاطب کی کمزور رگ کی شناخت کرتا اور پھر اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ایک گھنٹے میں نقصان پہنچانے کی جتنی کوشش کی، باقی مقرر شاید دو سال میں نہ کر پائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ریگِ دریا کی طرح بے بس پڑے ان کے نقوش قبول کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آبِ رواں پر تیر چلانے کی یہ بھارتی کوشش سراسر بے نقش اور بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ہم اس ساری کارگزاری کی ماہیت سے آگاہ تھے۔ ہمیں احساس تھا کہ ہر شیریں کلام کے پیچھے فلاں تھیم (THEME) ہے۔ اگر ایسی کوششوں نے ہم پر چند نقوش چھوڑے بھی تو وہ نفرت کے نقوش تھے ــــ بیزاری اور تعفن کے نقوش۔

کلچرل شو کے بعد بھی لوگ بیدی کے زہر آلود ٹیکوں کا ذکر کر رہے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ ثقافتی شو کا یہ ڈھونگ ختم کیا جائے۔ اگر آئندہ ہمیں ایسی "مئے ہوشربا" پلانے کی کوشش کی گئی تو ہم جام و سبو توڑ ڈالیں گے، میکدہ تاراج کر دیں گے۔

اس کے بعد نہ کوئی بیدی ثقافتی طائفہ لیکر ہماری شاموں کا بوجھ ہلکا کرنے آیا اور نہ کوئی یونس حقِ نمک خواری ادا کرنے پہنچا؛ البتہ بھارتی اخبار اور رسالے آتے رہے، لیکن وہ ہمارے ذہنی حصار میں کوئی شگاف نہ ڈال سکے۔ ان کی یلغار سے ہمارا کوئی طاق ٹوٹا نہ سنگ پھوٹا ــــ وہ تیر اندازی کرتے رہے اور ہم اندر قلعہ بند ہو کر ان کی کوششِ رائیگاں پر مسکراتے رہے۔

آئینِ جوانمرداں

دو سال میں ہمارے ذہنی پَر نوچنے کی بھارتی کوششوں نے ہمیں مفلوج کرنے کی بجائے ہمارے شوقِ پرواز کو اور ہوا دی۔ یہ باب پرواز کی ایسی ہی کوششوں کے لیے وقف ہے۔

ہمارے کیمپ میں ایسے آتش بجاں پروانوں کی کمی نہ تھی جو شمعِ آزادی پر نثار ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان پروانوں کو اس کی پروا نہ تھی کہ جیل میں حفاظتی انتظامات نسبتاً بہت سخت ہیں، انہیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ فرار کی کوشش کے دوران گولی چل گئی تو کئی جانیں تلف ہو جائیں گی۔ یہ حقیقت بھی ان کی کمر توڑنے کے لیے کافی نہ تھی کہ ناکام "مفروروں" کی بھارتی سزا موت سے بدتر ہوتی ہے، کیونکہ بھارت میں ایسی سزا کا تعین کرنے میں جنیوا کنونشن کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بس ان کو تو یہ معلوم تھا کہ فرار ہونا قیدی کا فرض ہے اور فرض کی تکمیل میں جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں!

یہ فرہاد جن کے سینے شررِ تیشہ سے روشن تھے، ہر قیمت پر جوئے آزادی کھودنے کے لیے تیار تھے، چنانچہ شروع ہی سے انہوں نے در و دیوارِ زنداں سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے اس کے رگ و پے کو ٹٹولنا شروع کر دیا کہ کس سنگ یا خشت کو کہاں سے ہاتھ ڈالا جائے تو یہ راستہ دے دے گا۔

اس جاں نثار گروہ کے سرخیل میجر راٹھور تھے جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔ انہوں نے منصوبہ بندی کے ماہر کی طرح پہلے ضروری کوائف اکٹھے کیے، پھر خاکہ بنایا۔ پھر ان میں تفصیلات کا رنگ بھرا اور آخر میں ان پر عمل درآمد شروع کیا۔

بنیادی اطلاعات جو انہوں نے جمع کیں وہ یہ تھیں کہ دارالامراء کی بجائے دارالعوام اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے، کیونکہ وہاں فرش کچے، سنتری ڈھیلے اور روشنیاں مدھم ہیں۔ اس کے علاوہ کیمپ کا عملہ یا کمانڈنٹ اس طرف توجہ کم دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کوشش تھی کہ ادھر سے باہر کی دنیا صرف دو سو فٹ دُور پڑتی تھی۔ یہ سب عوامل حوصلہ افزا تھے۔

ان سہولتوں کے برعکس مشکلات کئی تھیں۔ سرنگ کھودنے کے اوزار کہاں سے آئیں گے، سینکڑوں ٹن مٹی کہاں چھُپائی جائے گی، سرنگ کے اندر روشنی اور ہوا کا کیا بندوبست ہوگا۔ بیگانوں اور یگانوں سے یہ راز، راز کیسے رکھا جائے گا — سرنگ نکل بھی آئی تو پوری پارٹی کے لیے پی ڈبلیو (PXW) کی چھاپ کے بغیر کپڑے کہاں سے آئیں گے، زادِ راہ کے طور پر بھارتی کرنسی کا انتظام کہاں سے ہوگا، بارڈر تک پہنچ بھی گئے تو مورچہ بند فوجوں کی موجودگی میں سرحد کیسے پار کریں گے۔ غیروں سے جان بچائی تو کہیں اپنے ہی بھارتی ایجنٹ یا سمگلر سمجھ کر ٹھُس نہ کر دیں!

سُرنگ کھودنے کے اوزاروں کی تلاش شروع ہی سے جاری تھی۔ اس سلسلے میں ہماری مدد خود کیمپ کے حکّام نے کی۔ وہ مزدوروں کی کئی پارٹیاں وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے جن کا کام ہماری بندشوں کو مضبوط تر بنانا تھا۔ ایک دفعہ ایک پارٹی اس کام کے لیے آئی کہ دیواروں کو پلستر کر دے تاکہ کہیں پاؤں کا انگوٹھا نہ اٹک سکے۔ دوسری پارٹی اس کام پر مامور تھی کہ خاردار باڑ کے کمزور حصّوں کو مضبوط کر دے۔ تیسری پارٹی پانی کے نکاس کو ٹھیک کر رہی تھی تاکہ کوئی قیدی گندے پانی کے ساتھ باہر نہ بہہ جائے۔

ہم مختلف اوقات میں آنے والی ان پارٹیوں کے اوزار چھپا دیتے جس پر شروع شروع میں بہت ہنگامہ ہوتا، مزدوروں پر ان کی بے توجہی کے جرم میں لعن طعن کیا جاتا۔ قیدیوں کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ بیرک کی ہر چیز کا دامن ٹٹولا جاتا، لیکن گمشدہ چیز کی بازیابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی۔ جب مزدوروں کو یہ دھمکی دی گئی کہ آئندہ کوئی اوزار گم ہوا تو انہیں نوکری سے

نکال دیا جائے گا تو انہوں نے اوزاروں کی گمشدگی کی اطلاع دینی بند کردی۔ یوں پہلے دو تین مہینوں ہی میں ضرورت کے سارے اوزار ہمارے ہاتھ لگ گئے۔

مٹی چھپانے کا مسئلہ بھی خود کیمپ والوں نے حل کر دیا۔ انہوں نے ہمارے واویلے اور احتجاج سے مجبور ہو کر فلش (FLUSH) لگوا دیا، جس کے ساتھ پانی گرانے کا کوئی انتظام نہ تھا، لیکن گندگی چھپانے کے لیے تین کنویں ضرور کھدوا دیے گئے۔ میجر راٹھور نے ہدایت کی کہ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے صرف ایک کنویں پر گزر اوقات کی جائے اور باقی دو کنویں مٹی چھپانے کے لیے خالی رکھے جائیں — کنویں اوپر سے بند تھے، اس لیے کسی کو پتہ نہ چل سکتا تھا کہ ان کے پیٹ خالی ہیں یا بسیار خوری کا شکار ہیں۔

رہا سُرنگ کے اندر ہوا اور روشنی کا بندوبست تو اس کا بہت آسان حل ڈھونڈا گیا۔ سُرنگ کے اندر لمبا تار اور بجلی کا بلب لے جانے کی بجائے یہ طے پایا کہ جب ضرورت پڑے سُرنگ کے منہ پر شیشے یا چمکدار ٹین کے ٹکڑے کی مدد سے سورج کی شعاعیں منعکس کر کے اندر پھینکی جائیں، گویا جب ضرورت پڑے، چاند کی طرح سورج سے روشنی مستعار لے لی جائے۔

اندر ہوا پہنچانے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ دھونکنی کی مدد سے ہوا اندر پمپ کی جائے، لیکن یہ نسخہ اسی حد تک کارگر تھا کہ سُرنگ زیادہ طویل نہ ہو اور سیدھی چلتی رہے جہاں اس نے بل کھایا، ہوا کا راستہ رُکنے کا احتمال تھا؛ چنانچہ طے ہوا کہ مناسب وقفوں پر سُرنگ کی چھت میں سوراخ کر دیے جائیں جو اوپر سے چوہوں کے سوراخ لگیں، لیکن براہِ راست اندر ہوا لے جانے کے لیے کافی ہوں۔

فرار ہونے والوں میں سے ہر ایک کو یہ ڈیوٹی سونپ دی گئی کہ وہ چھاپ سے پاک کپڑوں اور بھارتی کرنسی کا خود بندوبست کرے، چنانچہ کسی نے بھارتی عملے کو رشوت دے کر نئے کپڑے منگوا لیے، کسی نے پرانے کپڑوں سے آفٹر شیو لوشن (AFTER SHAVE LOTION) کی مدد سے پی ڈبلیو کے نشان مٹا لیے، کسی نے کپڑوں پر پکّی چھاپ لگوانے کی بجائے بوٹ پالش

سے پی ڈبلیو لکھ لیا تاکہ وقتِ ضرورت اسے صابن سے دھو کر صاف کیا جا سکے۔

بھارتی کرنسی کے تین ذرائع تھے۔ بعض دُور اندیش حضرات نے دسمبر ۱۹۷۱ء ہی میں شکست خوردہ کرنسی کے سو روپے دے کر فاتح کرنسی کے بیس پچیس روپے حاصل کر لیے تھے۔ کئی خوش قسمت لوگوں نے اپنی ذاتی املاک کو لوٹ کھسوٹ سے بچا کر سستے داموں بھارتی افسروں اور جوانوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور جن بیچاروں کو جیل میں پہنچنے سے پہلے ایسا کوئی موقع نہ ملا تھا، انہوں نے بھارتی گارد کے ہاتھ کمبل یا جرسی سستے داموں بیچ کر ریل کا کرایہ اکٹھا کر لیا تھا۔ رہا بھارتی کرنسی اور کپڑوں کا چھپانا، تو جہاں سینکڑوں ٹن مٹی ٹھکانے لگائی جا سکتی تھی، وہاں چند کاغذ یا پارچے سنبھال کر رکھنا کون سا مشکل کام تھا!

جیل سے نکلنے کے بعد سرحد پار کرنے اور اپنے اپنے گھر پہنچنے کا مفصل منصوبہ ہر "کامیاب مفرور" کی اپنی ذمہ داری تھی۔ ایک کے منصوبے کا دوسرے کو علم ہونا تشویشناک تھا، کیونکہ اگر ایک شخص پکڑا جاتا، تو ناقابلِ برداشت سزا بھگتتے وقت دوسروں کے راز افشا کر دینے کا امکان تھا، لہٰذا ہر ایک نے اپنا منصوبہ تصورِ یار کی طرح سینے سے لگائے رکھا؛ البتہ ان میں سے چند ایک نے دوسرے کو بتائے بغیر اپنے اپنے منصوبے کا اس شرط پر مجھ سے ذکر کیا (میں بھاگنے والوں میں شامل نہ تھا)، کہ کسی دوسرے سے ذکر نہ کروں گا، لیکن آپ سے کیا پردہ؟

ایک افسر کا ارادہ تھا کہ جیل سے نکلنے کے فوراً بعد وہ سرحد کا رُخ نہیں کرے گا، بلکہ آگرہ شہر کی بھول بھلیوں میں کھو جائے گا اور جب بھارتی "کُتّے" اور فوجی تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے، تو وہ آرام سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو جائے گا۔ ایک اور صاحب کا اندازہ تھا کہ فرار کی کوشش کے فوراً بعد آگرہ شہر کی ناکہ بندی ہو جائے گی، اس لیے وہ فوراً آگرے سے نکل کر مغرب کا رخ کرنے کی بجائے مشرق کو چلا جائے گا کیونکہ اس طرف دشمن کی توجہ کم ہو گی۔ تیسرے صاحب نے کہا کہ میں سیدھا بمبئی جاؤں گا جہاں کچھ دن محنت مزدوری کرنے کے بعد اتنی رقم اکٹھی کر لوں گا کہ کسی ایجنٹ کے ذریعے خلیج فارس کو جانے والے بحری جہاز میں سوار ہو سکوں۔ آخر میں ایک

باہمت نے سارا قصّہ ہی مختصر کر دیا۔ اس نے کہا" دلّی یہاں سے ستّر میل پڑتا ہے، وہاں پہنچ کر ائر انڈیا کا کوئی بھی طیارہ اغوا (HI-JACK) کر کے سیدھا لاہور یا اسلام آباد ائر پورٹ پر اُتر جاؤں گا۔"

یہ محض اشارے تھے۔ دراصل کوئی بھی اپنے منصوبے کی جزئیات سے مجھے آگاہ نہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے فرار ہونے کے بعد مجھے سزا دے کر کہیں یہ راز اُگلوا نہ لیے جائیں۔

جب منصوبہ بندی کے موٹے موٹے خطوط متعیّن ہو چکے تو بیرونِ دیوارِ زنداں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ سنتری سے کبھی اجازت لے کر اور کبھی اس کی آنکھ بچا کر ریکی (RECCI)° کرنے درخت پر چڑھ جاتے۔ بہانہ یہی ہوتا کہ مسواک توڑنی ہے۔ پتّوں کی آڑ میں ہاتھ مسواک توڑتے رہتے اور نگاہیں مشاہدے کے خوشے چُنتی رہتیں۔ درخت سے اُترتے اُترتے ہاتھ بھی بھرپور ہوتے اور نگاہیں بھی۔ ریکی پارٹی (RECCI PARTY) درخت سے اُتر کر توڑی ہوئی شاخیں لنگر میں پہنچا دیتی اور قوتِ مشاہدہ سے اکٹھی کی ہوئی سوغات کمانڈر کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔ یہ معلومات کچھ اس نوعیّت کی ہوتیں کہ پہلی دیوار کے پار پہرے داروں کے خیمے اور کُتّوں کی روشیں ہیں، سطحِ زمین رینگنے (CRAWLING) کے لیے سازگار نہیں، کیونکہ اس میں خودرَو کانٹے ہیں، جہاں کانٹے نہیں وہاں خاردار تار کے فالتو گچھے ہیں۔ آخری دیوار کی جلد صاف اور ہموار ہے، یعنی اس میں پاؤں اڑا کر اوپر چڑھنے کا امکان کم ہے۔ دیوار پر جابجا سفیدی کی گئی ہے، تاکہ رات کو سفید بیک گراؤنڈ (BACKGROUND) میں آدمی کا جسم یا سایہ بآسانی نظر آ سکے — گویا دیواریں پھلانگنا خودکشی کو دعوت دینا ہے، لہٰذا سُرنگ ہی فرار کا واحد ذریعہ ہے۔ دونوں دیواروں کا درمیانی فاصلہ بمشکل دو سو فٹ ہے۔ آگے پیچھے پچیس پچیس فٹ کا اضافہ کر لیا جائے تو سُرنگ کی کُل لمبائی ڈھائی سو فٹ ہوگی۔

میجر راٹھور نے سُرنگ کی گہرائی اور چوڑائی کو ڈھائی سو سے ضرب دے کر مٹّی کا مکعب فٹوں

° (RECONNAISSANCE) فوجی نقطۂ نگاہ سے کسی علاقے کو پرکھنا

میں اندازہ لگایا۔ پھر دونوں خالی کنوؤں کا رقبہ نکالا اور حساب کی مدد سے اس قیاس کی تصدیق ہوئی کہ سُرنگ کی مٹّی فلش کے کنویں ہضم کرلیں گے۔

منصوبہ بندی کی جزئیات طے ہوگئیں تو اللہ کا نام لے کر کھدائی شروع کی گئی۔ پہلے کنوئیں کی شکل میں دس فٹ گہرا گڑھا کھودا گیا، تاکہ سرنگ سطحِ زمین سے اتنی نیچے رہے کہ درختوں کی جڑیں اور فصیلوں کی گہری بنیادیں حائل نہ ہوں۔

کھدائی کے وقت ایک پارٹی مٹّی کھودتی، دوسری اسے ٹھکانے لگاتی اور تیسری سیکورٹی کا خیال رکھتی، یعنی موخر الذکر کا کام یہ ہوتا کہ جونہی کوئی خطرہ جاگے گا وہ مقرر کردہ کوڈ (CODE) کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرے گا اور وہ بر وقت سُرنگ کا منہ بند کر کے متوقع معترض کا منہ بھی بند کردیں گے۔

کھدائی ہوتی رہی، نرم دل مٹّی باہمت ہاتھوں کے سامنے بے بس ہوکر گرتی رہی اور جواں سال ہاتھ اس مُردہ مٹّی کو اندھے کنویں میں دفن کرتے رہے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔ سُرنگ روز بروز ترقی کرتی رہی۔

سُرنگ کا نام اللہ رکھی تھا، لہٰذا اس کے متعلق ساری گفتگو اسی نام کی نسبت سے ہوتی۔ اس کا کوئی بھی خواہ پوچھتا کہ "اللہ رکھی کا کیا حال ہے؟" جواب ملتا "ماشاءاللہ عنفوانِ شباب میں قدم رکھ رہی ہے، بڑی ظالم جوانی ہے، نظرِ بد دُور!" کوئی پڑوسی پوچھتا "کیسی طبیعت ہے اللہ رکھی کی؟" جواباً عرض کیا جاتا "بالکل تندرست ہے۔ اکثر پیار سے گِلہ کرتی ہے کہ کئی دن سے چچا جان ملنے نہیں آئے۔" چچا جان سمجھ جاتے کہ کھُدائی کے لیے ان کی خدمات درکار ہیں۔

سرنگ سے تعلق رکھنے والوں کی یاددہانی کے لیے میجر راٹھور نے اس کے دہانے پر دو بورڈ لگا رکھے تھے۔ ایک بورڈ پر جس کا رُخ باہر کی طرف تھا، لکھا تھا "لاہور۔ تین سو ستّر میل۔ دو سو فٹ" (دو سو فٹ سُرنگ کھودنی باقی تھی)، دوسرے بورڈ کا رُخ جیل کے اندرونی علاقے کی طرف تھا اور اس پر لکھا تھا "سیل۔ صرف دو سو گز۔"

سرنگ کھودنے والے دو سو گز دُور سیلوں میں قیدِ تنہائی کے امکانات کو نظر انداز کر کے واہگہ کی طرف تیشے چلاتے رہتے۔ وہ تیشے کی ہر ضرب کے ساتھ محسوس کرتے کہ ہم ایک قدم اور شیریں کے قریب ہو گئے ہیں۔ ہر سانس جو وہ سُرنگ کے اندر لیتے، انہیں نوید سُناتی کہ ہجر کی ایک اور گھڑی کم ہو گئی۔ وہ متواتر کوہکنی میں مصروف رہے۔

ایک دن سرنگ بڑھتے بڑھتے فلش کے گٹر (GUTTER) میں جا اُلجھی۔ گندہ پانی دوسری غلاظت سمیت اندر آنے لگا۔ دل بیٹھنے لگا کہ ابھی سُرنگ بیٹھ جائے گی اور اس میں کام کرنے والے زندہ درگور ہو جائیں گے۔ احتیاطاً کھدائی کرنے والوں کو باہر بُلا لیا گیا۔

جانیں بچانا ضروری سہی، لیکن اچھی بھلی، پلی پوسی ایک سو پینتیس فٹ لمبی سُرنگ کو یوں اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھنا بھی مشکل تھا۔ میجر راٹھور کی یہ ویسے بھی چہیتی تھی۔ ان سے یہ جواں سال مرگ نہ دیکھی گئی۔ انہوں نے کپڑے اُتار کر ایک طرف پھینکے اور اپنے مُٹھی بھر جسم پر ایک انڈروئر (UNDERWEAR) اور عینک سجا کر اس میں کُود گئے، بالکل جیسے کوئی عاشق آتشِ نمرود میں کودتا ہے۔ ان کے پیچھے ان کے جانباز ساتھی بھی موت کی وادی میں اُتر گئے اور نہتّے ہاتھوں پانی اور غلاظت کے اجتماعی حملے کی روک تھام میں لگ گئے۔ پانی کے بہاؤ میں تیزی اور غلاظت میں ناقابلِ برداشت سڑاند تھی، لیکن یہ کبھی ایک ہاتھ ناک اور منہ پر رکھ کر اور کبھی دونوں ہاتھ پانی میں ڈبو کر شگاف بند کرنے میں لگے رہے۔ کچھ دیر بعد یہ فاتحانہ انداز میں گندگی میں لتھڑے ہوئے سُرنگ سے نکلے اور اس غواصی کے نتیجے میں خوشخبری کا درِ شہوار لائے کہ سُرنگ بچا لی گئی ہے ___ شکر الحمد اللہ! شکر الحمد اللہ!

میجر راٹھور نے سُرنگ کا رُخ ذرا تبدیل کر کے دوبارہ کھدائی شروع کرا دی اور "اللہ رکھی" ایک بار پھر راہِ شباب پر گامزن ہو گئی۔ ہر طرف سے اس کی نشوونما پر مبارکبادیں آنے لگیں۔

اب کھدائی بیرونی فصیل کے قریب پہنچنے والی تھی۔ متعلقہ حضرات بیقراری سے درخت پر چڑھ کر مسواک توڑتے اور باہر کا حال دیکھتے کہ گشت کرنے والے سنتری کی رائفل یا کُتّے کے

پنجے کسی مشکوک حصّے کو تو نہیں کرید رہے، کسی کو زمین کے پیٹ میں جوان ہونے والی سرنگ کا شک تو نہیں گزرا۔ جب سنتری حسبِ معمول فلمی گانوں سے جی بہلاتا نظر آتا اور کتا حسبِ دستور ایک خیمے سے دوسرے خیمے کی طرف دوڑتا دکھائی دیتا، تو تسلّی ہو جاتی کہ "سب نارمل ہے"۔

ایک ہفتے بعد اللہ رکھی کو ایک اور حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ یہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی زیرِ زمین کسی گندے نالے میں جا گری، جوان تھی، اندھی تھی، انتہائے شوق میں احتیاطوں کو نظر انداز کر کے ایک ایسی حرکت کر بیٹھی جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ جونہی پانی کے دباؤ نے اس کا گلا دبایا، اوپر سے منوں مٹّی اس کے معصوم جسم پر گری اور یہ چپ ہو گئی۔ گشت کرتے سنتریوں نے یوں اچانک زمین کو بیٹھتے دیکھا، تو ان کا دل بیٹھ گیا۔ رپورٹ ہوئی، سراغرساں آئے اور سُرنگ پکڑی گئی۔

اس ذراسی بات کا ہم کیا کریں شکوہ عدمؔ
پیار سے بجلی گری اور آشیانہ جل گیا!

جس طرح ہم مرحومہ کے عہدِ شباب پر خوش تھے، اسی طرح اب ہمارے دشمن اس کی مرگِ ناگہاں پر مسرور تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر قدرت مرحومہ کو آٹھ دس روز اور حیات بخشتی تو کئی لوگ فرار ہو چکے ہوتے اور کیمپ کے کئی عہدیدار سبکدوشی، تنزّل یا معطّلی سے دوچار ہو گئے ہوتے۔ اب یہ اپنی کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ کبھی وہ کیمپ کمانڈنٹ کو مُردہ دکھانے لاتے، کبھی گروپ کمانڈر کو، کبھی کسی بریگیڈیئر اور کبھی کسی جرنیل کو یہ نعش دکھاتے جیسے یہ انہی کے تیر کی کشتہ ہو! پانی کے مارے ہوئے شکار کو اپناتے ہوئے انہیں شرم سے پانی پانی ہو جانا چاہیے تھا، لیکن یہ انداز تو اعلیٰ ظرف اور عزتِ نفس رکھنے والوں کے ہوتے ہیں، چھوٹے لوگ تو ہر بڑی بات اپنے ساتھ منسوب کر لیتے ہیں۔

سُرنگ پا لینے کے بعد سُرنگ کھودنے کے اوزاروں کی تلاش ہوئی، لیکن کچھ نہ ملا۔ بغیر چھاپ کے کپڑوں کا سراغ لگانے کی سر توڑ کوشش کی گئی، لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سُرنگ کھودنے

والوں کی نشاندہی کا وقت آیا تو شناخت نہ ہوسکی۔

چونکہ کسی ایک فرد یا گروہ پر سٹرنگ کھودنے کی ذمہ داری نہ ڈالی جاسکی، اس لیے سزا کے طور پر نہ کسی پر کوڑے برسائے گئے، نہ انگلیوں کے ناخن نوچے گئے، نہ خونخوار کتّوں کے آگے ڈالا اور نہ اُلٹا لٹکا کر جسم کے حسّاس حصّوں کو داغا گیا۔ (باقی کیمپوں میں یہ سب کچھ ہوا۔) ہمارے کیمپ میں دار العوام کے جملہ ارکان کو اجتماعی سزا دی گئی (جو جنیوا کنونشن کی سراسر خلاف ورزی تھی)، چارپائیاں، سونے کے کپڑے، کھانے کے برتن، کینٹین کی مراعات اور باہمی میل ملاپ کی ساری سہولتیں ایک ماہ کے لیے واپس لے لی گئیں، لیکن یہ سزا سب نے بخوشی قبول کر لی، کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس سے کہیں کڑی سزا کے لیے تیار تھے۔

دار العوام کے مکینوں پر ان سختیوں کے خلاف دار الامراء میں شدید ردِّ عمل ہوا۔ انہوں نے بھی چارپائیاں، کپڑے اور کینٹین کی چیزیں بیرک سے نکال کر ایک طرف رکھ دیں اور بھارتی حکّام کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ہمارے ہم وطنوں کی جائز مراعات بحال نہ کی گئیں تو ہم بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ جب دھمکی سے کام نہ نکلا تو واقعی بھوک ہڑتال کر دی۔

بھارتی حکّام نے صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے اس احتجاجی تحریک کے سرغنہ ارکان کو دوسرے کیمپ میں بھیجنے کے بہانے انہیں سیلوں (CELLS) میں ڈال دیا۔ جب یہ خبر کیمپ میں پہنچی تو احتجاج کی ایک اور لہر اٹھی، لیکن اس کے طوفانی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی انہوں نے "معتوب" افراد کو کسی اور کیمپ میں بھیج دیا۔

ان "سزا یافتہ" جانبازوں کا قافلہ ریل گاڑی میں محوِ سفر تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور دروازے پر سنگین بردار پہرے دار۔ ڈبّے کی اکلوتی کھڑکی کے سینے میں نصف درجن آہنی سلاخیں گڑی تھیں۔ کھڑکی کے پاس کیپٹن شجاعت بیٹھا تھا جس کے پاس لوہا کاٹنے کی چھوٹی سی ریتی تھی۔ اس نے ریل کی چھک چھک، چھک چھک کے شور کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پہلے سلاخیں کاٹیں اور پھر ہتھکڑی کی زنجیر۔ ہتھکڑی کے مضبوط کنگن ابھی تک اس کی کلائیوں میں

تھے، لیکن اب اس کے ہاتھ آزادانہ حرکت کر سکتے تھے۔ سنتری دروازے پر کھڑے گپیں ہانک رہے تھے اور شجاعت کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا کہ مناسب جگہ آئے تو وہ تیز رفتار گاڑی سے کود جائے۔

چنانچہ جونہی ریل گاڑی نالوں اور جنگلوں سے پار ہوئی شجاعت نے اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے ہتھکڑی سمیت تاریکی میں چھلانگ لگا دی۔ گاڑی کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ تھی۔

پر شکستہ طیور بھی مالی

کر گئے دل کے زور پر پرواز

کیمپ ۴۴ میں قیام کے دوران کیپٹن شجاعت نے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال بالکل آزاد چھوڑ رکھے تھے۔ چند ہی ماہ میں یہ فصل اتنی پھلی پھولی تھی کہ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا کہ کبھی قینچی یا استرے سے بھی ان کا ملاپ ہوا ہے۔ اکثر دوست اس کے حلیے کا مذاق اڑاتے اور کیمپ کمانڈنٹ کئی بار مذاق سے کہہ جاتا کہ تمہارا نام تو سردار شجاعت سنگھ ہونا چاہیے۔ شجاعت مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر اپنوں اور بیگانوں کے طعنے سنتا اور سہتا رہا، کیونکہ اس کا ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی بھاگ نکلوں گا اور یہ حلیہ ایک پگڑی کے اضافے کے ساتھ بہت معاون ثابت ہو گا۔

ہم نے کیمپ میں سنا کہ یکم جولائی ۱۹۷۲ء کو تیز رفتار گاڑی سے چھلانگ لگانے سے کیپٹن شجاعت کو شدید چوٹیں آئیں، جس سے اس کا خون بہنے لگا۔ لیکن وہ اس سے بے نیاز ہتھکڑی سمیت بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ وہ جن راہوں سے گزرا، انہیں خونِ حریت سے سجاتا گیا۔ وہ جن ویرانوں سے ہو کر نکلا، وہاں شجاعت کی داستانیں بکھیرتا گیا۔ وہ جن بستیوں سے گزرا، طوق و سلاسل کا مذاق اڑاتا گیا — حتیٰ کہ اس کے جسم سے بہنے والے خون نے اس کے قدم تھام لیے اور خون کی باقی بوندوں کا واسطہ دے کر اسے یہ سفر ترک کرنے پر مجبور کیا — وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور جسم کی ناتوانی کے ہاتھوں بے بس ہو کر دوبارہ اسیر ہوا۔

ایک طرف اس مردِ میدان کی شجاعت ملاحظہ ہو اور دوسری طرف گارد کی بزدلی — یہ

محافظ شجاعت کا راستہ تو نہ روک سکے، لیکن اس کے ساتھی میجر نصیب اللہ کو نماز کی تیاری کرتے ہوئے عین ریل گاڑی کے اندر گولی مار کر شہید کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مارا گیا، دوسرا بچ نکلا۔

میجر نصیب اللہ درویش منش، سادہ لوح اور خاموش طبع افسر تھے۔ وہ عموماً بلبلِ محفل بننے کی بجائے دوسروں کو چہچہاتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ وہ خاموش بھی بیٹھے رہتے تو ان کے تبسم پر سو تکلم نثار ہوتے۔ ان کے لب کلی کی طرح بند ہوتے تو کئی شگفتہ پھول اس پر قربان ہونے کو تیار ہوتے۔ جب بھی ان سے بات ہوتی زبان سے پہلے ان کی سبز آنکھیں اور بھوری مونچھیں بول پڑتیں، زبان الفاظ میں اور آنکھیں مسکراہٹوں میں بات کرتیں۔ گویا میجر نصیب اللہ ہمارے کیمپ کے سب سے باوقار، خوش خلق اور نیک طینت شخص تھے۔ ان کی شہادت اور کیپٹن شجاعت کی ابتر حالت پر دل خون کے آنسو رویا۔ کیونکہ اب دونوں ہم سے بچھڑ چکے تھے۔

مرگِ مجنوں پر کڑھوں، ماتمِ فرہاد کروں

میجر نصیب اللہ اور کیپٹن شجاعت کی طرح ہمارے ساتھ کیمپ ۴۴ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ اعجاز حسین رضوی بھی تھا جسے فوج میں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ نوعمر، نوآموز اور نوخیز، گورا رنگ جو ہر وقت کھلا رہتا اور شرارتی آنکھیں جو مسکراتے وقت خود بخود بند ہو جاتیں۔ سیمابی جسم، کتابی چہرہ اور شتابی چال۔ وہ سارے کیمپ میں یوں آناً فاناً پھر جاتا جیسے روشنی کی کرن تاریکی میں پھرتی ہے۔

یہ قید غالباً اس کی اپنی ماں سے طویل ترین جدائی تھی۔ وہ بات بات پر اپنی امّی کا یوں ذکر کرتا جیسے اس کی زندگی کا محور صرف اس کی ماں ہے۔ وہ صبح تلاوت سے فارغ ہوتا تو جاتے جاتے میری چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر کہتا "سر! میری ماں اب نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر میرے، آپ کے اور دوسرے سب قیدیوں کے لیے دعا کر رہی ہو گی۔ وہ مصلّے سے اس وقت تک نہیں اٹھے گی جب تک اس کو یقین نہیں ہو جاتا کہ اسکی دعائیں اللہ تعالےٰ کے حضور

پہنچ گئی ہیں ۔" شام کو گھوم پھر کر رضوی ملتا تو خود بخود کہنے لگتا "بائی گاڈ، سر! شام کا کھانا پکا کر ضرور میری ماں نے میرا انتظار کیا ہوگا۔ اس نے ضرور سوچا ہوگا کہ میرے اعجاز کو کھانا نصیب ہوا ہے یا نہیں۔ بائی گاڈ، آپ ہمارے گھر آئیں، میری ماں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ ہمارا گھر بالکل لیاقت باغ (راولپنڈی) کے سامنے ہے۔ آپ کسی سے لیفٹیننٹ رضوی کا پوچھ لیں، مجھے سب جانتے ہیں ___ بائی گاڈ، سر! آپ کو پرامس ○ (PROMISE) کرنا پڑے گا کہ آپ ہمارے گھر ضرور آئیں گے۔"

رضوی کی باتوں میں بڑی بےساختگی، خلوص اور اپنائیت تھی۔ ہر شخص اس کی میٹھی میٹھی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ اپنے ہم عمروں میں شوخ اور چُلبلا اور بزرگوں کی مجلس میں سنجیدہ اور مؤدب ہوتا۔ کئی بار وہ اپنے ہم عمر دوستوں سے چہلیں کرنے کے بعد میری چارپائی کے پاس آ کر نہایت تعظیم سے پوچھتا "بائی گاڈ، سر! سچ سچ بتائیے، مَیں نے آپ کو ڈسٹرب (DISTURB) ◓ تو نہیں کیا۔ سر، میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ مَیں پہلے گوڈیرین (GUDERIAN) کی کتاب پینزر لیڈر پڑھوں یا بارنیٹ (BARNETT) کی ڈیزرٹ جنرلز (DESERT GENERALS) مَیں ابھی اس کے پہلے سوال کا تسلی بخش جواب دے نہ پاتا، تو وہ اپنی سیمابی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگلا سوال پوچھ لیتا "سر! آپ کو ضرور بتانا پڑے گا، بائی گاڈ، کہ میں اپنی انگلش امپروو (IMPROVE) ● کرنے کے لیے زیادہ پڑھا کروں یا لکھا کروں۔" وہ یوں بچوں کی طرح سوال پر سوال کیے جاتا اور سننے والے کو چڑنے کی بجائے ایک گونہ حظ نصیب ہوتا، جیسے تھکی ہوئی پلکوں پر شبنم کے شفاف ٹھنڈے قطرے گرنے سے راحت محسوس ہوتی ہے۔

ایک دن میں غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے اس کی چارپائی کے پاس سے گزرا، تو دامن

○ وعدہ

◓ مخل ہونا

● بہتر بنانا

پکڑ کر کہنے لگا "بائی گاڈ، سر! یہ مٹھائی آپ کو کھانی پڑے گی۔ یہ بازاری مٹھائی نہیں، میری ماں نے خود بنا کر بھیجی ہے۔ صرف اعجاز کے لیے ہی نہیں، بلکہ اپنے سب بیٹوں کے لیے، سب قیدیوں کے لیے۔ بائی گاڈ، اگر آپ نے مٹھائی نہ کھائی تو اسے بہت دُکھ ہوگا۔ سر! ایک ٹکڑا ضرور لے لیں۔"

اس اصرار، اس تکرار، اس ایثار اور اس پیار کے بعد کس کافر میں جرأتِ انکار ہوتی!

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو اسیری کے پہلے ماہ رمضان کا انیسواں روزہ تھا۔ لیفٹیننٹ رضوی، کیپٹن وحید اور دوسرے چند افسر ہسپتال گئے۔ حقیقی معنوں میں وہ بیمار نہ تھے، لیکن ہسپتال جانے کا معقول بہانہ موجود تھا، کیونکہ کسی کے دانت میں شدید درد تھا اور کسی کے کان میں ــــ دراصل ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جونہی ہسپتال میں ٹرک سے اتریں گے، بیک وقت سب "مریض" مختلف سمتوں میں بھاگ نکلیں گے، گولی چلے گی، چند مارے جائیں گے، چند نکل جائیں گے۔

لیفٹیننٹ رضوی وغیرہ نے کسی کہنہ مشق ساتھی سے منصوبے کی جزئیات طے نہ کی تھیں۔ بس اک طفلانہ سی جُھرجُھری آئی اور انہوں نے جان کی بازی لگانے کی ٹھان لی۔ نہ آپس میں بھاگنے کی سمت کا تعین کیا، نہ بھاگنے کا کوئی اشارہ یا کوڈ (CODE) مقرر کیا اور یہی اس منصوبے کی کمزورترین کڑی تھی؛ چنانچہ ٹرک سے اُترتے ہی رضوی اور وحید تو بھاگ اٹھے اور باقی موزوں رُخ کا فیصلہ کرتے رہے۔

کچھ اُٹھ کے بگولوں کی طرح ہو گئے رقصاں
کچھ کہتے رہے راستہ ہموار نہیں ہے

جونہی یہ دونوں جاں نثار آزادی کی تلاش میں لپکے، "فائر، فائر!!" کا آرڈر سنائی دیا۔ گارد کمانڈ کا حکم ملتے ہی بھارتی سپاہیوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، ہسپتال میں شور برپا ہوگیا۔ باقی قیدیوں کو جھٹ ٹرک میں بند کر دیا گیا۔ رضوی اور وحید دونوں زخمی ہو گئے۔ دونوں کو زندہ پکڑ لیا گیا۔ ایک سنتری نے رضوی کو دبوچے رکھا اور دوسرے نے نو انچ کے فاصلے سے سٹین گن کی تین گولیاں اس کے سینے کے پار کر دیں۔ رضوی موقعے ہی پر شہید ہو گیا۔ ادھر وحید بھی اسی انجام

کو پہنچنے والا تھا کہ اوپر سے کسی افسر کی آواز سُنائی دی "دوسرے کو گولی مت مارو، گولی مت مارو" تانی ہوئی سٹین گن بادلِ نخواستہ سینے سے پیچھے ہٹ گئی ۔ وحید کا بازو گیا، رضوی کی جان گئی اور آزادی کی شمع دُور کھڑی اپنے پروانوں کے لیے آنسو بہاتی رہی !

دستِ گلچیں نے ہمارے باغ کا ایک ایسا پیارا اور خوشگفتہ پھول توڑا کہ سارے گلستان میں ویرانی چھاگئی ۔ رضوی شہید کا مسکراتا ہوا چہرہ ہم سب کو رُلانے لگا ۔ آنکھیں ماننے کو تیار نہ تھیں کہ صبح "بائی گاڈ" کی تکرار کے ساتھ مٹھائی پیش کرنے والا اب ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو چکا ہے ۔ ہم نرگس کی طرح کاسۂ چشم لیے ترستے ہی رہے لیکن دیدار کی بوند اب کہاں سے آتی ! ہم تہی کاسہ اور تشنہ کام بیٹھے اس المیے پر آنسو بہاتے رہے ۔

کیپٹن وحید کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور رضوی کو آگرے میں مسلمانوں کے قبرستان میں ہم سب نے اس کے آخری دیدار کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اجازت نہ ملی ۔ رضوی شہید کے قریبی دوست لیفٹیننٹ علی، ہمارے کیمپ کے نمائندے اور ایک ڈاکٹر کو تجہیز و تکفین کی رسوم میں شرکت کی اجازت ملی ۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ رضوی شہید کی موت ایسی گولی سے ہوئی جو نہایت قریب سے چلائی گئی تھی ۔ پوسٹمارٹم رپورٹ نے اس خیال کی مزید تصدیق کی کہ گولی بمشکل نو انچ سے ایک فٹ کا فاصلہ طے کر کے اس کے سینے میں پیوست ہوئی تھی ۔ لیفٹیننٹ علی نے بتایا کہ جب میں نے رضوی شہید کو غسل دینے کے لیے اس کے کپڑے اتارے تو سرکاری وردی کے نیچے رضوی مرحوم نے پی ڈبلیو کی چھاپ کے بغیر ایک اور جوڑا پہن رکھا تھا اور اس نے جراب میں بھارتی کرنسی کے پانچ روپے ٹھونس رکھے تھے ۔

رضوی شہید کو شرعی آداب کے مطابق سپردِ خاک کر دیا گیا ۔ ہم نے کیمپ میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی اور ختمِ قرآن کر کے اس کی روح کو ثواب پہنچایا ۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ جس بیٹے کو اپنی ماں سے اتنا لگاؤ تھا، اس کی ماں کا کیا حال ہوگا ! خوشخبری کے منتظر کان یہ جانکاہ خبر کیسے سُنیں گے ! ترستی ہوئی آنکھیں اب کس امید پہ وا رہیں گی ! سب قیدیوں کی بخیریت واپسی کی

دعا مانگنے والی ماں کا اپنا گلشن کیوں ویران ہو گیا۔ کیا اب وہ نماز اور تلاوت کے بعد صرف اعجاز کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے زندہ رہے گی؟ یاس و حرماں کی ماری ہوئی مامتا اب کس امید کا سہارا لیکر زندگی کا باقی سفر کاٹے گی!

میں شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر لنگر خانے کے پیچھے چلا گیا اور خوب کھُل کر رویا۔ کھُل کر برکھا برسی تو موسم چھٹ گیا۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں آنسو خشک کر کے پچھلی روش پر ٹہلنے لگا۔۔۔ اور یہ شعر دبی دبی زبان میں پڑھنے لگا۔

کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنّت کے پھول لاتی ہے

ان المیہ واقعات کے بعد کچھ عرصے کے لیے تیشۂ فرہاد تشنۂ ضرب پڑا رہا۔ لوگ وقت گزارنے کے لیے اپنے اپنے مشاغل میں لگ گئے۔ اس سکوت و یاس کے ماحول میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ "پرواز خواب ہو گئی ہے، بال و پَر خیال"۔ جو لوگ پہلے بات بات پر جنیوا کنونشن کے حوالے سے کہتے تھے کہ فرار ہونا جنگی قیدی کے فرائض میں شامل ہے، اب خرد کی محفل میں حکایتِ جنوں بیان کرتے ہچکچانے لگے۔ اب اوّل تو وہ اس موضوع پر بات ہی نہ چھیڑتے اور اگر ذکر چل ہی نکلتا تو یہ دلیل دیتے کہ جنہوں نے فرار کو فرض کا درجہ دیا ہے، ان کے پیشِ نظر دوسری جنگِ عظیم تھی، ان کا خیال تھا کہ اگر قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے تو وہ دوبارہ محاذِ جنگ پر اپنے فرائض سنبھال سکتا ہے۔ کیونکہ برِّ صغیر میں اب جنگ ختم ہو چکی ہے، اس لیے اڑے وقت کیلئے جان سنبھال رکھنا ہی فرض ہے۔ اس لیے کسی سمجھوتے کا انتظار کرنا چاہیے۔ دو چار مہینے میں نہ ہوا تو چند سال میں ہو جائے گا۔

لیکن یہ طرزِ استدلال آزاد فطرت مرغانِ قفس کو ذرا نہ بھایا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ

جو مزا اپنے بال و پر سے اُڑنے میں ہے، وہ لطفِ صیاد کے طفیل رہا ہونے میں نہیں، لہٰذا دارالامراء میں میجر ظفر کی قیادت میں سُرنگ کھودنے کی ایک سکیم تیار کی گئی۔ لوہے کی پرانی چارپائی کا ایک پایہ اُتار کر اس کی جگہ سیاہ لکڑی کا پیوند لگا دیا گیا اور اصلی پائے کو لنگر کی آنچ دینے کے بعد پتھروں سے سر کوبی کر کے ایک تیشے کی شکل دے دی گئی۔ مٹی چھپانے کے لیے جیل کے احاطہ ہی میں اندھے کنوئیں کا انتخاب کیا گیا۔ دھاگے کے ایک سرے پر پتھر باندھ کر اس کی گہرائی ناپی گئی۔ قطر کو لمبائی سے ضرب دے کر مکعب فٹ رقبہ معلوم کیا اور ریاضی کے ماہروں نے تائید کی کہ کنواں سُرنگ کی ساری مٹی نگل جائے گا۔ چھاپ سے معرّا کپڑوں اور بھارتی کرنسی کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا جس کسی نے ان کی ذخیرہ اندوزی کر رکھی تھی وہ ہر کامیاب سُرنگ باز کو اپنا اثاثہ پیش کرنے کو تیار تھا۔ جیل سے باہر چھُپنے اور سفر کرنے کے تمام منصوبے تیار تھے۔ فقط ایک خاردار باڑ، دو فصیلوں، چند سنتریوں اور مٹھی بھر کُتوں کو مات دینی تھی — باہر آزادی کی شہزادی اپنے دلیر شہزادے کی منتظر ہو گی —!

سُرنگ نے ابھی گھٹنوں چلنا شروع کیا تھا کہ ایک روز کیمپ کمانڈنٹ آیا اور بڑے اعتماد سے کہنے لگا "سُرنگ بازوں کو میری طرف سے شاباش دینا اور کہنا کہ میں جیل کے باہر سُرنگ کے اس سرے پر چائے اور سینڈوچ لیکر ان کا استقبال کروں گا۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور شمعِ آزادی کے پروانے سوچ میں پڑ گئے۔ کیا اس نے سچ مچ سُرنگ کا سراغ لگا لیا تھا یا اس نے یونہی ایک فقرہ کہہ کر ہمارے دلوں کو ٹٹولا تھا؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ "اللہ رکھی" کی وفات کے بعد کیمپ کے حکام نے سرنگ بازی کے تدارک کے لیے کئی اقدامات کیے تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ کیمپ کے اندر ہونے والی ہر چھوٹی موٹی چیز کا انہیں علم رہے۔

ہماری حرکتیں تو کمانڈنٹ کی عقابی آنکھوں سے محفوظ نہ رہ سکیں، لیکن ہمارے پڑوس میں کیمپ ۷۷ کے مکینوں نے اپنے کیمپ والوں کی آنکھ میں ایسی دُھول جھونکی کہ وہ متواتر دو تین ماہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ اس عرصے میں انہوں نے دو سو گز لمبی اور اتنی کھُلی سُرنگ کھود ڈالی کہ سارا

کیمپ تین تین کی قطاروں میں ڈبل مارچ کرتا ہوا کیمپ سے بھاگ سکتا تھا اور جہاں سُرنگ جا کر نکلتی تھی وہاں کوئی مصروف شاہراہ نہیں، بلکہ ایک گرجا گھر تھا جس میں صرف اتوار کے اتوار رونق ہوتی تھی۔

ان سخت جانوں نے مٹی ٹھکانے لگانے کا بڑا سہل اور کارآمد طریقہ دریافت کیا۔ کیمپ کی ایک لمبی چوڑی بیرک اپنی خستہ حالی کی وجہ سے بند پڑی تھی۔ اس کی کھڑکیوں اور دروازے پر اینٹیں چُن دی گئی تھیں تاکہ اس کے اندر کا بھید کسی پر نہ کھُلے۔ اس سُرنگ کے منصوبہ بندوں کی داد دیجئے کہ انہوں نے اس بیرک کے باہر سُرنگ کی ابتدا کی جہاں سے وہ بیرک کے اندر داخل ہوتے اور سُرنگ کا منہ بند کر کے سارا دن اندر کھُدائی کرتے رہتے۔ مٹی کھود کھود کر اس بیرک کے اندر ڈھیر کرتے جاتے، سُرنگ جتنی لمبی ہوتی جاتی، مٹی کا ڈھیر اتنا ہی بلند ہوتا جاتا، حتیٰ کہ سُرنگ گرجا گھر تک اور مٹی کا ڈھیر بیرک کی چھت تک جا پہنچا۔

یہ در اصل ہمارے گوریلے سپاہیوں کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے سُرنگ کھودنے کے ساتھ ساتھ کپڑوں اور کرنسی کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ بالآخر دن رات کی کوشش بارآور ہوئی۔ سُرنگ مکمل ہو گئی۔ اس کے آخری سرے پر کپڑے، کرنسی اور ضروری اثاثہ ڈھیر کر دیا گیا کہ جاتے وقت ساتھ لے لیں گے۔ ایک موزوں تاریخ کا تعیّن کرنے کے بعد وہ غروبِ آفتاب کا انتظار کرنے لگے کہ اندھیرا جو بہت سے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے ضرور اس نیک مہم میں بھی تعاون کرے گا۔

آخر وہ شام آ پہنچی جس کا انتظار تھا۔ بھارتی این، سی، او کھانا تقسیم کرنے آیا۔ لوگ کھانا کھاتے وقت غلامی کی گنی چُنی گھڑیاں بھی گِن رہے تھے۔ لیکن اتنے میں بھارتی این، سی، او ٹہلتا ہوا ادھر ادھر گیا اور اس نے اچانک سُرنگ کی نشاندہی کر دی؛ چنانچہ سُرنگ پکڑی گئی اور اس میں رکھی ہوئی چیزیں نکال لی گئیں اور "سزاواروں" کو سزا کے لیے الگ کر لیا گیا۔ ساری اُمیدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

لیکن اس افیونی وضع کے این، سی، او کو سُرنگ کا سراغ ملا کیسے؟ اگر اس کی نگاہیں اتنی

ہی دُور رس تھیں تو گزشتہ دو مہینے اس کو سُرنگ کیوں نظر نہ آئی ؟ کیا وہ جان بوجھ کر چُپ تھا کہ یہ جان جوکھوں میں ڈال کر سینکڑوں ٹن مٹی کھود لیں تو پھر یہ ان کے ارادوں کو مٹی میں ملائے گا؟ لیکن اتنے بڑے ضبط کے لیے بہت بڑا دل چاہیے جو ہمیں ہندوستان کے کسی شہری میں نظر نہ آیا۔ اصل صورتِ حال کا تو پتہ نہ چل سکا ۔بس اتنا سننے میں آیا کہ مخبری کے شُبے میں اپنے ایک ساتھی کی خوب پٹائی ہو گئی۔

سُرنگ کھودنے والوں کو سیل میں بند کر کے بھارتی عملے نے خوب زدوکوب کیا۔کھانا پینا بند اور بالاقساط جفاکاری شروع ۔"ملزموں" کو پہروں بھوکا پیاسا سیل کی سلاخوں کے ساتھ اس طرح باندھ دیا جاتا کہ سارا دن موسمِ گرما کا سورج ان کے چہرے پر پڑتا۔ اس پر ستم یہ کہ بھارتی عملہ باری باری آ کر انہیں اذیت ناک سزائیں دیتا ، لیکن وہ خشک حلق اور خالی پیٹ کے ساتھ سب کچھ سہتے رہے۔ بھارت کی مشقِ ستم جاری رہی ، لیکن ان جیالوں کے قدم ذرا بھی متزلزل نہ ہوئے۔ آفرین ہے ان کی ہمت پر ! سینکڑوں سلام ان کے استقلال کو !

ان معتوبوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی اور اخوت کی خاطر سارے کیمپ (۷۷) نے بھوک ہڑتال کر دی ۔چند لیڈر رنما ہڑتالی قیدیوں کو دبانے کی کوشش کی گئی تو" اتنا ہی یہ اُبھریں گے جتنا کہ دبا دیں گے" کے مصداق آگ اور بھڑک اٹھی۔ کچھ عرصہ بعد بھارتی ہٹ دھرمی نے پاکستانیوں کے جذبۂ اخوت اور ثابت قدمی کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور سزا پانے والوں کو سیلوں سے رہا کر کے کیمپ ۸۸ میں منتقل کر دیا گیا۔

نئے کیمپ میں پہنچنے کے چند روز بعد ایک "سزا یافتہ" قیدی نے باضابطہ درخواست کی کہ مجھے ایک بار کیمپ ۷۷ کے در و دیوار کی زیارت کی سعادت بخشی جائے ۔ وجہ ؟ "وہاں میرے ضروری کاغذات رہ گئے ہیں ، جن کی موجودگی کے متعلق میرے سوا کسی کو علم نہیں "۔ درخواست منظور ہو گئی اور وہ بھارتی افسر اور عملے کے ساتھ دوبارہ کیمپ ۷۷ میں گیا۔ ایک دیوار کا پلستر توڑ کر بھارتی نوٹ نکالے اور ان کو جھاڑتا پھونکتا واپس کیمپ ۸۸ میں چلا آیا — یہ نوٹ ضبط کر لیے

گئے!

عام طور پر جب ایک کیمپ میں کسی قیدی کو سزا کے لیے الگ کیا جاتا تو اسے واپس اسی کیمپ میں بھیجنے کی بجائے کسی دوسرے کیمپ میں منتقل کر دیا جاتا۔ ہندوستان بھر میں ایسے "مجرموں" کے لیے بہترین جگہ سنٹرل جیل آگرہ تھی؛ چنانچہ رہینِ ستم ہائے بھارت فتح گڑھ، رام گڑھ، الٰہ آباد، مراد آباد اور دوسرے مقامات سے اپنے اپنے کردہ یا ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت کر ہمارے پاس آگئے۔ آئیے، ذرا ان کے کارناموں کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں۔

کیمپ۔ ۲۵ (رام گڑھ) سے آنے والے نیوی کے چار افسروں میں سے لیفٹیننٹ شاہد نے بتایا کہ "ہم نے اپریل ۷۲ء ہی میں، جب حفاظتی انتظامات ابھی اتنے سخت نہیں تھے، سُرنگ کھودنے کا منصوبہ بنایا۔ ہم جے، سی، او کوارٹرز کے کمروں میں محصور تھے۔ کوارٹروں کی حد بندی کے طور پر کچی دیوار کھڑی تھی۔ ہم نے صحن کے ایک کونے میں سُرنگ کھودنی شروع کی۔ لکڑی کے ایک تختے پر تین چار اِنچ مٹی بچھا کر اس پر ٹماٹر اور دوسری سبزی کاشت کر دی۔ یہ تختہ سُرنگ کا منہ بند رکھنے کے علاوہ بھارتی عملے کا منہ بند رکھنے کے بھی بہت کام آتا۔ جونہی کیمپ کا عملہ سُرنگ سونگھتا ہوا مخصوص یا مشکوک گوشے کی طرف بڑھتا، ہماری دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور نگاہیں اس کے قدموں کا پیچھا کرتیں۔ جب وہ خطرناک جگہ کے قریب پہنچتا اور پاؤں سبزی والے تختے کو چھُونے لگتے تو قیدی احتجاج کرتے، دیکھو، دیکھو ٹماٹر پِس جائیں گے، دیکھنا کدو کا سر پاؤں تلے آجائے گا، ذرا بچانا مرچ کی نوکِ زباں کٹ جائے گی۔ جب وہ اپنی تسلّی کر کے چلا جاتا تو قیدی تختہ ہٹا کر سُرنگ میں داخل ہوتے اور گھنٹوں تیشہ رانی کرتے رہتے۔"

مٹی ٹھکانے لگانے کے کئی مرحلے تھے۔ پہلے سبزی کی کیاریاں بنانے میں کام آئی۔ پھر اس سے مسجد کی حد بندی کے لیے چھوٹی سی منڈیر بنائی گئی اور آخر میں کوارٹروں کی درمیانی دیوار پر خرچ ہوئی۔ یہ دیوار روزانہ ایک آدھ اِنچ سر بلند ہو جاتی اور گرمیوں کی ایک رات ہی میں سُوکھ جاتی (ورنہ احتیاطاً گیلے اور خشک حصّوں کو ملانے کے لیے چونا پھیر دیا جاتا)، اور بھارتی عملے کو ذرا

بھی خبر نہ ہوتی کہ انسانوں کی طرح دیواروں کا قد بھی بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔

لیفٹیننٹ شاہد کا کہنا ہے کہ کام اچھا بھلا چل رہا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ جولائی میں یہ کام مکمل ہو جائے گا اور ہم چند سو گز دُور جنگل میں نکل جائیں گے، لیکن پتہ نہیں اچانک کیا ہوا۔ وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور وہ سُرنگ پر چھا گئے۔ ہمیں سزا کے لیے الگ کر لیا گیا اور بڑے امتحانوں سے گزر کر آپ کے پاس آگرہ پہنچ گئے۔

کیمپ ۴۶ (مراد آباد) سے آنے والے کیپٹن آصف اور کیپٹن سعید نے بتایا کہ پہلے تو ہم نے تنور سے سُرنگ کا آغاز کیا، لیکن ابھی پندرہ بیس فٹ ہی گئے تھے کہ راز کُھل گیا۔ کچھ سُرنگ کے اندر پکڑے گئے اور کچھ تنور میں۔ لیکن ہم بچ گئے؛ چنانچہ ہم نے فرار کا ایک انوکھا طریقہ سوچا۔ ہمارے کیمپ میں رہائشی بیرکیں ایک طرف تھیں اور فالتو سامان رکھنے کے لیے سٹور تاروں کے پار دوسری جانب تھے۔ سارے حفاظتی اقدامات کیمپ ہی پر مرکوز تھے اور سٹوروں کی طرف کسی کا خیال نہ جاتا تھا اور سٹور بھی ایسے تھے کہ باہر سے ان کے دروازے کئی تھے، لیکن اندر سے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ تمام دروازوں کی چٹخنیاں اندر سے چڑھا کر صرف ایک دروازے پر باہر سے تالا ڈالا جاتا تھا۔

ایک دن ہم نے درخواست دی کہ سردیاں ختم ہو گئی ہیں، اس لیے رضائی اور فالتو کمبل وغیرہ جمع کرانا چاہتے ہیں۔ دوسرے روز اجازت مل گئی۔ حسبِ معمول ہمارے جوانوں نے دو موٹے موٹے بستر سر پر اٹھائے اور بھارتی گارد اور کوارٹر ماسٹر کے ساتھ سٹور کی طرف چلنے لگے۔ کیمپ کے بیرونی پھاٹک پر دو بستر اور دو بستر بردار قیدیوں کا اندراج ہوا۔ بھارتی کوارٹر ماسٹر (این، سی، او) نے رجسٹر پر دستخط کر کے ان دونوں قیدیوں کو واپس کیمپ میں لانے کی ذمہ داری قبول کی اور وہ سب سٹور کی طرف چل دیے۔

اب وہ سٹور کے سامنے کھڑے تھے۔ قیدیوں کے سر پر بستر، گارد کے ہاتھ میں رائفلیں اور کوارٹر ماسٹر کے ہاتھ میں چابیاں تھیں۔ کوارٹر ماسٹر نے چابیوں کا گچھا جھنجھنا کر مطلوبہ چابی تلاش

کی۔دروازہ کھولا اور پاکستانی سپاہیوں نے دونوں بستر نہایت احترام سے دروازے کے اندر اُتار دیے۔ بھارتی این سی او نے دروازہ بند کرنے کے لیے بستروں کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر اندر دھکیلنا چاہا، تو پاکستانی سپاہیوں کو "بستروں" کی بے حرمتی پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے کہا "تم پیچھے ہٹو، ہم خود اندر دھکیل دیتے ہیں۔" بستر اُتارنے میں غیر ضروری احتیاط اور انہیں اندر دھکیلتے ہوئے بے وقت احترام سے بھارتی این۔سی۔او کو شک گزرا۔اس نے وہیں بستر کھلوائے اور ہر بستر سے ایک ایک کپتان برآمد ہوا۔کیپٹن سعید اور کیپٹن آصف! اس کے بعد ان پر کیا بیتی، یہ ایک طویل اور خونچکاں داستان ہے۔جب یہ ہمارے پاس پہنچے تو ان کے جسم پر بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کے علاوہ رسّوں اور دُرّوں کے نشان تھے۔

کیمپ ۔۹۹ دالہ آباد) سے آنے والے میجر چودھری نے بتایا کہ ایک دفعہ سُرنگ کھودی تو اس نے سڑک کے عین وسط میں جا سر نکالا۔سرِ عام گڑھا بن گیا، زمین دھنس گئی اور ٹریفک کی آمدورفت رُک گئی۔دوسری بار دوسری سمت میں سُرنگ کھودنی شروع کی اور ہم نے اس کا رُخ قابو میں رکھا ہوا تھا تو اچانک واچ ٹاور (WATCH TOWER) پر کھڑے سنتری کے ہاتھ سے سٹین گن (STENGUN) گر گئی اور اس میں لوڈ (LOAD) کی ہوئی گولی چلنے سے سارے کیمپ میں "سٹینڈ ٹو" (STAND TO) ہو گیا۔ ہر طرف خطرے کی سیٹیاں بجنے لگیں، سنتریوں نے اپنی اپنی پوسٹ سنبھالی اور کیمپ کا عملہ گنتی کرنے لگا۔اس سارے ہنگامے کے دوران سُرنگ کا منہ کھلا تھا اور لوگ اندر کام کر رہے تھے۔اگر اندر رہتے تو گنتی میں ان کی غیر حاضری کا پتہ چل جاتا۔اگر نکلتے تو خاک آلود کپڑے ان کے کارناموں کی چغلی کھاتے۔ایسی حالت میں یہ راز، راز کیسے رہتا! سُرنگ پکڑی گئی اور "مجرم" سزا کے لیے الگ کر لیے گئے۔

کیمپ ۔۴۵ (فتح گڑھ) سے آنے والے لیفٹیننٹ کرنل شریف اور کیپٹن ذکریا نے بتایا کہ ہم نے اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت آغازِ اسیری ہی میں سُرنگ کھودنی شروع کر دی تھی۔

جو اپریل تک مکمل ہو گئی تھی۔ انہی دنوں پاک بھارت مذاکرات کا آغاز ہوا تو ہم نے فرار کی تاریخ ملتوی کر کے پہلے مذاکرات کے نتائج کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ جب ادھر بات لمبی ہوئی، تو فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔ پانچ افسر دو ٹولیوں میں فرار ہوئے اور صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے۔ یہ دیکھئے ایک پارٹی کے لیڈر کا تو خط بھی آ گیا ہے۔

شوق محکم ہو تو اُڑ جاتے ہیں یوں بھی طائر
پر ضروری تو نہیں کوششِ پرواز کے ساتھ

فرار کی ایسی کئی کوششیں کبھی کامیاب اور اکثر ناکام ہوتی رہیں۔ لوگ ناکامی کی سزا خندہ پیشانی سے بھگتتے رہے اور حاکم ہر نئے تجربے سے گزرنے کے بعد زیادہ عقلمند ہو جاتے اور حفاظتی انتظام اور سخت کر دیتے۔

کسی ایک کیمپ میں فرار کی ناکام یا کامیاب کوشش کا تجزیہ کرنے کے بعد بھارتی حکام جو نئے احکام وضع کرتے، انہیں متعلقہ کیمپ تک محدود رکھنے کی بجائے سارے کیمپوں پر نافذ کر دیتے۔ چنانچہ جب بھی ہمارے کیمپ میں بے وجہ کسی نئی پابندی یا حکم کا اعلان ہوتا تو ہم سمجھ جاتے کہ کسی مردِ مجاہد نے فرار کے لیے یہی حربہ ایجاد کیا ہو گا۔

مثلاً ہمیں حکم ملا کہ کھانے کے بعد پلیٹیں اور چمچ جمع کرا دیے جائیں اور اگلے کھانے کے وقت پھر واپس لے لیے جائیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی بے تیشہ فرہاد نے انہی بیکار اشیاء سے کام لینا شروع کر دیا ہو گا۔ اسی طرح ہمارے کیمپ میں ٹین کے خالی ڈبے جمع کرنے شروع کیے گئے اور ہر ڈبے کا اشتہاری مجرم کی طرح حساب رکھا جانے لگا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ضرور کسی نے ان ڈبوں کو جوڑ توڑ کر ــــ بلکہ توڑ جوڑ کر ــــ نالی بنالی ہو گی تاکہ سُرنگ کے اندر روشنی اور ہوا پہنچائی جا سکے۔ پھر آرڈر آیا کہ کپڑے لٹکانے کے دھاگے اور بوٹوں کے تسمے بحقِ سرکار جمع کرائے جائیں، شاید کسی نے کہیں رسّی کا زینہ بنا کر دیوار پھلانگنے کی کوشش کی تھی یا دھاگے سے سُرنگ ناپنے کا کام لیا تھا۔

ان "دانشمندانہ" احکام کا احمقانہ پہلو یہ تھا کہ پلیٹیں اور چمچ تو جمع ہو جاتے، لیکن سبزی کاٹنے کی چھُری اور لکڑیاں پھاڑنے کی کلہاڑی ہمارے پاس رہتی۔ خالی ڈبے ضبط کر لیے جاتے، لیکن چُھنکنی بنانے کے کام آنے والی ترپال (TARPALENE) حسبِ معمول کھڑکیوں پر لٹکی رہتی۔ دھاگے اور تسمے خطرے کی علامت سمجھے جاتے، لیکن چارپائیوں کی سینکڑوں گز ادوائن پر ہرگز توجہ نہ دی جاتی ـــ بھارت عظیم ہے اور اس کے انداز عظیم تر۔ مجھ جیسے کم عقل کو تو اس حکمتِ عملی کا فلسفہ قطعاً سمجھ میں نہ آیا۔

ایسے احکام سُن کر یا وصول پا کر ہمیں اور تجسّس ہوتا کہ تازہ ترین طریقہ کس نے کہاں استعمال کیا اور اس کے نتائج کیا نکلے ـــ آزادی یا عقوبت؟ لیکن ایسے واقعات کی تفصیل یا تصدیق کے ذرائع مسدود تھے۔ چنانچہ جب ریڈ کراس کا کوئی نمائندہ آتا تو ہم اس سے ان واقعات کا حال بھی پوچھتے۔ عموماً وہ یہ راز افشا کرنے پر تیار نہ ہوتا، لیکن کبھی کبھی کوئی موتی اس کے خزانۂ راز سے جھلمل جھلمل کرتا نظر آ ہی جاتا۔

ایک دفعہ برِ صغیر میں ریڈ کراس کا اعلیٰ نمائندہ ہاف مین (HAFFMAN) آیا، تو ہم نے پوچھا کہ کیا جابجا فرار ہونے اور گولی چلنے کی اطلاعات درست ہیں؟ اور کیا یہ صحیح ہے کہ پکڑے جانے والوں سے غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے جبکہ جنیوا کنونشن میں صرف راشن یا الاؤنس میں کمی یا ایسی ہی دوسری ہلکی سزائیں درج ہیں؟

اس نے بتایا کہ ۱۹۷۲ء کے موسمِ گرما میں کوئی درجن بھر کیمپوں میں سُرنگ کھودی گئی، پتہ نہیں آپ لوگوں نے قید و بند میں بھی آپس میں رابطہ کیسے پیدا کر لیا اور اجتماعی طور پر سُرنگ بازی کا موسم (TUNNELLING SEASON) منا ڈالا۔ اس نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ ناکام مفروروں کے ساتھ زیادتیاں کی گئیں۔ اس نے کہا "میں نے خود ان افسروں کے جسم سے جابجا اُکھڑا ہوا گوشت دیکھا ہے جن کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر انہیں خونخوار کتوں کے آگے ڈالا گیا۔" ہم نے پوچھا "پھر آپ چُپ کیوں ہیں؟ ایسے واقعات کو مشتہر کر کے آپ کیوں بھاگتی

دعووں کا پول نہیں کھولتے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ جنیوا کنونشن کے مطابق بلکہ اس سے بھی بہتر سلوک کیا جارہا ہے؟" اس نے جواب دیا "ہمارا کام متوازن رپورٹ دینا ہے جس میں اچھے اور بُرے دونوں نکات درج ہوتے ہیں۔ اگر بھارت صرف اپنی اچھائیاں اُچھال دیتا ہے اور پاکستان صرف برائیاں، تو ہم کسی کی تردید کر کے پروپیگنڈا کی جنگ میں نہیں اُلجھنا چاہتے، ورنہ ہمارا بنیادی کام ـ انسانی بہبود ـ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔"

○ ○

سحر قریب ہے یارو

"اعصابی جنگ" اور "آئینِ جوانمرداں" سے پہلے تذکرۂ اسیری اگست ۱۹۷۳ء تک پہنچا تھا۔ وہی اگست جس کا پیٹ کئی اہم واقعات سے پھولا ہوا تھا۔ اس مہینے یومِ آزادی بھی آیا اور سیلاب بھی۔ اسی میں ہاکی ٹورنامنٹ میں پاکستان کی مات بھی ہوئی اور دہلی مذاکرات میں جیت بھی۔ یہ سب واقعات اپنی اپنی جگہ اہم تھے، لیکن داستانِ قید و بند سے براہِ راست تعلق صرف دہلی مذاکرات کا ہے، جن کے کچے دھاگے سے ہماری قسمت بندھی ہوئی تھی۔

دہلی مذاکرات سے متعلق پہلے اعلان نے خوابِ گراں میں ڈوبی ہوئی امیدوں کو جھنجھوڑا، تو وہ پھر کروٹ بدل کر سو گئیں۔ شاید انہیں بن بن کر روزِ وصل کے نقشے بگڑنے کے بعد کسی واقعے پر اعتبار نہ رہا تھا۔ ہم نے ان آرزوؤں کو جگانے کے لیے شملہ سمجھوتے کا حوالہ دے کر ان کے کان میں کہا کہ "پچھلے برس مقبوضہ علاقے آزاد ہوئے تھے، یہ سال نظر بندوں کی رہائی کا ہے۔ اٹھو، ذرا دیکھو تو سہی رنگِ زمانہ۔" لیکن انہوں نے چشمِ نیم وا سے ہمیں دیکھ کر کہا کہ ابھی "نے مژدۂ وصال ہے نے نظارۂ جمال"— اور پھر انگڑائی لے کر سو گئیں۔

خوابیدہ امیدوں کی سرد مہری کے باوجود مذاکرات شروع ہو گئے، لیکن ہم نے پہلے کی طرح ان کے مد و جزر سے طنابِ دل کو نہ باندھا۔ بات چیت ہوتی رہی۔ ہم پی۔ ٹی، مطالعہ اور بخیہ گری جیسے مشاغل میں محو رہے۔ جب کوئی اپنے روزمرہ کے معمول سے فارغ ہوتا تو سرِ راہے مذاکرات کی صحت بھی پوچھ لیتا اور پھر اپنی دنیا میں کھو جاتا۔ مثلاً لوگ صبح صبح پی ٹی کر کے پسینہ پونچھتے ہوئے بیرک میں داخل ہوتے تو کسی سے پوچھ لیتے کہ "بھئی، دہلی کی کیا خبر ہے؟" مطالعہ

کرنے والے اپنا یومیہ کوٹا پورا کر کے کمر سیدھی کرنے اُٹھتے تو کہتے "ہاں بھئی کسی نے ریڈیو سُنا ہے؟ کیا خبریں ہیں؟" اسی طرح بخیہ گر کو قمیص رفو کرنے یا تولیے کا جانماز بنانے سے فرصت ملتی، تو وہ کہتا "بھئی ریڈیو لگاؤ، دیکھیں تو سہی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟"

جوں جوں مذاکرات گہرے پانی میں اُترتے گئے، ہماری امیدیں — اور وسوسے — جاگنے لگے۔ دل کے تار مذاکرات کے اتار چڑھاؤ سے جھنجھنانے لگے۔ لوگ پہلے تو دن میں ایک دفعہ خبریں سنتے تھے، اب تین چار بار سننے لگے۔ کچھ دن بعد جب مذاکرات کبھی تعطّل، کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی کی منزلوں سے گزرنے لگے تو نہ صرف ریڈیو پاکستان کی ساری خبریں اور تبصرے سننے لگے، بلکہ آل انڈیا ریڈیو، بنگلہ دیش ریڈیو اور دوسرے کئی یورپی اور ایشیائی سٹیشنوں سے کان لگانے لگے۔ لیکن ان سب نشری اداروں سے خبریں کم اور قیاس آرائیاں زیادہ سُننے میں آتیں۔ کیونکہ مذاکرات میں دھنسے ہوئے مندوبین قبل از وقت امید یا یاس کا تاثر نہیں دینا چاہتے تھے۔ خبروں کے اس قحط میں ہماری گزر اوقات عموماً تبصروں پر ہوتی، کیونکہ ان میں کئی ایسے فقرے ہوتے تھے جن سے ہماری اپنی مرضی کے مطابق معنی اخذ کیے جا سکتے تھے۔

اخباری اور ریڈیائی تبصروں کے علاوہ ہمارے کیمپ میں بھی کئی مبصّر پیدا ہو گئے تھے، جو بڑے عالمانہ انداز میں مذاکرات کے نتائج کی پیش گوئی کرتے لیکن وہی تبصرہ گو قیدی مقبول ہوتے جو سننے والوں کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کرتے؛ چنانچہ اکثر مبصّرین نے دکھی دلوں کو خوش کرنے کیلئے پُر امید تبصروں کے کئی رُخ وضع کر لیے تھے۔ ایک مبصّر معاشی نقطہ نظر سے دلیل دیتا کہ بھارت ہم پر ہر مہینے کروڑ ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ کر رہا ہے، بھارت کے اپنے عوام بھوکے اور ننگے ہیں، وہ ہمیں کب تک روٹی، کپڑا اور رہائش مہیا کر سکتا ہے! یقیناً اس مالی بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹنے والی ہے، لہٰذا وہ دہلی مذاکرات کی آڑ میں ہمیں رہا کر دے گا۔

دوسرا شخص بین الاقوامی سیاست کے واسطے سے کہتا "بھارت پہلے ہی ۱۹۷۱ء کی جارحیت کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہو چکا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی، قانون دانوں کے کمیشن، بین الاقوامی

عدالت اور عالمی رائے کے دوسرے اداروں نے ہمیں رہا نہ کرنے پر بھارت کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ اس طرح ہماری اسیری کا ایک ایک دن بھارت کی روسیاہی میں اضافہ کرتا جائے گا— اور بھارت جیسے عالمی سطح پر ایک طاقت بن کر اُبھرنے کا زعم ہے، زیادہ عرصہ اپنی رسوائی برداشت نہیں کریگا۔"

تبصروں اور تجزیوں کے مارے کئی دفعہ میرے خیالات معلوم کرنے کے لیے بھی اکٹھے ہو جاتے۔ اس لیے نہیں کہ میں اندھوں میں کانا تھا، بلکہ اب جذبات و احساسات کی ایسی منزل آگئی تھی جہاں ہر کسی کو سہاروں کی تلاش تھی جس کی وجہ سے کئی "کانے" اندھوں کے پاس بھی چلے آتے۔ جب وہ میرے پاس آتے تو میں انہیں دوٹوک بات کہہ کر مایوس کرنے کی بجائے عموماً لمبی تمہید باندھتا۔ لوگ سگریٹ پیتے رہتے اور ساتھ ساتھ میری باتیں سنتے رہتے۔ جن لوگوں کے سگریٹ ختم ہو جاتے، وہ جا کر اپنی چارپائی کے سرہانے سے ایک اور پیکٹ لے آتے اور جن کا سٹاک بالکل ہی ختم ہو جاتا، وہ دوسروں کا سگریٹ چوپال میں بیٹھے حقہ نوشوں کی طرح باری باری پینے لگتے۔ سگریٹ کی ڈبیاں ختم ہو جاتیں، لیکن میری بات ختم نہ ہوتی۔ بعض سامعین تنگ آکر کہتے "بس، بس۔ پاک و بھارت تعلقات اور برِصغیر کی سیاست کا پس منظر بہت ہو چکا، ہم بالکل سمجھ گئے۔ اب ذرا موجودہ مذاکرات کے بارے میں بھی چند کلمات ارشاد ہوں۔"

اگر میں کہتا کہ خزاں رسیدہ غنچۂ دل کو ہوائے بہاراں کا اور انتظار کرنا پڑے گا تو کئی سامعین بڑبڑانے لگتے "ہونہہ، خواہ مخواہ علم بگھارتا رہتا ہے۔ اسے سیاسی مذاکرات اور ان کے اتار چڑھاؤ کا کیا علم! آیا بڑا مبصر، اٹھو چلیں!"— اور اگر میں یہ تاثر دیتا کہ افق سے اُٹھنے والے ابر میں مجھے بارانِ رحمت کی بُو آتی ہے تو لوگ محفل برخاست ہونے کے بعد بھی میری مدح سرائی کرتے رہتے۔ "جی ہاں، اس سے بہتر سیاسی موسمیات کا حال کس کو معلوم ہو گا! صحافی آدھے تو سیاستدان ہوتے ہیں۔ انہیں مذاکرات کے طور طریقوں اور متوقع نتائج کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔"

جوں جوں دہلی مذاکرات طویل ہوتے گئے، لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا۔ اب مفصل تبصرے اور طویل تجزیے سُننے کا ان میں یارا نہ تھا، اب وہ صرف نتائج پر نظریں جمائے بیٹھے

تھے۔ وہ جس کسی سے پوچھتے، نتائج ہی کے بارے میں پوچھتے۔ اس سوال وجواب نے اب ایک مختصر نعرے کی صورت اختیار کرلی تھی "لبستر ے باندھ لو" یعنی مذاکرات کامیاب ہونے والے ہیں یا "بستر ے کھول دو" یعنی مذاکرات ناکام ہوگئے ہیں۔

کئی دفعہ ہم ظہر کی نماز کے بعد سوئے ہوتے تو ساتھ والی بیرک سے ایک صاحب آکر نعرہ لگاتے "حضرات، بستر ے کھول دو، کیونکہ پاکستانی مندوب نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے آخری تجاویز پیش کردی ہیں اور ہم کل واپس جارہے ہیں۔" ہم لیٹے لیٹے سر اُٹھا کر یہ اعلان سنتے اور پھر سر بالیں پر پٹک دیتے۔ اسی طرح آدھی رات کو کوئی صاحب نیند میں مخل ہوتے ــــــ "حضرات، لبستر ے باندھ لو، میں نے ابھی ابھی بی بی سی کا تبصرہ سُنا ہے جس میں دہلی مذاکرات کی کامیابی کی پیش گوئی کی گئی ہے۔" بعض اوقات جو صورتِ حال یاس اور امید کے بین بین ہوتی تو اعلان ہوتا "بستر ے کی رسی ڈھیلی رہنے دو، ڈھیلی ... ۔"

خبروں کی آمدورفت میں ایک افواہ یہ بھی پھیلی کہ پاکستان ایک سو بچانوے "جنگی مجرموں" کو باقی جنگی قیدیوں سے الگ کرنے پر تیار ہوگیا ہے اور ساتھ ہی اس نے دوسو تین بنگالیوں پہ غدّاری کے جرم میں مقدمہ چلانے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ اس افواہ سے فوری طور پر تشویش ہوئی، لیکن ایک صاحب نے فوراً کسی غیر ملکی صحافی کے حوالے سے بتایا کہ پاکستانی وفد کے ایک اہم رُکن نے کہہ دیا ہے کہ "ایک سو بچانوے جنگی قیدیوں کو الگ کرنے یا پیچھے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم یہ اہتمام کریں گے کہ باقی قیدیوں کی وطن واپسی مکمل ہونے سے پہلے پہلے ایک سو بچانوے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے تاکہ آخری مراحل میں وہ بھی وطن چلے آئیں۔"

یہ اعلان سنتے ہی نعرہ لگا "اوہ، شاباشں بھٹو، نئیں ریساں تیریاں نئیں جواب تیری ڈپلومیسی دا ..... ۔"○

مذاکرات کامیاب ہوئے اور جنگی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر ناطے پایا۔ ہمارا دِل

○ واہ بھٹو، شاباش، تیرا جواب نہیں، تیری ڈپلومیسی بے مثال ہے۔

چھوم چھوم کر گانے لگا۔

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے

اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

پھر بھی دل کے اندر کوئی گرہ تھی کہ کھلنے میں نہ آتی تھی۔ دل پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ اوپر سے خوشی کا چشمہ پھوٹتا دکھائی دیتا، لیکن اس کی تہ میں کنکر محسوس ہوتے۔ شاید اس کا تعلق تحت الشعور میں دبی ہوئی کسی اضطراری کیفیت سے تھا کہ پتہ نہیں سمجھوتے کے باوجود بھارت ہمیں کب بھیجتا ہے۔ کیا معلوم کہ کوئی نہ کوئی بہانہ رکھ کر ہماری رہائی التوا میں ڈال دے۔ شملہ سمجھوتے میں مقبوضہ علاقے خالی کرانے کا وعدہ کرنے کے باوجود اس نے لائن آف کنٹرول کا جھگڑا کئی مہینے ڈالے رکھا۔ اب پتہ نہیں کون سی نئی لائن کھڑی کر کے ہماری راہ مسدود کرتا ہے!

واپسی کی تاریخوں کے متعلق بھی قیاس آرائیاں ہونے لگیں اور وہ بھی شرطیں بدنے کی حد تک۔ ایک صاحب نے کہا کہ "ہم ایک ماہ کے اندر اندر یعنی تیس ستمبر سے پہلے وطن پہنچ جائیں گے۔" دوسرے نے کہا "نہیں، ہم تیس ستمبر تک نہیں جا سکیں گے۔"

"لگ گئی شرط؟"

"لگ گئی۔"

"ہو گئے دس دس روپے کے کوپن؟"

"نہیں، دس روپے کے کوپن نہیں، بلکہ لاہور انٹر کانٹی نینٹل میں ایک ماہ کی تنخواہ کا شاندار ڈنر۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

شرط طے ہونے کے بعد جب اس کے مضمرات پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو قطعاً افسوس نہ ہوتا۔ ایک ماہ کی تنخواہ یکمشت انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں جھونک دینے والا کہتا "رہائی

کی خاطر ایک ماہ کی تنخواہ خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار روپوں میں آزادی کا سودا مہنگا نہیں۔ اور اگر یہیں رہ گئے تو نہ انٹر کانٹی ننٹل ہوگا۔ نہ ڈنر نہ فضول خرچی۔ پھر وہی دال روٹی ہوگی اور وہی حسرتِ کوئے یار۔"

اگلے روز بھارتی اخبارات نے انکشاف کیا کہ قیدیوں کی واپسی کو پانچ چھ ماہ لگ جائیں گے۔ اس سے امیدوں پر خاصی اوس پڑی، کیونکہ بھارتی لیفٹیننٹ تلنگے نے چند روز پہلے بتایا تھا کہ "بھارت کے وسائل بے شمار ہیں، ریل گاڑیوں کی کمی نہیں، بلکہ آرمی سپیشل (ARMY SPECIAL) تیار کھڑی ہیں۔ بس سمجھوتہ ہونے کی دیر ہے، پندرہ دن کے اندر اندر سب قیدی سرحد پار پہنچ جائیں گے۔" لیکن یہ چھ ماہ کا چکر کیا معنی؟

ہمارے کیمپ کے مبصر نے یہ گتھی یوں سلجھائی کہ بھارت نے سہ طرفی تبادلہ آبادی پر بیک وقت عمل درآمد کی شق رکھ کر سارے سمجھوتے کی چابی اپنے پاس رکھ لی ہے۔ یعنی جب قیدیوں کی واپسی معطل کرنے کو اس کا جی چاہے گا تو وہ بنگالیوں یا بہاریوں کی منتقلی کی سست رفتار کا بہانہ بنائے گا۔ اور اگر وہ ہم سے جلدی خلاصی حاصل کرنا چاہے گا تو اپنے کسی دوست ملک سے بحری جہاز لیکر سارے بنگالیوں اور بہاریوں کو ٹھکانے پر پہنچا دے گا۔"

ان پانچ چھ ماہ میں ہماری باری پہلے آتی ہے، درمیان میں یا سب سے آخر؟ اس سوال کا کوئی حتمی جواب میسر نہ تھا۔ کئی روز کی کھسر پھسر سے صرف اتنا پتہ چلا کہ ہر کیمپ کو ریل گاڑیوں کا شیڈول دے دیا گیا ہے۔ ہمارے کیمپ کی گاڑی کب جائے گی؟ جوانوں سمیت ہم سب ایک ہی ریل گاڑی میں سما جائیں گے۔ بھارت کو زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑے گا۔ اگر اس کے پاس ریل گاڑیوں کی کمی ہو تو ہمیں آزاد کر دے، ہم پیدل چل کر بھی وطن پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ کئی دنوں کی کاوش کے بعد ہمارے مبصر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری باری سب سے آخر میں آئے گی، کیونکہ بھارت پہلے چھاؤنیوں میں قائم شدہ کیمپ خالی کرائے گا جیل تو محفوظ جگہ ہے، اسے آخر میں بھی خالی کرایا جا سکتا ہے۔

یہ مایوس کن تبصرہ ایک صاحب کو پسند نہ آیا تو اس نے جلد وطن جانے کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ جیل بوسیدہ ہے، نیلامی میں پہلے ہی ایک ٹھیکیدار اسے خرید چکا ہے، اس جگہ نئی مارکیٹ بننی ہے۔ پہلے یہ جیل دسمبر ۱۹۷۲ء تک خالی ہونی تھی، لیکن نہیں ہو سکی۔ ٹھیکیدار نے بھارتی فوج کو ہرجانے کا نوٹس دے رکھا ہے کہ اگر اس سال جیل خالی نہ کی تو اتنے لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے، اس لیے بھارتی فوج فوراً جیل خالی کرنا چاہتی ہے، لہٰذا پہلے ہم جائیں گے — (دیکھیں آپ نے قیدیوں کی معلومات!)

ابھی یہ فیصلہ نہ ہو پایا تھا کہ ہم پہلے جائیں گے یا آخر میں کہ مجھے دوسرے چند مریضوں سمیت تھوڑی دیر کے لیے پی ڈبلیو ہسپتال جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھارتی ڈاکٹر نے ہمیں دوا دینے کی بجائے مشورہ دیا کہ جہاں اتنا عرصہ صبر کیا ہے، چند روز اور صبر کر لو، اب پاکستان جا کر ہی علاج معالجہ کرانا۔

ہسپتال سے واپس دارالعوام پہنچا تو سب لوگ میرے گرد جمع ہو کر "بیرونی دنیا" کی خبریں پوچھنے لگے۔ مَیں نے بھارتی ڈاکٹر کے حوالے سے انہیں بتایا کہ دیدۂ تر کی شنوائی ہوا چاہتی ہے۔ بس چند روز کی بات ہے۔ یہ سُن کر سامعین کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ اس خوشی کی بنیادیں کمزور ہیں، لیکن پھر بھی راحت ہوئی کہ

محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

یہ خوشخبری سنتے ہی بعض لوگوں کو سنجیدگی ڈس گئی۔ ایک کہنے لگا "میری تو تفہیم القرآن کی ابھی دو جلدیں باقی ہیں۔" دوسرا بولا "مجھے ونسٹن چرچل کی دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ ختم کرنے میں کم از کم دو ہفتے لگ جائیں گے۔" تیسرے نے کہا "ابھی تو میں نے فرانسیسی زبان کے صرف پندرہ سبق ختم کیے ہیں"۔ جب انہیں کہا گیا کہ آزادی کے سامنے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا حیثیت ہے، تو کہنے لگے "آزادی کی قدر و قیمت تسلیم، لیکن پتہ نہیں پاکستان جا کر ان منصوبوں پر عمل ہو سکے گا یا نہیں۔"

ایک اور صاحب نے اپنے مسائل کا یوں ذکر کیا کہ "اب روزانہ صبح صبح اُٹھنا پڑے گا، شیو بنانی ہوگی، صاف ستھرے کپڑے پہننے ہوں گے۔ مالی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی طرف توجہ دینی پڑے گی۔" اس کے ساتھی نے کہا "یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ مجھے تو نجی زندگی کی فلک بوس عمارت متزلزل نظر آتی ہے۔ مَیں نے ہمیشہ اپنی بیوی کو اصل سے کم تنخواہ بتائی۔ اب اس کو صحیح تنخواہ کا علم ہو گیا ہے۔ وہ پوچھے گی کہ مجھے گھر کا خرچ چلانے کے لیے چند ٹکے دے کر باقی تنخواہ کس کلموئی پر نچھاور کرتے رہے....."

ایک زیرک شخص جو مسائل کا ذکر سُن رہا تھا، بول اٹھا: یار! مسائل سے کیا گھبرانا! مسائل ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ جب ہر عزیز، رشتہ دار، دوست اور دوست کا دوست اسیری کی داستان پوچھے گا تو میں وہی واردات بار بار سُنا کر تھک جاؤں گا۔ ہر نووارد یہی سمجھے گا کہ حال پوچھ کر مجھ پر احسان کر رہا ہے، لیکن میں کتنا بدحال ہو جاؤں گا، اس کی اسے خبر نہ ہوگی۔ اسی طرح جب احباب ضیافت دیں گے تو عجب مشکل آپڑے گی، کیونکہ اگر چند لوالے زیادہ کھا لیے، تو وہ کہیں گے ہائے بیچارہ، جانے کب کا بھوکا ہے، کھانے پر قیدیوں کی طرح ٹوٹ پڑا ہے! اور اگر ہاتھ ذرا کھینچ کر رکھا تو رحم کھا کر کہیں گے کہ سالوں بھوکا رہنے کے بعد بیچارے کی انتڑیاں سُکڑ گئی ہیں۔ اب معدہ غذا قبول نہیں کرتا، اُف خدایا قید کتنی بڑی بلا ہے...!"

ان ذاتی اور نجی تفکّرات سے ہٹ کر کئی لوگوں نے قومی سطح پر سوچنا شروع کیا۔ ایک نے کہا "مَیں رہائی کے بعد از سرِ نو زندگی کا آغاز کروں گا۔ میری زندگی کے تین اصول ہوں گے۔ حق گوئی، محنت اور رفاہِ عامہ"۔ دوسرے نے کہا "پاکستان کی صحیح قدر جیل میں ہوئی ہے۔ میں جہاں کہیں بھی ہُوا ہمیشہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دُوں گا۔" تیسرے نے اعلان کیا کہ "آئندہ دنیوی لہو و لعب میں مصروف رہنے کی بجائے اپنی زندگی اسلام کی خاطر وقف کر دوں گا۔"

ایک فوجی انسٹرکٹر دوسروں سے الگ تھلگ بیٹھے خاکی پتلون کاٹ کر نیکر بنا رہے تھے۔ جب ہر شخص اپنے منصوبوں کا اعلان کر چکا تو یہ بولے "حضرات! ارادہ کچھ بھی ہو، اس پر عمل کرنے کے لیے صحت ضروری ہے اور صحت کے لیے ورزش۔ چنانچہ چھوڑو پڑھائی اور تاش بازی۔ کل سے جان بناؤ جان، اپنے بھی کام آئے گی اور ملک کے بھی۔ ہر جسم کی مناسبت سے موزوں ورزش کا انتخاب اور اس کی سکھلائی میرے ذمّے۔۔۔ سب کچھ آنریری طور پر، صرف کمپنی کی مشہوری اور خدمتِ خلق کی خاطر۔ کوئی ہے جو شاگردی کا دم بھرے؟"

اس نیم سنجیدہ اعلان کا کئی دلوں پر خاصا اثر ہوا۔ ایک نے کہا "ہاں یار، تن آسانی کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب تک جسمانی لحاظ سے خود فِٹ نہ ہوں گا، جوانوں کو کیا ٹریننگ دوں گا۔ لہٰذا ابھی سے STAMINA ○ بنانا چاہیے۔" دوسرا بولا "اگر پیٹ چھاتی سے آگے نکل گیا تو مَیں ترقّی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤں گا، لہٰذا پیٹ اور کم کرنا چاہیے۔" ایک اور ساتھی نے لقمہ دیا "ترقّی یا تنزّل تو اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے، فوجی افسر کو توند زیب ہی نہیں دیتی۔۔۔"

انہی حضرات میں سے ایک نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ بلاشبہ تمہارے کام میں جسمانی مشقت کا زیادہ دخل نہیں، پھر بھی ورزش بہت مفید چیز ہے۔ کل صبح تلاوت کے بعد نیکر پہن کر میدان میں آجاؤ، پاکستان جانے سے پہلے تمہیں اے ون (A-1) ● کر دوں گا۔ اگر نیکر نہیں ہے، تو میری لے لینا۔ مَیں نے کل ہی پرانی پتلون کاٹ کر بنائی ہے۔۔۔ اچھا، ضرور آنا۔۔۔!"

اگلے روز میں نے نیکر کی بدولت اپنی ٹانگوں کی نمائش کرنے سے پہلے گردوپیش کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ لوگ اپنی اپنی ضرورت اور سوجھ بوجھ کے مطابق اپنے جسم کو بنا سنوار رہے ہیں۔ تین نوجوان تیز تیز قدموں سے لنگر اور اس سے ملحقہ گراؤنڈ کے چکّر کاٹ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص ایک میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ اس کا مسئلہ تیز رفتاری نہیں، بلکہ ہر قدم کے ساتھ اپنے بھاری جسم کو آگے پھینکنا ہے۔ وہ ہر سانس کے ساتھ جسم کو یوں آگے

○ قوتِ برداشت کار ● بہترین حالت میں

دھکا دیتا جیسے ناتواں بچہ ٹرک کا بھاری ٹائر آگے دھکیلتا ہے۔

دوڑ کے میدان سے ہٹ کر چند افراد اینٹوں کے ڈمبل (DUMBLE) بنا کر مسل (MUSCLE) بنا رہے تھے۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کے دونوں سروں پر آٹھ آٹھ اینٹیں باندھ کر ویٹ لفٹنگ (WEIGHT LIFTING) کر رہے تھے۔

ان سے ذرا پرے میجر عثمانی انسٹرکٹر کی مدد سے ریڑھ کی ہڈی مضبوط کرنے میں مصروف تھے، کیونکہ ان کے اُستاد کا کہنا تھا کہ بڑھاپا ریڑھ کی ہڈی میں کمزوری سے پیدا ہوتا ہے۔ میجر عثمانی نے مجھے محوِ تماشا دیکھ کر آواز لگائی "شرماؤ نہیں۔ میدان میں کود آؤ۔ اگر نیکر نہیں ہے تو اسی طرح پاجامے میں چلے آؤ۔ یہاں لباس کی کوئی قید نہیں۔ ورزش بڑی اچھی چیز ہے۔"

میں یونہی مٹکتا مٹکتا میجر عثمانی کے قریب آیا تو انسٹرکٹر نے کہا "دیکھتے کیا ہو؟ یہ چھٹیچر سے چپّل اکھاڑے سے باہر اتار دو اور پہلی ورزش شروع کرو۔" پھر اس نے الفاظ اور نمونے کی مدد سے اس ورزش کی تشریح کی۔ میں نے سکھائے ہوئے طریقے کے مطابق پہلی ورزش شروع کی، پھر دوسری، پھر تیسری، حتیٰ کہ پانچویں ورزش تک سارا سبق پہلے ہی روز لے لیا۔ انسٹرکٹر کا کہنا تھا کہ اگر میں روزانہ آدھ گھنٹہ یہ پانچوں ورزشیں کر لیا کروں تو ایک ماہ میں میرا جسمانی معیار پی ٹی کورس میں داخلہ لینے والوں کے برابر ہو جائے گا۔"

اگرچہ اس عمر میں پی ٹی کورس کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، پھر بھی انسٹرکٹر کی باتوں میں آکر پانچوں ورزشیں کرتا رہا۔ پاجامہ اوپر کھینچ لیتا، آستین چڑھا لیتا اور حتیٰ المقدور ہاتھ پاؤں مارتا رہتا۔ یہ مشقیں بظاہر بہت سادہ اور بے ضرر معلوم ہوتی تھیں، لیکن جوں جوں ان سے قریبی واسطہ پڑا، انہوں نے میرا سانس پھلا دیا اور پیشانی پر عرقِ مشقت کے موتی تیرنے لگے۔ منہ خشک اور چہرہ تر ہونے لگا۔ ذرا سستانے کو رُکا تو انسٹرکٹر نے اُستادانہ رائے دی "رُکنا نہیں، ورنہ سارا کیا دھرا اکارت جائے گا... جاری رکھو... رکو مت۔" گویا ورزش نہ ہوئی شراب کی کشید ہوئی کہ آنچ دینے میں کمی رہ گئی تو ذائقے اور نشے میں فرق آجائے گا۔

میں نے دو چار روز کے بعد پاجامہ اتار کر نیکر پہنی۔ چند دنوں میں لوگوں کو اپنی ٹانگوں سے مانوس کرا چکا تو پھر قمیض کی بجائے بنیان میں پی ٹی کرنے لگا۔ شروع میں لوگوں نے میرے شانوں اور چھاتی کے پٹھوں کو بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن میں نے ان کی پروا نہ کی۔ جب سب لوگ میرے اوپر اور نیچے کے دھڑ سے مانوس ہو چکے تو میں نے پی ٹی شوز بھی پہن لیے اور یوں بالکل اصلی پی ٹی کرنے والوں کی طرح لگنے لگا۔ کسی کو کیا پتہ تھا کہ اندر سے جعلی ہے۔ کوئی کھرید کر تھوڑا ہی دیکھتا ہے! جو نظر میں آیا وہی سمجھ لیا!

ایک ماہ بعد میں اس قابل ہو گیا کہ بیماروں، معذوروں اور عمر رسیدہ لوگوں کو زمین پر پھدکنے، درخت سے لٹکنے یا لنگر کے چکر کاٹنے کا چیلنج دے سکوں۔ کئی ایک کو للکارا بھی، لیکن میدان میں اُترنے کا کسی کو حوصلہ نہ ہوا۔

ذہنی اور جسمانی صحت وہ سب سے بڑا تحفہ تھا جو ہم اسیری سے وطن لانا چاہتے تھے۔ لیکن اس متاعِ بے بہا کے علاوہ بعض لوگوں کو مادی تحائف کا بھی خیال آیا۔ ایک نے تجویز کیا کہ ہمیں تاج محل کا نمونہ ساتھ لے جانا چاہیے تاکہ یہ ہمیں اصلی تاج محل پر ہمارے حقوق کی یاد دہانی کراتا رہے۔ دوسرے نے کہا "نہیں، ہرگز نہیں۔ کوئی تحفہ لے جانا تقاضائے حبِ وطن کے منافی ہے۔ اور تاج محل کے نمونے کا انتخاب تو اور بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ جس گھر میں یہ نمونہ ہو گا، اس پر لوگ انگلیاں اٹھائیں گے کہ اصلی تاج محل کو بھول کر اس حقیر نمونے پر قناعت کر لی۔"

میں نے ایک جواں سال دوست سے اس بارے میں مشورہ کیا تو اس نے تن کر تحائف لے جانے کے خلاف دھواں دھار تقریر کر دی "پاکستان میں کس چیز کی کمی ہے! کھانے پینے، رہنے سہنے اور گھر بار سجانے کے لیے ہر چیز ملتی ہے اور بھارت کی نسبت سستے داموں ملتی ہے۔ تحفہ آدمی لے بھی جائے تو ایسی جگہ سے جس سے پیار ہو ا محبت ہو، جس کی یاد سینے میں محفوظ کرنے کا ارادہ ہو۔ ہم قیامِ آگرہ کی تلخ یادیں کیوں سینے سے چمٹائے رہیں۔ میرے خیال میں تو روانگی سے قبل یہ وردی، یہ پلیٹ، یہ مگ، یہ صابن، بلکہ سیفٹی ریزر (SAFETY RAZOR) میں

لگا ہوا بھارتی بلیڈ تک نکال کر جلا دینا چاہیے۔"

میں نے دِل سے پوچھا کہ بھئی تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا۔

جورِ ستم یاد رکھ، قیدِ قفس کا غم نہ کر

یعنی اگر کچھ نہ کچھ ضرور لے جانا ہے تو جور و ستم کی یادیں، غم و اندوہ کی فریادیں اور دردِ دل کی داستانیں لے جاؤ، ان سے زیادہ قیمتی متاع تجھے کہاں ملے گی۔

چنانچہ میں نے انہی تین تحفوں کے بنڈل باندھے اور پیکٹ سرہانے کے نیچے رکھ کر وطن روانگی کا انتظار کرنے لگا!

○ ○

غالب سے اقبال تک

اکتوبر ۱۹۷۳ء کے ابتدائی دن تھے۔ ماہِ صیام تازہ تازہ شروع ہوا تھا۔ ہم حسبِ معمول رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے اور جب یادِ وطن ستاتی تو

گر بُوئے گُل نہیں، نہ سہی، یادِ گُل تو ہے

کہہ کر دل کو تسلّی دے لیتے۔ دہلی معاہدے کی پیدا کردہ اُمّیدیں اب پھر حقیقت کی دبیز چادر اوڑھ کر سو چکی تھیں۔ ہم غیر مصدّقہ اطّلاعات سے یہ اخذ کر چکے تھے کہ آگرہ کے مکینوں کی باری دسمبر یا جنوری میں آئے گی۔

انہی دنوں کیمپ کے سرکاری دفاتر میں غیر معمولی ہلچل ہونے لگی۔ بھارتی بابو دن رات ٹک ٹک ٹائپ کرتے رہتے۔ جب ان سے کام سنبھالا نہ جاتا تو کیمپ سے پاکستانی ٹائپسٹ بیگار پر لگا لیتے۔ بھارتی افسر اب خلافِ معمول سہ پہر اور شام کو دکھائی دینے لگے۔ ہمارے سراغرسانوں کو اِس غیر معمولی مصروفیت کی بھنک پڑی تو وہ اصل بھید پانے کی ٹوہ میں لگ گئے۔ کئی روز کی غواصی کے بعد وہ خبر لائے کہ آگرہ جیل پہلے خالی کی جائے گی، پروگرام بدل گیا ہے، اس لیے کیمپ کی انتظامیہ دن رات کام کر کے ہماری بروقت روانگی کی تیّاریوں میں مصروف ہے۔ ہم نے سمجھا چلو

کچھ کچھ سحر کے رنگ پَر افشاں ہوئے تو ہیں؟

لیکن اِس خوش فہمی کی کوئی سرکاری تائید یا تردید نہ ہو سکی۔ پھر بھی خیالوں کو حرص کے

خوشے لگنے لگے۔ ہماری نگاہِ تصوّر اس روزِ روشن کے بوسے لینے لگی جو ہمیں واہگہ بارڈر پر طلوع ہوگا، جب نظر میں پھول مہکیں گے، دل میں شمعیں جلیں گی، اور جب ارضِ وطن کا ذرّہ ذرّہ اُٹھ کر ہمارے قدموں سے لپٹ جائے گا۔

اتنے میں عرب و اسرائیل جنگ چھڑ گئی۔ ایک صاحب بھاگے بھاگے آئے اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: "سُنا تم نے، عربوں نے اپنے علاقے واپس لینے کے لیے جنگ چھیڑ دی ہے۔" عرض کیا:

"جی ہاں، نہ صرف خبر سُنی ہے بلکہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ مصر نے اسرائیلی مدافعت کے باوجود نہر سویز پار کر لی ہے اور اب مصری فوجیں سینائی میں پیش قدمی کر رہی ہیں۔"

کہنے لگے: "وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس جنگ کا دائرہ وسیع ہو گیا تو کیا ہماری وطن واپسی تو ملتوی نہیں ہو جائے گی۔" عرض کیا: "ایسا کوئی امکان تو نظر نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی بہانے روانگی ملتوی ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔"

عرب و اسرائیل جنگ میں ہماری دلچسپی ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ہم نے پرانی کتابوں سے میدانِ جنگ کے نقشے نکال کر سامنے رکھ لیے اور ان کی مدد سے مصری فوج کی پیش قدمی اور اسرائیلیوں کی پسپائی کا مطالعہ کرنے لگے۔ جب مصری تازہ حملہ کرتے، ہم خوشی سے اُچھلنے لگتے اور جب اسرائیلیوں کے جوابی حملے کی خبر آتی تو ہمارے دل بیٹھنے لگتے۔ لیکن اس فوجی اور اسلامی اہمیت کے معرکے کی کشش کے باوجود بعض احباب کے دل ابھی تک آگرے سے رہائی کے تصوّر سے جُدا نہیں ہوئے تھے۔ ایک آدھ دفعہ آتے جاتے کسی ریڈیو سُننے والے سے جنگ کی تازہ صورتِ حال پوچھی تو جواب ملا: "پہلا قافلہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں روانہ ہوگا۔"

چند دن بعد واقعی ریڈیو پاکستان نے جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی

سُنائی کہ پہلے آگرے سے قیدی آئیں گے، پھر بریلی اور پھر میرٹھ سے۔ دل میں خوشی کے لڈّو پھوٹنے لگے۔ گویا صبح ہونے کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر! لیکن آگرہ کیمپ سے مراد لازماً کیمپ نمبر ۴۴ تو نہ تھی کیونکہ آگرے میں جیل کے اندر اور باہر کوئی نصف درجن کیمپ تھے۔ کیا پتہ پہلے پی۔ ڈبلیو ہسپتال اور اس سے ملحقہ کیمپ خالی کیے جائیں یا آگرہ جیل کے کیمپ نمبر ۴۸ اور کیمپ نمبر ۷، چلے جائیں اور ہماری باری بعد میں آئے اور اگر کیمپ نمبر ۴۴ بھی کُوچ کر جائے تو اس کا کیا اعتبار کہ ہم سب چلے جائیں گے کیونکہ بھارت کو ایک سَو بچانوے جنگی قیدی روکنے بھی تو تھے۔ کیا پتہ کچھ لوگ ہمارے کیمپ سے بھی روک لیے جائیں — دل پھر وسوسوں کی پُرپیچ راہوں میں کھو گیا۔

ریڈیو پاکستان کی اس خبر سے وسوسوں کے کئی بادل چھٹ گئے کہ آگرہ سے پہلی گاڑی دس اکتوبر کو واہگہ پہنچے گی اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر ۱۸ اکتوبر تک ہر روز جنگی قیدیوں کا ایک قافلہ آزاد فضا میں پہنچے گا۔ ہم نے آگرہ جیل کی کُل آبادی کو ان پانچ گاڑیوں میں تقسیم کیا تو اوسطاً ایک گاڑی میں ایک ہزار نفوس بنتے تھے جو رواج کے مطابق ایک ٹرین کے مسافروں کی تعداد بنتی ہے۔ اس سے دل کو تسلی ہوئی اور لوگ تیاریوں میں لگ گئے۔

جن لوگوں پر "جان بنانے" کا بھوت سوار تھا وہ صبح و شام پی ٹی اور ورزش کرنے لگے۔ جنہوں نے ڈاڑھی اور سَر کے بال بے لگام چھوڑ رکھے تھے، انہوں نے انہیں قینچی اور مشین دکھائی۔ اس عمل سے جو چہرے بے نقاب ہوئے انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا۔ جتنے حِصّے پر ڈاڑھی کے جنگل کا تسلط رہا تھا وہ باقی حِصّوں کی نسبت زیادہ گورے اور سفید نظر آنے لگا۔ گویا ایک ہی چہرے کے دو رنگ نظر آنے لگے۔ گورا اور کالا، گورا اور زیادہ گورا یا کالا اور کم کالا۔ لیکن اس دو رنگی کے شکار حضرات کو کوئی تشویش نہ ہوئی بلکہ تسلّی تھی کہ وطن پہنچنے تک رنگ سے رنگ مل جائے گا۔

اسیری کے دوران کچھ لوگوں کے سر پر برف اُگ آئی تھی۔ انہوں نے خضاب سے اسے

پگھلانا شروع کر دیا اور ہر دوسرے روز ایک بُوڑھا جوان نظر آنے لگا۔

البتہ ہمارے ایک دوست کا مسئلہ ذرا پیچیدہ تھا جو نہ ڈاڑھی مُنڈوانے سے حل ہو سکا اور نہ خضاب لگانے سے۔ اِس مسئلے کا پس منظر یہ تھا کہ اسیری سے پہلے اُن کی شادی کی بات چل رہی تھی اور خیال تھا کہ چالیس برس کے سِن کے باوجود کوئی نہ کوئی بنتِ حوّا ایسی مل جائے گی جو "سچ پکے سو میٹھا ہو" پر اعتقاد رکھتی ہو۔ لیکن اسیری کے دو برسوں نے نہ صرف ان کی عُمر میں اضافہ کر دیا تھا بلکہ اور بھی کئی چرکے لگائے تھے۔ اب نہ صرف ان کے جسم کا ہر نمایاں حِصّہ سفید بالوں کی زد میں تھا بلکہ ان کے چہرے پر جھریاں، آنکھوں میں تیرتا ہوا پانی اور ہاتھوں میں رعشے کی سی کیفیّت پیدا ہو چلی تھی۔ وہ اکثر سَر، ڈاڑھی اور مونچھوں پر خضاب لگاتے، چہرے پر مالش کرتے اور ہاتھوں کی ورزش کرتے نظر آتے۔ ایک شرارتی نوجوان نہایت سنجیدہ بن کر اُن کے پاس گیا اور ہمدردی سے کہنے لگا: "حضور! آپ صبح صبح اُٹھ کر ریڈیو سری لنکا سُنا کیجیے، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔" مریض نے تعجّب سے اپنی خضاب آلود بھنویں اُوپر سکیڑ کر وضاحت طلب کی تو نوجوان نے کہا: "میری مراد کمرشل ریڈیو سے ہے جس میں صحت بخش گانوں کے علاوہ بالوں کو سیاہ کرنے، جُھریاں مِٹانے اور رعشے پر قابو پانے کے لیے ادویات کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیے۔ ان چیزوں میں ضرور تاثیر ہوگی۔ ریڈیو والے صبح سویرے ہر روز جھُوٹ تو نہیں بول سکتے۔" محترم نے اصولی طور پر مشورہ قبول کر لیا، لیکن وقت کی کمی کے پیشِ نظر اس پر عمل پاکستان واپسی تک ملتوی کر دیا۔

چہرے اور جسم کے بناؤ سنگھار کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی بھی فکر لاحق ہوئی۔ کئی صاحبِ حیثیّت قیدیوں نے پاکستان سے آنے والے فالتو کپڑے سنبھال کر سٹور میں جمع کرا دیے تھے کہ واپس جاتے وقت پہنیں گے۔ لیکن ایسے دُور اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ عموماً لوگ تحائف والے کپڑے استعمال کر چکے تھے اور ان پر پی۔ ڈبلیو کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اب

وہ مختلف طریقوں سے یہ چھاپ مٹانے لگے تاکہ بارڈر پار کرتے وقت ذلّت کے یہ داغ سینے پر روشن نہ ہوں ـــــ لیکن یہ داغ ایسے پکّے تھے کہ مٹائے نہ مٹے۔

ہم اپنی اپنی تیاّریوں میں مصروف تھے کہ خبر آئی کہ پہلی ٹرین کیمپ نمبر ۸۰ کے افسروں اور جوانوں کو لے کر جائے گی۔ جوانوں کے متعلّق تو پہلے ہی تسلّی تھی کہ ان پر نام نہاد جنگی جرائم کی تہمت نہ تھی۔ لیکن افسروں کے متعلّق سوچنے لگے کہ پتہ نہیں کون کون جاتا ہے، کیونکہ آغازِ اسیری میں یہ خبر اُڑی تھی کہ "جنگی مجرموں" کا ڈیرہ کیمپ نمبر ۸۰ میں ہوگا۔ اگر وہ چلے گئے تو سمجھ لیجیے کہ جنگی جرائم کا پرچار محض ایک ڈھونگ تھا۔ البتّہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کیمپ کے موجودہ مکینوں کو پہلے پاکستان روانہ کر کے باقی تمام کیمپوں سے "جنگی مجرم" یہاں رکھے جائیں کیونکہ جیل کا مرکزی حصّہ ہونے کی وجہ سے یہ ہندوستان کا محفوظ ترین مقام تھا (اور بالآخر یہی ہوا)۔

ایک افواہ یہ بھی پھیلی کہ کیمپ سے سب لوگ روانہ ہوں گے، لیکن راستے میں مناسب مقام پر "جنگی مجرموں" کا ڈبّہ الگ کر لیا جائے گا اور دوسرے مسافروں کو اس کی خبر واہگہ پہنچ کر ہوگی۔ اس احتیاطی تدبیر کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بھارت کو ڈر ہے کہ کیمپ میں اگر چند جنگی قیدیوں کو 'مقدمہ بازی' کے لیے الگ کیا گیا تو باقی قیدی مشتعل ہو جائیں گے اور نظم و نسق میں خلل پڑے گا۔

اس افواہ کا ہمارے پاس ایک ہی توڑ تھا کہ پہلی ٹرین میں جو لوگ آگرہ (کیمپ ۸۸) سے روانہ ہوں، ان کے ناموں کی تصدیق اگلے روز شام کو ریڈیو پاکستان سے کر لی جائے کیونکہ وطن پہنچنے والوں کے ناموں کا اعلان بلاناغہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم نے کیمپ نمبر ۸۸ سے "ڈپلومیٹک بیگ" (وہی والی بال میں ہوا بھروانے کا بہانہ) کے ذریعے ناموں کی فہرست منگوائی۔ اس کی تین نقلیں تیاّر کیں اور اگلے روز تین مختلف افراد نے ریڈیو پاکستان کے نشریے سے ان ناموں کی تصدیق کی۔ دل کو تسلّی ہوئی کہ ڈبّہ کاٹ لینے والی بات غلط نکلی۔

اِس کے باوجود سارے کیمپ میں ایک ہیجانی کیفیّت تھی، کسی کو کسی کل قرار نہ تھا۔ کوئی کہتا کہ یہ پاکستان جانے کے لیے بیقراری ہے، کوئی توضیح کرتا کہ یہ پیچھے رہنے والے نام نہاد جنگی مجرموں سے ہمدردی کا پرتو ہے۔ کوئی ساری بحث کو نفسیاتی رنگ دے کر کہتا کہ یہ تحت الشعور میں کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف یہ خوشی ہے کہ وطن واپسی کا وقت آپہنچا ہے اور دوسری طرف تحت الشعور میں یہ خوف ہے کہ ایک سَو پچانوے کی فہرست میں نام نہ ہو۔ وجہ کچھ بھی سہی کیمپ کا رنگ یکسر بدل گیا تھا۔ اب نہ کسی کا خوش گپّیوں سے وقت گزرتا تھا نہ کسی شغل (مطالعہ وغیرہ) میں دل لگتا۔ ہر شخص سیمابی کیفیّت میں تھا۔ کوئی کونے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھُونک رہا تھا۔ کوئی سوچ کا بُت بنا خلا میں گھُور رہا تھا اور کوئی تیز تیز ڈگ بھرتا ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جاتا اور راستے میں جو ملتا اُس سے پُوچھتا: "کیا آج ۹ اکتوبر ہے؟ ۔۔۔۔ آج ۹ اکتوبر ہی ہے نا ۔۔۔۔۔ اچھّا"۔ ایک صاحب بیقراری پر قابو پانے کے لیے دُور سب سے الگ بنچ پر جا بیٹھتے، لیکن چند لمحوں بعد اُٹھ کھڑے ہوتے اور آنکھ جھپکنے میں درخت کے تنے کے ساتھ مٹّی کی منڈیر پر جا بیٹھتے، وہاں بھی قرار نہ آتا تو اندر چارپائی پر جا لیٹتے۔

اب ہم حساب لگاتے کہ اگر آخری گاڑی (۱۸ اکتوبر) میں بھی گئے تو پانچویں دن واہگہ پہنچیں گے۔ یعنی آزادی میں صرف ایک سَو بیس گھنٹے باقی ہیں۔ کیا واقعی منزل اتنی قریب ہے؟ کیا واقعی ہم نے ظلمت کی دیوار چاٹ چاٹ کر اِتنی پتلی کر دی ہے کہ اس کے پیچھے نورِ وطن نظر آنے لگا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ ہم چھٹے دن انارکلی، گلبرگ اور مال روڈ کی سَیر کر رہے ہوں گے؟؟ کہیں اس تصوّر کو نظر نہ لگ جائے۔ کہیں یہ شیشے، یہ ساغر لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی چُور نہ ہو جائیں، کہیں ساقی کی نیّت ہی نہ بدل جائے!

ہم نے اس خیالی جنّت کے کسی گوشے میں وہم کے منحوس پرندے کو گھونسلہ بنانے

کی اجازت نہ دی۔ ہمارے ذہن میں حسبِ دستور ارضِ وطن کی روشن گلیاں سجی ہوئی تھیں۔ اس کی مانوس راہیں ہمیں آواز دے رہی تھیں، گویا ہجر وصل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

یُوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آبھی گئی وصل کی رات

لیکن گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی تو پھر وہی جیل کی پژمردہ فصیلیں، وہی لوہے کی سلاخیں، وہی خاردار تار، وہی پہرے دار اور وہی رول کال۔ یا اللہ! سحر ہونے میں اتنی دیر کیوں ہے؟ شبِ انتظار اتنی سُست رَو کیوں ہے؟ دیوار کی اوٹ سے آزادی کا سُورج طلوع ہونے سے ہچکچاتا کیوں ہے؟ اگر ہم لپک کر منزل کی آغوش میں نہیں پہنچ سکتے تو منزل چند قدم آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیوں نہیں کرتی؟

جنہیں ۱۲ اکتوبر کو واہگہ پہنچنا تھا انہیں دو روز پہلے روانگی کا حکم سُنایا گیا۔ دفتر میں بُلا کر اُن سے ضروری کاغذات پر دستخط کرائے گئے اور تحفے کے طور پر ایک ایک خاکی جنگل ہیٹ (JUNGLE HAT) دیا گیا جس کے پیٹ پر (FOR REAL BROTHERS) یعنی "حقیقی بھائیوں کے لیے" درج تھا۔ یہ تحفہ وصول پانے والوں کا ایک تو جی چاہا کہ اسے غلاظت کا پلندہ سمجھ کر فوراً پھینک دیں، لیکن یہ سوچ کر پھر ہاتھ روک لیا کہ کہیں یہ واہگہ پہنچنے کا پاسپورٹ نہ ہو۔ اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسے رختِ سفر کے طور پر ساتھ رکھ لیتے ہیں، واہگہ پہنچ کر اسے نذرِ آتش کریں گے۔

روانگی سے پہلے کا ایک مرحلہ تلاشی تھا، شخصی تلاشی اور سامان کی تلاشی۔ پتہ نہیں ہماری تہی دامنی کے باوجود بھارت کو تلاشی اور بھرپور تلاشی پر اصرار کیوں تھا؟ ہم بھارت سے کیا لے جا سکتے تھے؟ اور جو یادیں ہم نے محفوظ کر رکھی تھیں وہ تلاشی لینے سے کہاں چھن سکتی تھیں!

تلاشی کے متعلق کیمپ والوں نے پہلے ہی یہ بات پھیلا دی کہ تلاشی نہایت مفصل اور سخت ہوگی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم سخت تلاشی کے ڈر سے "خطرناک" چیزیں خود ہی جلا دیں اور آخری وقت کہیں کسی چیز کے قابلِ اعتراض ہونے یا نہ ہونے پر جھگڑا نہ کھڑا ہو۔

لیکن دو سالہ قید نے ہمیں خاصا پکّا کر دیا تھا، اب ہم ستمگر کی ادا آزمائے بغیر بسمل ہونے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے آپس میں طے کیا کہ جب پہلی پارٹی ہم سے جُدا ہو کر اپنی آخری رات سَیلوں (CELLS) میں گزارے گی تو وہاں سے تلاشی کے متعلق مفصّل رپورٹ بھیجے گی اور بعد میں آنے والے اس تجربے کی روشنی میں اپنی اپنی چیزیں مثلاً کاغذات وغیرہ چُھپائیں گے یا جلائیں گے۔

سَیلوں سے رپورٹ منگوانے کے لیے یہ طریقہ طے کیا کہ وہاں سے کسی بھارتی این، سی، او یا جے، سی، او کو ایک پرچی پر پاکستان کے کسی مشہور شہر کا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا جائے گا اور رقعہ بردار کو ہدایت کی جائے گی کہ کیمپ میں فلاں افسر کو یہ ٹیلی فون نمبر پہنچا دینا اور کہنا کہ پاکستان میں مجھ سے ملنا ہو تو اس نمبر پر فون کر لینا۔

سارا راز ٹیلی فون نمبر میں پوشیدہ تھا جس کے لیے کوڈ (CODE) یہ مقرر کیا کہ اگر ٹیلی فون نمبر کراچی کا ہُوا تو اس کا مطلب ہو گا بہت ہی مفصّل اور سخت تلاشی۔ اگر لاہور کا ہُوا تو سمجھنا تلاشی میں اوسط درجے کی سختی برتی گئی اور اگر اسلام آباد کا نمبر ہوا تو سمجھنا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تلاشی کا درجۂ حرارت ماپنے کے لیے تو یہ بیرومیٹر (BAROMETER) کافی تھا۔ لیکن ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ سامان میں سے کس چیز کو پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ پوڈر کے ڈبّے کو، شیشے کی پشت کو یا بُوٹوں کے تلے (SOLE) کو؟ لہٰذا ان سب چیزوں کو نمبر الاٹ کیے۔ پوڈر کا ڈبّہ — ۱، صابن دانی — ۲، تکیہ — ۳، گدّا — ۴، بوٹ کا تلہ — ۵، شیشے کی پشت — ۶ وغیرہ۔

اگر ٹیلی فون نمبر میں کسی ہندسے کو دہرایا گیا تو سمجھ لینا کہ اس کو بار بار دیکھا، کسی کو ایک بار لکھّا گیا تو مراد ہو گی کہ دیکھا ضرور، لیکن سرسری طور پر اور اگر صفر کا ہندسہ آئے تو سمجھ لینا کہ اس نمبر پر آنے والی شَے کو سرے سے دیکھا ہی نہیں۔

سَیل میں پہنچنے کے بعد لیفٹیننٹ شاہد نے جو ٹیلی فون نمبر مجھے حوالدار تارا سنگھ کے ہاتھ بھیجا، وہ یہ تھا: اسلام آباد ۲۴۴۰۶ یعنی مجموعی طور پر تلاشی سخت نہ تھی۔ دو نمبر والی چیز

(یعنی صابن دانی) کو ایک بار دیکھا، چار نمبر والی (گدّا) کو بار بار ٹٹولا، پانچ نمبر (بوٹ کے تلے) کو نہیں چھیڑا اور چھ نمبر (شیشے کی پُشت) کو ایک آدھ دفعہ دیکھا۔

ہم نے اس رپورٹ کی روشنی میں اپنے کاغذات اور دیگر خزینے سنبھال لیے۔

چند دن پہلے بھارتی افسروں کی یہ بات مجھ تک پہنچی کہ ہمیں باقی افسروں کی تہی دامنی کا پورا پورا علم ہے، لیکن میجر سالک رات کی تنہائیوں میں اکثر لکھتا ہوا دیکھا گیا ہے، اس کی تلاشی سے ضرور نوادرات برآمد ہوں گے۔ لیکن اس دھمکی سے ڈر کر اپنا سرمایہ جلانے کو دل نہ مانا اور فیصلہ کیا کہ یُوں ہے تو یُوں ہی سہی۔ کاغذوں کی اہمیت کچھ بھی سہی، اب معاملہ بھارت کے چیلنج کا ہے۔ اسے اس میدان میں ضرور مات دینی ہے۔

چنانچہ مَیں نے ایک ایسا طریقہ سوچا جس کے ذریعے کاغذات بحفاظت پاکستان لائے جا سکتے تھے۔ میرے پاس گُردے کی بیماری کا بہانہ تو تھا ہی۔ بھارتی ڈاکٹر کیپٹن تنگے سے ایک سرٹیفکیٹ لیا کہ میجر صدیق سالک کو فلاں فلاں بیماری کی وجہ سے "مُنہ کے راستے" O زیادہ سے زیادہ پانی پینے کا مشورہ دیا گیا ہے، لہٰذا دورانِ سفر اسے پانی کی صراحی ساتھ رکھنے کی اجازت ہے۔ سرٹیفکیٹ پر اُس کے دستخطوں کے علاوہ سرکاری مُہر لگوائی اور اپنے پاس محفوظ کر لی۔

اس کے بعد بھارتی کوارٹر ماسٹر کو بچے ہوئے کوپن دے کر ایک صراحی منگوائی۔ وہ صراحی بھی نہایت موزوں لایا، مُنہ تنگ اور گلا اُس سے بھی تنگ، گویا بالکل شاعر کی خیالی محبوبہ کی طرح، غنچہ دہن اور صراحی دار گردن! ایسی صراحی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا (شاید شاعر کی محبوبہ کے دل کا راز بھی ہمیشہ تاریکی میں رہتا ہے)۔

میجر راٹھور جو شکار بازی سے سرنگ بازی تک کے محاذوں پر اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں

O (PLENTY OF WATER BY MOUTH) دواؤں کی عدم موجودگی میں یہ مشورہ مجھے کئی بار دیا گیا اور مَیں نے اسے مفید پایا۔

کا لوہا منوا چکے تھے، اب بھی میرے بہت کام آئے۔ انہوں نے صراحی کے پیندے میں نہایت خوبصورتی سے ایک انچ قطر کا سوراخ کیا اور پولی تھین (POLYTHENE) کاغذ میں لپیٹ کر میرے پرزوں کو واٹر پروف (WATER PROOF) بنایا اور سوراخ کے راستے انہیں صراحی میں ڈال دیا۔ اس بنڈل کا آخری سرا سوراخ میں پھنسا دیا تاکہ ہلانے سے اندر کسی چیز کے کھنکنے کی آواز نہ آئے۔ سوراخ کو پہلے سے چوری کیے ہوئے سیمنٹ سے بند کیا اور جب وہ خشک ہونے لگا تو اس پر پیندے سے اتری ہوئی مٹّی پیس کر لگا دی۔ رنگ سے رنگ ملا، دو چار قریبی احباب کو دکھائی تو انہوں نے تصدیق کی کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ روانگی سے قبل اس میں پانی ڈال کر اوپر گلاس رکھ دیا۔

ہمارے کیمپ کا پہلا قافلہ روانہ ہونے لگا، تو ہمارے ایک بزرگ نے ہمیں اکٹھا کر کے وعظ کیا کہ جب واہگہ بارڈر پر پہنچو تو اپنے جذبات پر قابو رکھنا اور سپاہیانہ وقار کے ساتھ پار اُترنا۔ اہلِ وطن یہ نہ سمجھیں کہ ہم دو سال میں فوجی ڈسپلن بھول گئے۔ خواہ مخواہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ان کا مشورہ پلّے باندھا اور روانگی کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس قافلے کو الوداع کہنے پھاٹک تک گئے جہاں انہیں گلے لگایا، ماتھے پر بوسہ دیا اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ جب ہم پھاٹک سے لوٹے تو ہمارے واعظ بار بار رومال سے آنسو خشک کر رہے تھے، مجھے دیکھ کر کہنے لگے: "ہاں، جذباتی ہونا اچھا نہیں لیکن یہ موقع ہی ایسا ہے"۔ مَیں نے سوچا کہ اگر یہ موقع ہی ایسا ہے تو واہگہ والا موقع کیسا ہوگا!

تیسرے قافلے میں میرا نام تھا۔ چنانچہ مجھے اور میرے ساتھ چھتّیس افسروں کو کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے دفتر طلب کیا گیا۔ ہمارے دل سے ابھی تک "۱۹۵ جنگی مجرموں" والا خطرہ بالکل نابود نہ ہوا تھا اور دفتر میں بلائے جانے یا کاغذات پر دستخط کرنے کا قطعاً یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم واقعی پاکستان پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ہم ایڈجوٹنٹ کے کمرے کے

باہر کھڑے تھے، ماحول میں کشیدگی، غیر یقینی اور بے قراری تھی، لیکن اس کے باوجود میجر عزیز کو شرارت سوجھی۔ انہوں نے ہمارے ایک سادہ لوح ساتھی سے کہا: "آپ اس خطرناک ٹولے میں کیسے آ پھنسے؟ یہ تو خطرناک لوگوں کا گروہ ہے جنہیں جنگی جرائم کے سلسلے میں پیچھے رہنا ہے۔ بھارت کو ۱۹۵ جنگی قیدی گھر سے تو پورے کر کے نہیں دینے ... یہ دیکھو خطرناک آدمی ۱ سالک کھڑا ہے جو ڈھاکے میں پتہ نہیں کیا کچھ کرتا رہا کہ کلکتہ سیل میں گلتا سڑتا رہا۔ مجھے دیکھو خطرناک آدمی ۲، ایم۔ پی میں ہونے کی وجہ سے نظم و ضبط بحال رکھنے کی خاطر میں نے کئی بنگالیوں کے دل دکھائے۔ وہ دیکھو میجر غفور ... کیسے خطرناک شعبے سے ان کا تعلق ہے ... میجر صاحب آپ تو خالص سپاہیانہ فرائض انجام دیتے رہے ہیں، آپ اس ٹولے میں کیسے آ پہنچے، اللہ رحم کرے!"

تیر نشانے پر بیٹھا، سادہ لوح میجر صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیری، دو تین بار تیز تیز پلکیں جھپکیں اور پھر "آرام شو (STAND EASY) حالت میں کھڑے ہو کر سینہ پھلایا اور سپاہیانہ جذبے سے کہا: "کوئی بات نہیں، آنے دو، دیکھا جائے گا!"

ہم دستخط کر کے لوٹے تو ریڈ کراس (ہلالِ احمر) کی طرف سے واپسی (REPATRIATION) کے کارڈ جاری ہوئے جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ قیدی ضرور واہگہ پہنچیں گے۔ ریڈ کراس والے بھلا فالتو کارڈ بھروا کر کیوں ضائع کرتے!

سابقہ قافلوں کی طرح ہمیں بھی چوبیس گھنٹے قبل کیمپ سے نکال کر جیل کے ایک ویران حصے میں بھیج دیا گیا (الوداعی ذائقے کے طور پر سیل بھیجنے کی پالیسی ختم ہو چکی تھی)، ہمیں بھی پیچھے رہنے والوں نے نہایت خوشی اور جوش کے ساتھ رخصت کیا۔

ہمارے بعد آنے والے قافلے کے کاغذات تیار ہو چکے تھے، لیکن اٹھارہ ساتھی ایسے بھی تھے جن کو بالکل نظر انداز کیا گیا تھا۔ کیمپ نمبر ۸۸ کے بائیس افسروں کی طرح ہمارے یہ ساتھی بھی ایک سو پچانوے کی تعداد پوری کرنے کے لیے روکے جا رہے تھے۔ ہمارے

دل میں ان جیالوں کے لیے احترام اور ہمدردی کے جذبات تھے، لیکن ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے انہیں تسلّی دی کہ صرف چند ماہ کی بات ہے، انشاء اللہ آپ بھی باعزّت طور پر وطن آ جائیں گے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے: "ہماری فکر نہ کرو، چند ماہ کیا، چند سال بھی لگ جائیں تو پروا نہیں

لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

بس اہلِ وطن کو اتنا کہنا کہ ہماری طرف سے دل رنجیدہ نہ کریں، ہمیں قید یا تختۂ دار کا بھی ڈر نہیں، لیکن اگر اہلِ وطن نے ہمیں سچ مچ "مجرم" سمجھ لیا تو ہمیں بہت قلق ہوگا۔"

ہم ان سے وداع ہو کر جس بیرک میں عارضی طور پر رُکے، وہ میرے لیے نئی تھی لیکن کئی ساتھی دو سال قبل کیمپ میں داخل ہونے سے پہلے اسی بیرک کے ٹھنڈے فرش پر چند راتیں گزار چکے تھے۔ تاہم آج صورتِ حال مختلف تھی۔ آج نہ صرف ان کے پاس پہننے کو کپڑے اور سونے کے لیے کمبل تھے، بلکہ اب انہیں یقین تھا کہ یہ طویل تیرہ و تار رات کا آغاز نہیں بلکہ اس کا انجام ہے، اسی رات کے سایے میں سحر کا نور پوشیدہ ہے، یہ رات ہٹے گی تو ہم ٹرین میں ہوں گے۔ پاکستان جانے والی ٹرین!

۱۵ اکتوبر کو تین بجے صبح ہمیں ٹرکوں میں بٹھا کر گارد سمیت جیل سے باہر نکالا گیا۔ جونہی ہم جیل کے آخری پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہنچے، تو کئی ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں نشانِ راہ تلاش کرنے لگے۔ اچانک دو تین ساتھی چلّا اُٹھے: "وہ دیکھو، سڑک، سچ مچ سڑک، دیکھو تو سہی کتنی کشادہ، کتنی لمبی ہے۔" واقعی دو سال قید میں صرف چار فٹ چوڑی اور بیس پچیس فٹ لمبی، پہرے داروں کی روشیں دیکھنے کے بعد ہر سڑک کشادہ اور طویل لگتی ہے۔ میں نے کہا: "ہاں، ہاں، واقعی سڑک ہے اور غالباً ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے۔"

ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تو ایک ساتھی جو اپنے ناکردہ گناہوں کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو نام نہاد جنگی مجرموں میں شمار کرتے رہے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "تم تو بڑے

محفوظ ڈبّے میں ہو۔ تمہارے آگے ریڈ کراس والے ہیں اور پیچھے ڈاکٹر کا کیبن (CABIN) ہے۔ تمہاری لو گی تو کٹنے کا ڈر نہیں۔" میں نے چند فقرے کہہ کر اُن کے ذہن سے وہم کے جالوں کو صاف کیا اور اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دی، کہنے لگے: "نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، میرے ساتھ پچیّس افسر اور بھی ہیں۔"

گاڑی چلنے سے پہلے ہمارے کیمپ کے موجودہ اور سابقہ کمانڈنٹ آئے اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمارے نمائندے (SPOKESMAN) سے باتیں کرنے لگے۔ آج خلافِ معمول انہوں نے مسکراہٹ کا نقاب (MASK) پہن رکھا تھا۔ لیکن اس کے پیچھے ان کے مکروہ خدوخال اور گھناؤنے عزائم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چنانچہ کسی نے ان کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دیا۔ وہ کھسیانی بلّی کی طرح پلیٹ فارم پہ کھڑے رہے اور گاڑی چل دی۔

سُنا تھا کہ آگرے سے چلنے والی پہلی گاڑی کی کھڑکیاں بند رکھی گئی تھیں، لیکن ہماری روانگی کا موقع آنے سے پہلے یہ پالیسی ترک کر دی گئی تھی۔ اب کھڑکیاں کھُلی تھیں۔ دروازے پر گارد کھڑی تھی لیکن اس کی موجودگی سے ہمارے لطفِ تماشا بیں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ چنانچہ ہم نے خوب اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ کہیں تاج محل کی جھلک ہی نظر آجائے، لیکن بے سُود! ریل کی پٹڑی کے دونوں جانب مفلوک الحال مرد، عورتیں اور بچّے صبح کی ضروریات میں مصروف نظر آئے۔ آگرہ، کلکتہ سے بھی غلیظ تر نکلا۔

شہر سے نکلے تو کشادگی کا احساس ہوا۔ لہلہاتے کھیت، سربلند فصلیں اور سرنگوں کسان۔ حدِنگاہ تک سبزہ ہی سبزہ۔ جہاں سبزہ نہ تھا، وہاں کھیتوں کی بھُربھُری مٹّی مہک رہی تھی۔ اس قطعۂ زمین سے بھارت خاصا خوشحال نظر آیا، لیکن جب اس کی آبادی کا خیال آیا تو سُجھا کہ نجانے ایک ایک کھیت پر کتنے پیٹ پلتے ہوں گے! ایک ایک خوشہ نجانے بٹ کر کتنے تہی دستوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ بمبئی سے کلکتہ اور سری نگر سے کوچین تک کتنے بھُوکے مُنہ اور ترستی آنکھیں ان فصلوں کے کٹنے کی منتظر ہوں گی — لیکن ہمیں بھارت کی

خوشحالی یا قحط سالی سے کیا، ہمیں تو واہگہ پہنچنے کا انتظار تھا!

دن کے بارہ بجے گاڑی دہلی ریلوے سٹیشن پر رُکی۔ وہی دہلی جس پر ہلالی پرچم لہرانے کے نعرے ہم نے بچپن میں لگائے تھے۔ وہی دہلی جو آج اپنی فتح کے نشے میں اپنا حلقۂ اثر کابل سے برما تک پھیلانا چاہتا تھا، جس کے پہلو میں صرف پاکستان کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا!

مَیں کھڑکی میں بیٹھا پلیٹ فارم کی رونق دیکھ رہا تھا کہ ایک لال پٹّی والا بھارتی افسر آیا اور کھڑکی کے پاس آکر کہنے لگا: "میرا نام کرنل بالی ہے۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں"؟

مَیں جواب دینے کی بجائے اس کو دیکھتا رہا۔ لمبا قد، پچکا ہوا پیٹ، سانولا رنگ، کھچڑی مونچھیں، چہرے مُہرے سے افسر کم اور بنیا زیادہ لگتا تھا، لیکن اس کے کندھوں پر فل کرنل کے پھُول اور کالر پر سرخ پٹّی کہہ رہی تھی کہ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مت کرو، کم از کم بیچارے کی افسری پر تو شک نہ کرو!

کرنل بالی نے پھر کہا۔ "آپ راولپنڈی کے رہنے والے ہیں"؟ اگرچہ میرا تعلق راولپنڈی سے نہ تھا، پھر بھی مَیں نے ہُوں ہاں کر دی۔ اِس پر وہ پُرانے رشتے جگانے لگا کہ "مَیں بھی پنڈی میں پلا بڑھا ہوں، چھاچھی محلّے میں ہمارا مکان تھا، آپ کا کونسا محلّہ ہے"؟ مَیں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہہ دیا "گوالمنڈی"۔۔۔ "اچھا، اچھا، وہی گوالمنڈی جہاں ہمارے چچا رہتے تھے، ضرور آپ کے والد صاحب انہیں جانتے ہوں گے۔ وہ بڑے نیک اور سخی دل انسان تھے۔ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور مسلمانوں کی بہت مدد کرتے تھے، کیوں نہ ہو ہمارے باپ، دادا کی یہی رِیت چلی آ رہی تھی۔ ہمارے دِلی رشتے اتنے گہرے تھے کہ تقسیم ہند اِن رشتوں کو نہ مٹا سکی۔ اب بھی کسی سے ہربنس سنگھ کا نام لینا، تو اشتیاق سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے، کیوں نہ ہو صدیوں پُرانے ثقافتی اور تمدّنی رشتے چلے آتے ہیں۔ وہی زبان، وہی خوراک، وہی جسمانی ساخت، وہی عادات و اطوار۔ ۔ ۔"

جی چاہا کہ زور سے اُس کے مُنہ پر طمانچا رسید کروں، کمینہ کہیں کا! دسمبر ۱۹۷۱ء

سے آج تک یہی لیکچر سُنتے سُنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ ابھی کچھ کسر باقی تھی کہ جاتی دفعہ زخم تازہ کرنے ضروری سمجھے! مَیں نے کہا: "مجھے ان تہذیبی رشتوں کے ساتھ ساتھ ہندو ذہن کا بھی پُورا پُورا علم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوؤں کی تنگ دلی اور کینہ پروری کس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ مسلمانوں کو الگ گھر بنانے کی ضرورت پڑی، مجھے پتہ ہے ۔ ۔ ۔"

اِتنے میں گاڑی چل دی اور کرنل بالی اپنی سرکاری ٹوپی سہلاتا پلیٹ فارم ہی پر رہ گیا۔

دوپہر اور رات کے کھانے کا وقت آیا اور گزر گیا۔ اگرچہ بھُوک بہت تھی، تاہم کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میری نظریں تو واہگہ پر تھیں --- لقمہ لیتے ہوئے اگر منزل اوجھل ہو گئی تو محمل سے بچھڑنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا مَیں کھڑکی سے گردن لگائے مغرب کی جانب دیکھتا رہا کہ کس منزل پر بُوئے وطن آ کر استقبال کرتی ہے!

سولہ اکتوبر کی رات طویل سہی، کڑی ہرگز نہ تھی، دھیرے دھیرے بہتی رہی اور ہم اس کی لہروں میں ہچکولے کھاتے رہے۔ گاڑی کے پہیّے کے ہر چکّر کے ساتھ ہجر کی ایک گھڑی کم ہوتی گئی، گاڑی کا ہر دھچکا ہمیں منزل کی طرف دھکیلتا رہا۔

مَیں کمبل بچھا کر لیٹ گیا۔ پلکیں جُڑ گئیں۔ مَیں محوِ خواب ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کیمپ میں سب لوگ کاغذوں پر دستخط کر رہے ہیں، اپنا سامان سمیٹ رہے ہیں، کتابوں کو تولیے کے بیگ میں ڈال رہے ہیں، اب باری باری پھاٹک سے باہر جا چکے ہیں، مَیں جیل میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ پھر بیرک کی دیواریں سمٹ کر قریب آ گئی ہیں، بیرک سَیل میں بدل چکی ہے، دُور دُور گشت کرنے والا سنتری اب سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور بلاوجہ بدزبانی پر اُتر آیا ہے اور سَیل کے باہر سے سنگین کی نوک مجھے چبھو رہا ہے۔ مَیں اس کی ٹیس سے چونک اٹھتا ہوں۔ آنکھ کھُلتی ہے تو گاڑی چھُک چھُک چل رہی ہوتی ہے اور میرے ڈبے میں سفر کرنے والے افسر بلب کی مدّھم روشنی میں تلاوت کر رہے ہیں۔ گھڑی دیکھتا ہُوں تو صبح کے ساڑھے تین

بجے ہیں۔

یہی سحری کا وقت تھا، میرے ساتھی مسافروں نے بتایا کہ "رات کے اندھیرے میں کہیں گاڑی روک کر دو دو چپاتیاں فی قیدی تقسیم کی گئیں۔ ہم نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا کہ شاید گھر پہنچنے کے حسین خواب دیکھ رہے ہو گے۔ لو، یہ رہی تمہارے حصّے کی سحری"۔ مَیں نے ایک چپاتی کھا کر صراحی سے پانی پیا اور روزہ رکھ لیا۔

اب سحر ہونے کو تھی، ایک طویل شبِ ہجر کی سحر، سحر جو ہمیشہ شب سے عظیم تر ہے! اب وہ مجھے دستک دے کر جگا رہی تھی اور ستاروں کو الوداع کہہ رہی تھی

جاؤ اب سو رہو ستارو

درد کی رات ڈھل چلی ہے

پَو پھٹے امرتسر پہنچے۔ اگلا سٹیشن اٹاری تھا جہاں ہمیں اُترنا تھا۔ چنانچہ اُٹھ کر شیو بنائی، مُنہ ہاتھ دھویا۔ "پی۔ ڈبلیو" کی چھاپ کے بغیر پُرانی وردی پہنی، کمبل تہ کر کے ایک طرف کیا، بُوٹوں کے تسمے کسے اور اٹاری کا انتظار کرنے لگے۔

اٹاری اُترے تو بھیڑ بکریوں کی طرح ہماری گنتی ہوئی، فہرستوں کے مطابق ہمارے نام پُکار پُکار کر تین قطاروں میں کھڑا کیا۔ یہی وہ ترتیب تھی جس کے مطابق ہمیں واہگہ بارڈر پار کرنا تھا۔ چاروں طرف بھارتی گارد نے حصار باندھا اور ہمیں اٹاری سے واہگہ تک پیدل چلنے کا حکم ہوا۔ ہم تو پاکستان پہنچنے کے لیے آگرے سے پیدل مارچ کرنے کو تیار تھے، یہ دو میل کا فاصلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن اِس سفر میں جو ذلّت شامل تھی، اُس سے خاصا دُکھ ہُوا۔ ہم بھارتی سنگینوں کے زیرِ سایہ خاک اُڑاتے سرحدی گاؤں سے گزرے تو وہاں بچے، بُوڑھے اور جوان سڑک کے کناروں یا مکان کی چھتوں سے ہمارے سفرِ ذلّت کا نظارہ کرنے لگے۔ ہم ان علاقوں میں کبھی کسی اور رُوپ میں داخل ہونے کے خواب دیکھتے تھے، آج انہی سے ذلّت کی بیڑیاں پہنے گزر رہے تھے۔ یہ دیہاتی کیا سوچتے ہوں گے کہ پاکستانی فوج جس کی دھاک ان کے دل

پر بیٹھی تھی اب اس حالت کو پہنچ چکی ہے! کیا ہمیں صرف اس لیے پیدل چلایا گیا کہ سرحدی علاقے کے باشندوں کے دِل سے پاکستانی فوج کا ڈر مٹ جائے ۔! ہم چاروناچار چشمِ نم اور جانِ شوریدہ لیے چلتے رہے۔

آدھے راستے میں میرے پہلو میں درد کی ٹیس اٹھی۔ یوں محسوس ہوا کہ گردے نے اس رسوائی پر احتجاج کیا ہے۔ درد کو تھپکی دے کر سلانا چاہا تو یہ اور بھڑک اٹھا۔ بھارتی گارد سے آخری وقت مدد مانگنے کو جی نہ چاہا۔ میں زبان دانتوں میں دبائے بازو ہلاتا دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا، لیکن درد بتدریج بے قابو ہوا جاتا تھا۔ میں نے گردن اکڑا کر سامنے دیکھا تو دُور "خوش آمدید" کے موٹے موٹے حروف دکھائی دیے۔ منزل کا نشان دیکھ کر جسم میں ایک انجانی قوت آگئی۔ قدم تیز تیز اُٹھنے لگے، اسیر و رنجور اعضا جوان ہو گئے۔ میں نے درد پر قابو پالیا — اور چلتا رہا، چلتا رہا۔

واہگہ بارڈر پر پہنچے، تو سرحد کی بھارتی جانب ہی ہمیں روک کر ازسرِ نو گنتی ہوئی اور سرحد پار کرنے کی ترتیب چیک کی گئی۔ قیدی پاکستان کے حوالے کرنے کا وقت ۸½ بجے صبح تھا، لہٰذا ہم بنچوں پر بیٹھ گئے اور جوان زمین پر، کئی کھڑے رہے۔

انتظار کی یہ گھڑیاں بھی عجیب تھیں۔ منزل چند قدم پر سامنے تھی، لیکن ہم نہ لپک کر اسے چُوم سکتے تھے نہ وہ سرک کر ہمارے پاس آسکتی تھی۔ اس چند گام فاصلے کے ایک طرف غلامی، قید اور ذلت تھی اور دوسری جانب آزادی اور عزتِ نفس ہماری منتظر تھی۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں، ہم بار بار گھڑی دیکھتے۔ اب پانچ منٹ باقی ہیں، اب چار، اب ساڑھے تین، اب صرف تین۔ لو، جوانوں کا ایک گروہ پار اُتر گیا۔ دوسرا ابھی گیا، تیسرا ابھی، اب ہماری باری ہے۔

بارڈر پہ ریڈ کراس (ہلالِ احمر) کے نمائندے کی موجودگی میں بھارتی اور پاکستانی افسروں نے فہرست چیک کی۔ ہم اپنا اپنا نام پکارنے پر غلامی سے آزادی میں قدم رکھنے لگے۔ تین قطاروں

میں ہم آگے بڑھے۔ اہلِ وطن نے پھول برسائے، خوش آمدید کہا اور فوجی بینڈ نے خوشی کے ترانے بجائے۔ ہر طرف رنگا رنگ جھنڈیاں اور سنہری لڑیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں، لیکن سچ پوچھیے تو اس وقت یہ تفصیلات ذہن میں محفوظ کرتے کا ہوش نہ تھا۔ میری آنکھیں کھُلی تھیں، وہ سب کچھ دیکھ بھی رہی تھیں، لیکن ابھی جزئیات قبول نہ کرتی تھیں۔

لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید خاں سے لیکر جونیئر افسروں تک سب نے خوش آمدید کہا۔ سرکاری استقبال سے فارغ ہوا تو اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں نے گھیر لیا۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ ان کی صحافی برادری کا فوجی رکن بخیر و خوبی واپس آ گیا ہے۔

لاہور چھاؤنی کے استقبالیہ کیمپ میں پہنچا تو لواحقین اور احباب نے پھولوں، خوشیوں اور بوسوں سے استقبال کیا۔ جونہی پھولوں سے لدی ہوئی سفید کار سے اُترا، انہوں نے مجھے ہاروں سے لاد دیا۔ رنگا رنگ پھولوں کے ہار، طلائی تاروں کے ہار، نوٹوں کے ہار، میں ہار اُتارنے لگا تو کیمرے والوں نے کہا کہ ذرا رُک جائیے! میں رُک گیا اور وہ تصویریں اُتارنے لگے۔

کمرے کے اندر ایک اور بیتاب ہجوم منتظر تھا۔ کسی نے ہار پہنائے، کسی نے دعا کی اور اکثر نے گلے لگایا۔ میرے تینوں کمسن بچّوں کے چہروں پر مسرت کی کہکشاں پھیلی ہوئی تھی اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے پانچ سالہ سرمد کو تین سال کی جُدائی کے بعد گود میں لے کر کہا "کیوں بیٹے، پہچانا مجھے؟" ــ "کیوں نہیں؟ ابّو دو سال آپ کے لیے دعائیں کرتا رہا، پہچانتا کیسے نہ!" اس کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ "مجھے اُتار کر مُنّی کو اُٹھا لیں کہ امّی کے ساتھ بیٹھ کر ہر نماز کے بعد یہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آپ کے لیے دُعا مانگتی تھی"۔ بڑی بیٹی صحیفہ متانت کی تصویر بنی کندھے سے لگی کھڑی تھی۔

اس ہجومِ انبساط میں ایک ہمدرد نے دبی زبان میں کہا "افسوس کہ آپ کی والدہ کو خوشی کا یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا" ــ "کیوں، کیا ہوا؟" ــ "آپ کے آنے سے چند روز پہلے وہ مایوس ہو کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئیں"۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن ہ

ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

مجھے یوں لگا کہ ارض و سما چکرا گئے ہیں، سلسلۂ کائنات میں خلل پڑ گیا ہے۔ اس تیز گرد باد میں میں ایک ادنیٰ اور بے بس ذرّے کی طرح تھپیڑے کھا رہا ہوں۔ طوفان ذرا تھما تو یوں محسوس ہوا کہ مجھے جیل سے نکال کر عمر بھر کی قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایک ایسی قیدِ تنہائی جو کلکتہ سیل سے کہیں زیادہ تاریک، طویل اور گھمبیر ہے۔ کیا میں تنہا اس قید کا بوجھ سہار سکوں گا یا ہمت ہار کر دم توڑ دوں گا؟

دل کو لاکھ سمجھایا کہ زندگی اور موت قدرت کے اٹل اصول ہیں، ان سے کسی کو مفر نہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ نے ماں اور بیٹے کا چند سالہ فراق ابدی جُدائی میں بدل دیا ہے تو اسی میں رضائے الٰہی ہو گی، لیکن دلِ ناتواں کسی طور نہ سمجھتا تھا۔

مَیں نے ذاتی المیے کو قومی المیے میں دفنانے کی کوشش کی کہ چند سال قبل جب اسی لاہور سے ڈھاکہ روانہ ہوا تھا تو مَیں نے اپنی ماں کے علاوہ مادرِ وطن بھی چھوڑی تھی۔ آج دونوں ہی فوت ہو گئیں۔ ایک طبعی موت مر گئی، دوسری سانحاتی۔ مَیں بہر صورت دونوں سے محروم ہو گیا۔ جب ہر بڑی چیز چھوٹی چیز کو نگل جاتی ہے تو اتنا بڑا قومی المیہ میرے ادنیٰ سے ذاتی غم کو کیوں نہیں نگل سکتا!

لیکن افسوس کہ یہ استدلال بھی دل کو قائل نہ کر سکا۔ جس ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا، اس کی گود سے دائمی محرومی ایک ایسا زخم تھا جو مندمل ہونے میں نہ آتا تھا۔ میری آنکھیں بار بار اس مشتِ استخواں کو تلاش کرتی تھیں جس کی دعاؤں نے ہمیشہ مجھے ڈھارس دی تھی، جس کے چہرے کی جھُریوں میں پیار دفن تھا، جس کی اشک آلود آنکھوں سے ہر وقت مامتا چھلکتی تھی، جس کی آغوش گہوارۂ سکون اور جس کا وجود باعثِ رحمت تھا۔ آج میں ان سب سے محروم ہو چکا تھا۔ ایک دو دن کے لیے نہیں، ہمیشہ کے لیے۔

مجھے لیفٹیننٹ رضوی شہید کی ماں کا خیال آیا، جو آج اپنے لختِ جگر کی بلائیں لینے کے لیے

بیتاب تھی، جس کی گود اُجڑ گئی تھی اور دل بُجھ چکا تھا۔ مجھے میجر نصیب اللہ شہید کے گھر والے یاد آئے جو داہگہ پر جلنے والے چراغوں سے اپنا گھر منوّر نہ کر سکے۔ مجھے سپاہی الوز کا خیال آیا جس نے آگرہ جیل کے حبس میں دم توڑ دیا تھا۔ پتہ نہیں اس کے لواحقین میں سے کتنوں نے حبسِ زندگی سے تنگ آ کر قبائے حیات چاک کر دی تھی۔

نجانے اس صبحِ مسرت کے طلوع ہونے کے انتظار میں کتنے در و دیوار ہمیشہ کے لیے سیاہ ہو گئے، کتنی تمنّائیں دم توڑ گئیں اور کتنی آرزوئیں خاک ہو گئیں!

عزیز و اقارب مجھے سرکاری کاغذات کی تکمیل وغیرہ کے لیے استقبالیہ کیمپ میں چھوڑ کر دو روز بعد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں نے پہلے روز کا کام مکمّل کر لیا، تو رنج و الم کا بوجھ ہلکا کرنے کو لاہور شہر کے کوچہ و بازار کی طرف چلا گیا۔ گلبرگ، مال روڈ، انار کلی، موچی گیٹ، بھاٹی گیٹ اور گول باغ سے ہوتا ہوا اُس ٹی ہاؤس کی طرف نکل گیا جہاں میرے ادبی دوست بیٹھا کرتے تھے۔ سوچا ناصر کاظمی، مختار صدیقی اور دوسرے اصحاب کا دیدار ہو گا تو سارے غم مٹ جائیں گے، سارے رنج دُھل جائیں گے، لیکن وہاں پتہ چلا کہ میری عدم موجودگی میں ناصر کاظمی فوت ہو گئے اور مختار صدیقی بھی، باقی صدیقی بھی چلے گئے اور حفیظ ہوشیارپوری بھی، عابد علی عابد بھی الوداع ہو گئے اور یوسف ظفر بھی۔ یا خدا ذرا سی غفلت کی اتنی بڑی سزا! ذرا پیٹھ کی اور موت کے ظالم ہاتھ نے سارے چراغ گُل کر دیے! میرے گُلشن کے سارے البیلے پھول چُن لیے! میرے آسمانِ شعر و ادب کے سارے مہر و ماہ بے نُور کر دیے! میں ناصر کاظمی کے یہ دو شعر گنگنانے لگا۔

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمین
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی؟

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اُگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی!

دو مینار

رفتہ رفتہ قصرِ بیداد کی دیواریں گرتی رہیں۔ محبوس جسم آزاد اور مجبور تمنّائیں جوان ہوتی گئیں۔ اُجڑے ہُوئے دالان بسنے لگے اور بجھے ہُوئے گھر جگمگا اٹھے۔ ہر طرف مانگوں میں ستارے چمکنے اور چہروں پر خوشی کے کنول کھلنے لگے۔ چند ماہ میں عام سپاہی سے لے کر جنرل نیازی تک سبھی اپنے لواحقین سے آملے اور یُوں جو شبِ حرماں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو نازل ہوئی تھی، ۳۰ر اپریل ۱۹۷۴ء کو صبحِ درخشاں میں بدل گئی۔ دل نے لاکھ شکر کیا کہ اب وہم کا کوئی منحوس پرندہ رات بھر آنگن میں بیٹھی منتظر ماں، بیوی، بہن یا بیٹی کو پریشاں نہیں کرے گا اور یہ دخترانِ وطن یاس و اُمّید کے ہچکولوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئی ہیں۔

جنگی قیدیوں کے آخری قافلے کی آمد پر حکومت نے ہفتۂ تشکّر منایا اور ہم نے اپنے طور پر ایک چھوٹے سے جشنِ مسرّت کی تقریب کی۔ ڈھاکہ کے جملہ احباب جو ۱۹۷۱ء کے ہنگامۂ محشر میں بکھر گئے تھے، دوبارہ جمع ہوئے —— افتخار، شریف، بشیر، کیانی اور غلام رسول۔ احباب مل بیٹھے تو زندہ دلی لوٹ آئی، مسکراہٹیں بکھرنے لگیں اور قہقہے گُونجنے لگے گویا —— احباب مل گئے، زخم سِل گئے، پھُول کھِل گئے۔

یہ محفل ۱۹۷۱ء کی نسبت کہیں بہتر حالات میں منعقد ہوئی۔ اب کوئی وہم تھا

نہ کوئی خدشہ، کوئی اندیشہ تھا نہ کوئی جرکہ۔ ہر کوئی خوش و خرّم تھا۔ نو بیاہتا غلام رسول اب چاند میں عکسِ محبوب تلاش کرنے کی بجائے لذّتِ وصل سے لبریز تھا۔ گھر گرہستی کے رسیا افتخار اب رفیقۂ حیات کی رفاقت کے ساتھ ساتھ اپنی دل پسند فلموں سے بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ شریف صاحب کو اپنی حکمت و شرافت کی گولیاں آزمانے کے لیے نئے مریض ہاتھ آچکے تھے۔ انّاس کے نبض شناس کیانی کے سامنے اب نوع نوع کی قاشیں تھیں —— سنگتروں اور مالٹوں کی قاشیں، آموں اور خربوزوں کی قاشیں۔ وہ جس کو چاہتے ہونٹوں میں دبا کر لبِ یار کا مزہ لے سکتے تھے —— اور اس محفل کے لطف کو دوبالا کرنے کے لیے بشیر ملک کے چیدہ اشعار اور رسیلے لطائف وافر مقدار میں موجود تھے۔ گویا محفل ایک بار پھر جوبن پر تھی اور گلدستۂ احباب نئی آب و تاب کے ساتھ مہک رہا تھا۔ ہم اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ ایک مہیب طوفان سے گزرنے کے بعد ہم دوبارہ مل بیٹھے ہیں۔

بظاہر اس قہقہہ باز ٹولے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی چہروں کی چاندنی اور وہی دلدار نگاہوں کی شبنم۔ اس ٹھنڈی اور منوّر مجلس میں وہی لذیذ باتیں تھیں اور وہی پُر لطف حکایتیں، لیکن اس کے باوجود کسی چیز کی کمی تھی جو رہ رہ کر کھٹکتی تھی۔ دل میں کوئی پھانس اٹکی ہوئی تھی جو ہر قہقہے کے ساتھ درد کی ٹیس جگا دیتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے قہقہوں کے پھول بے رنگ و بو نقش ہیں جو غم و اندوہ کی سیاہ چادر پر بکھیر دیے گئے ہیں۔

اس کیف و درد کے ملگجے میں کئی موضوع زیرِ بحث آئے۔ طرح طرح کی باتیں ہوئیں، مختلف حالات اور شخصیات زیرِ بحث آئیں، لیکن موضوعِ گفتگو کچھ بھی ہوتا کسی نہ کسی طور ڈھاکہ پس منظر میں ضرور اُبھر آتا —— لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز درختوں کا ڈھاکہ، گہرے پانیوں اور اونچے میناروں کا ڈھاکہ، اغیار کے جور اور احباب کے

التفات کا ڈھاکہ — ایک ہزار دن گزرنے کے باوجود ڈھاکہ کا لمس ہماری محفل کے انگ انگ میں سمایا ہوا تھا۔

> برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک
> اک دَرد سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

یہ ملن پارٹی یادوں کے کھنڈر کھود کر اور اُمیدوں کے نئے محل تعمیر کر کے برخاست ہوگئی — اور مَیں تنہا بھٹکنے کے لیے رہ گیا۔ بھٹکنا کھنڈروں کے ویرانوں میں ہو یا محل کی پیچیدہ غلام گردشوں میں ہمیشہ پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ مَیں اب بھی پریشاں ہوں، اب بھی بھٹک رہا ہوں۔ ہر طرف ایک مہیب سکوت اور ایک جاں لیوا خاموشی سنائی دیتی ہے۔ پتہ نہیں مَیں کب ماضی اور مستقبل کی بھول بھلیوں سے نکل سکوں گا، مجھے کب اور کہاں منزل کا نشاں ملے گا۔

اس تیرہ و تار سفر میں مجھے روشنی کے صرف دو سرچشمے دکھائی دیتے ہیں۔ جو اپنی اپنی جگہ سربلند لیکن ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں یہ ہیں ڈھاکہ کی جامعہ مسجد اور بادشاہی مسجد لاہور کے مینار جن کے درمیان اب ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہے۔ مجھے یہ دونوں مینار روشن اور بے داغ نظر آتے ہیں۔ ان دونوں میناروں کا نہ صرف ماضی مشترک ہے بلکہ ان کا مستقبل بھی ایک ہے۔

○ ○

اِس کتاب کے بارے میں

". . . ایّامِ اسیری میں پیش آنے والے واقعات کو اتنے دلچسپ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد جب تک مکمّل نہ پڑھ لی جائے تشنگی برقرار رہتی ہے۔"

"جنگ" ــــ کراچی، راولپنڈی

". . . کوئی بھی حسّاس قاری اس کلاسیکی ادب پارے سے متاثّر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ڈان" ــــ کراچی

". . . یہ ایک نہایت عمدہ تصنیف ہے جو اپنی اعلیٰ ادبی چاشنی کی وجہ سے خوب پڑھی جائے گی۔"

"پاکستان ٹائمز" ــــ لاہور، راولپنڈی

". . . ہمہ یاراں دوزخ، موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔"

"نوائے وقت" ــــ لاہور، راولپنڈی